قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

جون 2024 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

- کہکشاں
- زبان شناسی
- میرا بچپن
- بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ
- ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10روپے   سالانہ:100روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:26، شمارہ:06، جون2024

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی، شاداب شمیم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آراسے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ:110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

- ہماری بات 4

خطوط

- ربط و التفات قارئین کے خطوط 5

عالمی یوم کتاب

- عالمی یوم کتاب 2024 ادارہ 7

ادبی مباحث

- دکنی ادب کے فکری اور ثقافتی حوالے عبدالحق 11
- اردو شاعری اور ہندوستانی تہذیب شکیل احمد خان 16
- اردو میں مشینی ترجمہ مضمرات وممکنات پرویز احمد 19

- سرزمین جاوَرہ اور ساحر افغانی ایک اجمالی جائزہ نارائن پاٹیدار 23

شخصیات

- مولوی ذکاء اللہ کی ادبی خدمات محمد عاصف 26
- عابد سہیل کی تنقید نگاری محمد فہام الدین 29
- جگدیش سہائے سکسینہ کی نظموں میں قومیت کا عکس ناظر حسین خان 32

گوشہ راشد انور راشد

- راشد انور راشد: اداسی ایک خوبصورت احساس کا نام ہے عتیق اللہ 35
- راشد انور راشد کی یاد میں کوثر مظہری 37
- راشد انور راشد کا شعری ارتکاز خان محمد رضوان 41

نفسیات

- نفسیاتِ جنوں برنارڈ ہارٹ/عبیدہ زمان 43

سماجیات

- ہندوستان میں سماجیات اور تاریخ کے جدید رجحان عائشہ بیگم 45

زبان اور زمینی صورت حال

- اردو زبان و ادب ہندوستانی تہذیب وثقافت کی آئینہ دار ہے نجم بٹ 47

یاد رفتگاں

- ماہرِ دکنیات: پروفیسر محمد علی اثر نظیر احمد گنائی 50

ٹکنالوجی

- بنیادی الیکٹرونک سامان اور ان کے کمپونینٹس این پی بھٹاچاریہ/اقبال مہدی 53

تراجم

- دستِ شفقت یوسف ادریس مترجم: محمد قطب الدین 55

فنون لطیفہ

- قرونِ اولیٰ کی مصوری انیس فاروقی 60

سلسلۂ صحافت

- اردو صحافت میں اداریہ نگاری جعفر علی خان 62

ادبی وثقافتی ادارے

- گلبرگہ کی ادبی وتہذیبی انجمنیں کوثر فاطمہ 64

نیا آسماں نئے ستارے

- وسط ہند کا ایک اہم شاعر ناطق گلاوَٹھوی محمد اسرار 68
- اختر الایمان کی شاعری کے موضوعات نہال 70
- عطیہ فیضی: ایک شعلۂ مستعجل محمد ارشاد 73

کتابوں کی دنیا

- تعارف وتبصرہ ادارہ 77

خبرنامہ

- اردو دنیا کی خبریں ادارہ 87

ہماری بات

آج کل انٹرنیٹ ہماری روز مرہ کی زندگی کا لازمی حصہ بن چکا ہے۔ آج ہر کام میں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ہر سطح کی عمر کے فرد کے لیے اسے سمجھنا اور سیکھنا ضروری ہوگیا ہے۔ انٹرنیٹ سے واقفیت کے بغیر زندگی کا تصور ناقص ہے۔ یہ خاص طور پر ان نوجوانوں اور بچوں کے لیے ہے جو اس جدید ٹیکنالوجی کے دور میں پیدا ہوئے ہیں۔ لہٰذا بڑے پیمانے پر استعمال ہونے والے اس آلے کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں نوجوانوں اور بچوں کو آگاہ کرنا بہت ضروری ہے۔ سائبر جرائم، ڈیجیٹل ٹریلرز اور سوشل میڈیا کے صحیح استعمال سے بچے جب تک آگاہ نہیں ہوں گے ان پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

بچوں اور نوجوانوں کے لیے مالیاتی خواندگی کا علم بھی بے حد ضروری ہے۔ مالیاتی نظام، بجٹ، اخراجات، سرمایہ کاری اور ٹیکس وغیرہ کے بارے میں نوجوانوں کو بتایا جائے تو وہ پیسے کے صحیح استعمال کو بھی اچھی طرح سمجھیں گے۔ اسی طرح ہم عصر دنیا میں صنفی مساوات کے حوالے سے جو پیش رفت دیکھتے ہیں اس کی عکاسی نوجوانوں کے پڑھنے والے ادب میں ضروری ہے اس سے نہ صرف یہ کہ اس کے بارے میں ابتدائی بیداری پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے بلکہ ان دقیانوسی تصورات کا مقابلہ کرنے میں بھی مدد ملتی ہے جو ان کی روز مرہ کی زندگی میں درپیش ہوتے ہیں۔

جسمانی اثباتیت بھی اس دور کا اہم موضوع ہے۔ بچے اور بڑے ہر عمر کے لوگ اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اس کے سلسلے میں بیداری پیدا کرنا صحت مند معاشرے کی تشکیل کے لیے ضروری ہے۔ نوجوانوں اور بچوں میں حفظان صحت اور صحت مند کھانے وغیرہ کے بارے میں بہت تساہلی پائی جاتی ہے اس سلسلے میں انھیں بتانے اور سمجھانے سے انھیں بہت سی مضر چیزوں سے دور کیا جاسکتا ہے۔

بچوں اور نوجوانوں کے رویے سے آج اساتذہ اور والدین بہت پریشان ہیں۔ باہمی مسائل اور رویے کے مختلف مسائل کے بارے میں بیداری پیدا کرنے والا ادب اس سے نمٹنے کے لیے تفہیم اور حل پیدا کرنے کی طرف ایک بہترین قدم ہوسکتا ہے۔

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں ہر چند کوس پر زبانیں بدلتی ہیں اور لوگوں کے عقیدے اور خیالات میں تبدیلی آجاتی ہے ایسے میں تنوع اور ڈائیورسٹی کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے یہاں ایسا ادب تخلیق کرنا بہت اہم ہو جاتا ہے جو نوجوان نسل کو ہندوستان کے تنوع اور شمولیت کے تصور سے متعارف کرائے۔

آج معاشی، تعلیمی اور دیگر ضرورتوں کی وجہ سے لوگوں کو مختلف ممالک اور شہروں کا سفر کرنا پڑتا ہے آج کل سفر اتنا آسان ہوگیا ہے کہ ملک اور بیرون ملک ہجرت زندگی کا حصہ بن چکی ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے نئے تصورات اور نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ نوجوانوں کے لیے ایسے ادب کی شمولیت ضروری ہے تاکہ وہ تارکین وطن، ہجرت، خاندانی نظام اور تعلقات وغیرہ امور سے واقف ہوسکیں۔

یہ دور سائنسی انقلاب کا ہے، سائنس روزانہ نئے نئے ایجادات کے ذریعے پوری دنیا کو حیران کر رہی ہے ایسے میں نئے سائنسی تصورات سے نئی نسل کو آگاہ کرنا چاہیے۔ سائنس کے قدیم تصورات پر ہمارے پاس کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے مگر نئے مسائل اور موضوعات پر ابھی تک خاطر خواہ کام نہیں ہوا ہے۔

اس کے علاوہ بھی بہت سے موضوعات اور مسائل ہیں جن پر تخلیق کی ضرورت ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ جدید تقاضوں کے مطابق بچوں اور نوجوان نسل کے لیے ادب تخلیق کیا جائے۔ کسی بھی زبان کی ترقی اور نوجوان نسل کی تربیت کے لیے ضروری ہے کہ ان کو کتابوں کی طرف راغب کیا جائے اور ان میں زبان و ادب کا شوق پیدا کیا جائے اس بات سے سبھی اتفاق بھی کرتے ہیں مگر اصل مسئلہ ہے ان کو راغب کیسے کیا جائے؟ انھیں کس طرح کا مواد دیا جائے؟ بچوں کا سائنسی اور استدلالی مزاج کیسے بنایا جائے؟ کیا جو مواد ان کے پاس ہے یا انھیں ماضی سے دیا جا رہا ہے کیا وہی کافی ہے یا اس عہد کی ضرورت اور تقاضوں کے مطابق ان کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر ان کے لیے ادب تخلیق کیا جائے اور مواد تیار کیا جائے؟

نئے اذہان کو کتابوں سے قریب لانے کے لیے مضبوط لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔ کونسل نوجوانوں اور بالغان کے لیے جدید تقاضوں کے مطابق ادب کی تخلیق کے تئیں سنجیدہ ہے اور اس پر کام بھی کر رہی ہے مگر تمام تخلیق کاروں کا تعاون ہو تو مزید بہتری لائی جاسکتی ہے۔

ربط والتفات

ماهنامه 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یه نهیں هوتا که محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکه رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا هوتا هے۔ ماضی میں مکتوبات بهت سے مضامین سے بهی زیاده بیش قیمت هوتے تهے که ان میں مشموله مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندهی کی جاتی تهی۔

قارئین سے گزارش هے که ماهنامه 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندهی کریں جنهیں نظرانداز کیا جاتا رها هے۔ آپ کے خطوط همارے لیے بهت اهمیت کے حامل هوتے هیں، ان سے همیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی هے۔ (اداره)

✍ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے شائع ہونے والا بین الاقوامی جریدہ 'اردو دنیا' مئی 2024 کے آن لائن شمارے کے مطالعے کا شرف حاصل ہوا۔ اس شمارے کو دیکھتے ہی 'خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر' والا احساس ہوا۔ رسالے کے سرورق پر نایاب کتابوں کی تصویر دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ اس میں قاری کے مطالعے کے لیے بہت کچھ ہے۔ شمارے کی ورق گردانی سے میرا احساس حقیقت میں تبدیل ہوگیا۔ اس میں ہمیشہ کی طرح اردو زبان اور تعلیم کی اہمیت پر دو بہترین مضامین شامل ہیں۔

اس کے علاوہ ادب وثقافت، تاریخ وتہذیب، صحافت، سماجیات، فلم وغیرہ پر بھی کئی اہم مضامین شامل ہیں۔ اس موقع پر مجھے جاوید صبا کا ایک شعر یاد آ رہا ہے؎

ایک ہی پھول سے سب پھولوں کی خوشبو آئے
اور یہ جادو اسے آئے جسے اردو آئے

مذکورہ بالا شعر اس شمارے کے مشمولات پر پوری طرح فٹ بیٹھتا ہے۔ اس شمارے کے جس باب سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوئی وہ 'نکات میر' ہے۔ میر کے تذکرے 'نکات الشعرا' سے متعلق اس شمارے میں دو مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون 'نکات الشعرا میں مستعمل تنقیدی اصطلاحات' کے عنوان سے ہے، جس کو محمد باقر حسین نے تحریر کیا ہے۔ یہ مضمون روایتی انداز کا ہوتے ہوئے بھی اپنے بطن میں بہت کچھ نئی باتیں سمیٹے ہوئے ہے۔ نکات الشعرا سے متعلق دوسرا مضمون 'نکات الشعرا میں دکنی شعرا' کے عنوان سے شامل ہے، جسے محمد نہال افروز نے قلم بند کیا ہے۔ یوں تو نکات الشعرا کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ہزاروں صفحات سیاہ کیے جا چکے ہیں، جس سے نکات الشعرا کے بارے میں بہت سی باتوں کا انکشاف ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود محمد نہال افروز کے اس مضمون کا نہ صرف یہ کہ عنوان نیا ہے بلکہ اس کے مشمولات میں بھی نیا پن ہے۔ یہ مضمون خالص تحقیقی نوعیت کا ہے، جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ 'نکات الشعرا' میں کتنے دکنی شعرا کا تذکرہ ہے۔ اس کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے اس کے متعلق اپنی طرف سے کوئی حتمی فیصلہ نہیں سنایا ہے بلکہ تمام صورت حال کو سامنے رکھ کر قاری کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے کہ اس کا فیصلہ وہ خود کرے۔ مضمون نگار کی یہ کاوش بھی قابل تحسین ہے کہ انہوں نے دکنی شعرا کے تذکرے کے ساتھ ساتھ ان کے اشعار بھی درج کیے ہیں، جن میں ان کے دکنی ہونے کے شواہد ملتے ہیں۔

مضمون 'ساحر کی نظم تاج محل اور جمالیات' اور 'سنسکرت اور فارسی کے لسانی رشتے' میں بھی نیا پن ہے۔ اس کے علاوہ اس شمارے میں شامل تمام مضامین لائق مطالعہ ہیں۔ شمارے کی ترتیب وتزئین ہمیشہ کی طرح بے حد خوب صورت ہے۔ اس بہترین انتخاب کے لیے میں اراکین اردو دنیا کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔

☜ **نغمہ تبسم**: برن پور، آسنسول، مغربی بنگال

✍ 'اُردو دنیا' اپریل 2024 زیر نظر ہے۔ اداریے میں ہندوستانی سماج کی بوقلمونی سے واقف کرایا گیا ہے اور اسی سے ہوتے ہوئے بات لسانی تنوع تک جا پہنچی۔ اس شمارے کے مشمولات کوئی 9 اصناف ادب پر قائم ہیں جبکہ ان کے ذیل میں 22 ذیلی سرخیاں قائم ہیں اور اس شمارے کی ادبی افادیت میں تقریباً دو درجن سے زائد ادیبوں نے تعاون کیا ہے۔ ربط والتفات میں آپ نے نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندہی کی فرمائش کی ہے۔ نئے موضوعات میں کمپیوٹر سے متعلق مضامین کی

پھر سے شروعات کی جائے تو مناسب ہوگا۔ عنوانات میں مصنوعی ذہانت جیسے موضوعات وعنوانات وغیرہ، شخصیات میں غیر معروف شعرا و ادبا سے متعلق متعدد مضامین زیر نظر رہے مگر مطالعے کے بعد ہی یہ محسوس ہوا کہ یہ کیوں مشہور ومعروف نہ ہوسکے۔ 'زبان وتعلیم' کے تحت دو مضامین دیے گئے ہیں۔ پہلا مضمون بعنوان 'زبان اور اس کے رموز' احقر کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں زبان کے ہمراہ دماغی رمز کو مربوط کیا گیا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ لسانیات اور صوتیات میں تراسیم، خاکے، جدول، اشکال وغیرہ کی مدد سے جو کیفیات واضح کرنے کی سعی کی جاتی ہے تو کیوں نہ اس کا تعلق دماغ کے متعلقہ حصوں (Areas) سے معلوم کیا جائے تو شاید قاری یہ سمجھ پائے کہ دماغ کے کون سے حصے کیا افعال سرانجام دیتے ہیں۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر محمد ارشد کا ہے۔ عنوان ہے 'اُردو زبان کی تدریس میں قواعد کی اہمیت' عنوان ہی سے اس مقالے کی اہمیت اجاگر ہوجاتی ہے۔ اس کی ابتدا اشجار الحروف کی تختی سے ہوتی ہے۔ ان کا یہ کہنا برحق ہے کہ زبان کا ڈھانچہ قواعد کا خاص موضوع ہے۔ اس قابل قدر مضمون میں مجھے حروف تہجی کی تلاش تھی سو مل گئی۔ انھوں نے بتایا کہ اردو میں حروف تہجی کی تعداد سے متعلق اہل زبان میں اختلافات ہیں۔ مگر اس باب میں ایک تشنگی یہ رہ گئی ہے کہ حروف تہجی کی مکمل تختی (چاہے 36 ہو یا 38 یا 56) دی جاتی تو یک گونہ تشفی ہوتی۔ پھر بھی مضمون تمام تر لائق صد ستائش ہے۔ 'لعل وگہر' میں کوئی چھ شعرا و ادبا پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ پہلا مضمون بعنوان 'نعیم الحق سرور اورنگ آبادی بحیثیت غزل گو' ڈاکٹر قاسم فریدی کا لکھا ہوا ہے۔ انھوں نے مثالوں کے ذریعے نعیم الحق کی غزل گوئی کو اجاگر کیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر شکیل احمد نے 'مولانا عبدالشکور آہ مظفر پوری کی غزلیہ شاعری' پر قلم اٹھایا ہے۔ اس میں ایک خاص بات یہ نظر آئی کہ غزل میں مستعمل اصطلاحات پر بات کی گئی ہے۔ مثلاً 'حکایات بایار گفتن'، 'غم جاناں'، 'اُردو غزل کا محبوب' وغیرہ مگر ان سے تو سبھی واقف ہیں۔ بہرحال موصوف کی قابلیت کی دلیل میں ان کے کئی اشعار شامل کیے گئے ہیں۔ شاید یہ آپ کو پسند آئیں۔ جناب ایم اے کنول جعفری نے 'کوثر چاند پوری کی تخلیقی جہات' پر غور وفکر کیا ہے۔ اس میں اولاً کوثر چاندپوری کے ابتدائی حالات حیات درج ہیں اور یہ بھی بتایا کہ ایک طبیب ہوتے ہوئے بھی انھوں نے شعر گوئی، افسانہ وناول نگاری، رپورتاژ، طنز ومزاح، تحقیق و تنقید نگاری اور ادارت کے علاوہ کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ جناب ذاکر حسین ذاکر نے 'فراموش کردہ ادبی شخصیت سلیم جعفر' کی یاد دلائی ہے۔ ڈاکٹر محمد شفیع بھٹ نے 'ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی ادبی جہات' کا تذکرہ کرتے ہوئے یاد دلایا کہ جامعہ عثمانیہ کی اس مایہ ناز خاتون نے ادب کے مختلف میدانوں میں لازوال کارنامے انجام دیے۔ اس مضمون میں آپ ان کے کارنامے تفصیل سے پڑھ سکتے ہیں۔

'ادب زاویے اور جہات' کے تئیں پانچ مقالات درج ہیں۔ ان میں پہلا مقالہ ڈاکٹر احمد امتیاز کا لکھا ہوا ہے اور عنوان ہے 'جگناتھ آزاد کی نظموں میں شعری عمل کی جہتیں' اولاً مصنف نے جگناتھ آزاد کی شخصیت کی مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ مرنجاں مرنج شخصیت کے حامل تھے اور انھوں نے اصناف نثر ونظم کے تمام تر شعبہ جات میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ گوکہ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے پر انھوں نے صحافت درس وتدریس اور انتظامیہ میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ مضمون میں جا بجا ان کے کلام سے رنگینی بھی پیدا ہوگئی ہے۔ اچھا مضمون ہے۔ پر اس میں تنقید عنقا ہے۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر سمّی اقبال صاحبہ کا تصنیف کردہ ہے۔ انھوں نے 'اردو فکشن میں زمیندارانہ معاشرے کی عکاسی' کو منعکس کیا ہے۔ اس میں 'عکاسی' کے بجائے اثرات لکھا جاتا تو زیادہ مناسب تھا کیونکہ اس میں پسماندہ طبقے پر زمینداروں کی بالادستی کا بیان عیاں ہے اور ان میں انیسویں اور بیسویں صدی میں لکھے گئے ناولوں کا تذکرہ ہے جو ایسی زیادتیوں سے معمور ہیں۔ طویل مگر اچھا تبصرہ ہے۔ ڈاکٹر عزیز احمد خان نے اُردو کے مقبول شاعر 'فراق گورکھپوری کے غیر مطبوعہ خطوط' کو طبع کروایا ہے۔ جناب عرفان رشید نے 'اُردو افسانہ اور رومانی اسلوب' پیش کیا ہے۔ ابتداءً انھوں نے رومانیت کی مختصراً تاریخ بیان کی ہے کہ یہ ایک ثقافتی تحریک تھی جس کا آغاز سترہویں صدی کے نصف آخر میں ہوا تھا اور کہ یہ یونانی اور لاطینی فنی تصورات کے خلاف ایک ردعمل تھی۔ پھر اس کے مختلف مشاہیر کے بیانات (اقتباسات) کی مدد سے وضاحت کی گئی ہے۔ اب اس میں کیا ادبی افادیت ہے یہ آپ خود مطالعہ کرکے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اکبر نے 'آزادی کے بعد اُردو نظموں میں ہندوستانی عناصر' کھوج نکالے ہیں۔ مضمون تمام تر نظموں کے اقتباسات سے معمور ہے۔ جو آپ کے شاعرانہ احساس کو تحریک دیں گے۔ 'یادِ رفتگاں' کے ذیل میں چار وفیات درج ہیں۔ اولاً سیّد نفیس دسنوی نے اپنے بڑے بھائی 'سید شکیل دسنوی' کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی کھٹی میٹھی یادوں کا سلسلہ کہاں سے شروع کروں۔ بہرحال انھوں نے ان کی علم دوستی کی طویل روداد سنائی۔ اقبال لائبریری کا قیام شاعری کے حوالے وغیرہ۔ بس دل تھام کر پڑھتے رہیے۔

ڈاکٹر مہتاب جہاں نے 'پروفیسر اسلم خاں — دہلی کی ایک نامور علمی شخصیت' کے حالات بیان کیے ہیں اور پروفیسر صاحب کی علمی لیاقت اور تدریسی صلاحیتوں کے واقعات گنائے ہیں۔ لیکن اس بیانیے میں دہلی یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کا تذکرہ بار بار آتا ہے۔ گزرے ہوئے وقت سے متعلق اچھا تذکرہ ہے۔ اس میں کچھ سیکھنے کو بھی ملے گا۔ ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی نے کشمیر کے مشہور ومعروف شاعر 'فاروق نازکی کی غزلیہ کائنات' قلمبند کیا ہے۔ اس میں ان کے حالاتِ حیات کے ساتھ ساتھ غزلوں اور شعروں کے اقتباسات بھی شامل ہیں جس کی وجہ سے مضمون رنج وغم میں بھی مرغزار کا مزہ دیتا ہے۔ محمد اسلام خاں نے 'سالک بستوی کا تخلیقی سفر' پیش کیا ہے۔ اس میں ان کا منتخب کلام بھی شامل ہے۔ 'خصوصی گفتگو' کے تحت ساجد جلالپوری نے 'ماہر عروض ولغت ڈاکٹر شعور اعظمی سے گفتگو' کے انداز میں کارآمد انٹرویو پیش کیا ہے۔ 'کتابوں کی دنیا' کے تحت تبصرہ وتعارف میں کوئی تیرہ کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔ جو آپ کو اپنے ذوق کے مطابق کتابیں حاصل کرنے میں ممد ومددگار ثابت ہوں گے۔ 'خبرنامہ' میں اُردو دنیا کی خبریں شامل ہیں تاکہ آپ اُردو میں فکروفن کی کروٹوں سے محظوظ ہوتے رہیں۔ لیکن وفیات کے تحت اُردو ادبستان کے آٹھ پُرنور سیاروں کا غروب ہوجانا بڑی اضطرابی خبریں ہیں لیکن انسان لاچار محض دعائے خیر کے اور کر ہی کیا سکتا ہے۔

☜ **مصطفیٰ ندیم خان غوری**: بی 11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

ادارہ

عالمی یومِ کتاب 2024

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیراہتمام عالمی یوم کتاب کے موقعے پر 23 اپریل 2024 کو کتاب کلچر کے حوالے سے کونسل کے صدر دفتر اور دہلی کی چار یونیورسٹیوں میں پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں بڑی تعداد میں اہل علم اور دانشوروں نے شرکت کی۔

اس موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں شری رام بہادر رائے کی کتاب 'آئین ہند: ان کہی کہانی' کی تقریب اجرا اور مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت دہلی کے سابق لیفٹیننٹ گورنر جناب نجیب جنگ نے کی، انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں آئین ہند پر بات کرتے ہوئے کہا کہ آئین کے بیسک اسٹرکچر کو بدلنے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے، آئین مساوات اور جمہوریت کی جو تعلیم دیتا ہے اسے ہر حال میں اپنی اصلی صورت میں باقی رکھا جانا ضروری ہے۔ آئین ہندان کہی کہانی پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ایسا انوکھا کام پہلے کبھی نہیں ہوا اور نہ ہی آگے ہوگا، یہ کتاب سب کو پڑھنی چاہیے اور خاص طور پر نئی نسل کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے تمام مہمانان کا استقبال کیا، انھوں نے کہا کہ عالمی یوم کتاب کے موقعے پر دہلی کی چار یونیورسٹیوں میں 'کتاب اور قرأت' کے عنوان سے پروگرام کا انعقاد کیا گیا تا کہ طالب علم کو کتاب سے قریب کیا جائے اور کتاب کلچر کو فروغ دیا جائے، انھوں نے کہا کہ کوئی بھی ملک آئین سے چلتا ہے، اور حکومتیں آئین کے دائرے میں چلتی ہیں، یہ کتاب بے حد منفرد ہے، اس کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ آئین کیوں بنا اور آئین بنانے کے کیا محرکات تھے، ان تمام باتوں کو اس کتاب میں بڑی خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

شری رام بہادر رائے صدر اندرا گاندھی نیشنل سینٹر فار دی آرٹس نے اپنے خطاب میں کہا کہ سمودھان کو ماننا الگ بات ہے اور اس کو جاننا الگ۔ سمودھان کو جاننے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ سمودھان پر بہت سی کتابیں موجود ہیں ملک کے ہر شہری کو چاہیے کہ وہ جس ملک میں رہ رہا ہے وہاں کے آئین کو سمجھے اور اس میں بتائے گئے قوانین پر عمل پیرا ہو، انھوں نے کہا کہ ہندوستان کا آئین سب سے الگ ہے، دنیا کے بیشتر ممالک کے آئین میں لکھا ہوا ہے کہ اسے بدلا نہیں جا سکتا لیکن ہندوستان کا آئین کھلا ہوا ہے اس

جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں بھی 'کاغذ کتاب اور زندگی کی عجیب کہانیاں' کے عنوان سے خصوصی خطبے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر احمد محفوظ صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے کی جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر اقتدار محمد خان ڈی فیکلٹی برائے علوم والسنہ جامعہ ملیہ اسلامیہ شریک ہوئے۔ صدر شعبہ تاریخ و ثقافت پروفیسر فرحت نسرین نے 'کاغذ، کتاب اور زندگی کی عجیب کہانیاں' کے عنوان پر فکر انگیز خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بنیادی طور پر انسانی تجربات کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک تجربہ وہ ہے جو انسان انفرادی طور پر حاصل کرتا ہے۔ دوسرا تجربہ وہ جسے ہم اجتماعی تجربے کا نام دیتے ہیں۔ اجتماعی یا مشترکہ تجربات متعدد ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں لیکن کتابیں اس کا بڑا اور اہم ذریعہ ہیں۔ کتابیں وہ وسیلہ ہیں، جن سے ہم مختلف النوع انسانی تجربوں سے آگاہ ہوتے ہیں اور یہ آگاہی بنی نوع انسان کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے مختلف تاریخی واقعات کے توسط سے اپنے مدعا کی وضاحت کی اور بتایا کہ کس طرح ہمارا انفرادی تجربہ نہ ہونے کے باوجود ہم کتابوں میں درج واقعات سے بصیرت حاصل کرتے ہیں۔ اور یہ بصیرتیں ہمیں سماج میں رہنا سکھاتی ہیں نیز سماجی ردعمل کا سلیقہ بھی بتاتی ہیں۔ مہمانِ خصوصی ڈین فیکلٹی آف ہیومینٹیز اینڈ لینگویجز پروفیسر اقتدار محمد خان نے اس موقعے پر اپنے خطاب میں کہا کہ ڈیجیٹل کتابیں وقت کی ضرورت اور بسا اوقات ناگزیر ہیں لہٰذا انسان کو مطبوعہ اور برقی کتابوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ہمیں تبدیلیوں سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ طباعت کے فن نے مختلف زمانوں میں مختلف مدارج طے کیے، آج کے وقت میں بڑا تغیر آچکا ہے۔ صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر احمد محفوظ نے صدارتی خطاب میں کہا کہ آج کا دور انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کا ہے۔ علم وفن اور تحقیق وتخریج کے میدان میں بھی اس کی اہمیت اور کارکردگی مسلمہ ہے۔ لیکن برقی کتابیں کبھی مطبوعہ کتابوں کا بدل نہیں ہوسکتیں، مطبوعہ کتابوں کا کوئی نہ کوئی نسخہ ضرور محفوظ رہ جاتا ہے یا کم از کم کسی معدوم ہوچکی کتاب کا ذکر ہی کسی دوسری کتاب میں مل جاتا ہے۔ لیکن ڈیجیٹل پلیٹ فارم پر اصل کتاب اور اس کا ذکر سب کچھ ایک ہی وقت میں فنا ہوسکتا ہے۔ جب تک انسان گوشت پوست کی شکل میں موجود ہے، مطبوعہ کتابوں کی اہمیت وافادیت برقرار رہے گی۔ موقعے کی مناسبت سے کونسل کی تازہ اشاعت 'جدید ہندوستان کے عظیم رہنما اور تحریکیں' مصنف مجیب اشرف، مرتبہ احمد خان کی رسم رونمائی بھی کی گئی۔ تقریب کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر شاہنواز فیاض نے انجام دیے۔ کونسل کی ریسرچ آفیسر ڈاکٹر مسرت نے استقبالیہ کلمات پیش

میں ضرورت پڑنے پر تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ یہ سمودھان کی طاقت بھی ہے اور ہندوستان کی طاقت بھی۔ انھوں نے مزید کہا کہ سمودھان کی سب سے بڑی طاقت یہ ہے کہ اس میں دھرم اور مذہب کی کوئی جگہ نہیں ہے بلکہ یہاں کے شہری کو اور اس کے حقوق کو مرکز میں رکھا گیا ہے۔

ماہر قانون اور انسانی حقوق کے اسکالر پروفیسر خواجہ عبدالمنتقم نے اس موقعے پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارا ایک آئین ہے، دنیا میں بہت سے ایسے ممالک ہیں جن کا اپنا کوئی آئین نہیں ہے۔ انھوں نے کتاب پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب بے حد اہم ہے اور اس کتاب کے بیشتر حوالے معیاری تصانیف سے دیے گئے ہیں۔

مہمان اعزازی پروفیسر شاہد اختر ممبر قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ایک انسان اسی وقت اچھا بن سکتا ہے جب وہ ملک کے آئین کو اچھی طرح مانے، جب قانون بن رہا تھا تو اس وقت کے حالات اور ماحول سے ہم بالکل بھی ناواقف تھے یہ کتاب ان تمام باتوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے، آئین کو جاننے اور اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

آئین ہند: ان کہی کہانی کے مترجم ڈاکٹر جاوید عالم نے ترجمے کے حوالے سے ان کو جو دشواریاں پیش آئیں اس پر انھوں نے کہا کہ آئین ہند سے متعلق جو مباحث ہیں وہ واقعی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تقریب کی نظامت حقانی القاسمی نے کی اور اظہار تشکر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) نے کیا۔

اس تقریب میں جناب محمد احمد اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمن)، محترمہ نیلم رانی، کلیم اللہ، انتخاب احمد، شاہنواز محمد خرم، اور کونسل کا پورا عملہ شریک تھا۔ اردو دنیا کی معزز شخصیات نے بھی اس تقریب میں شرکت کی جن میں دانش اقبال، سہیل انجم، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر تسنیم فاطمہ، پروفیسر شہپر رسول، جناب فیروز بخت، جناب شفیق الحسن، جناب اسد رضا، پروفیسر نزہت پروین، ڈاکٹر سلمیٰ شاہین، ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا، پروفیسر اختر حسین، ڈاکٹر رخشندہ روحی، پروفیسر نوشاد ملک، ڈاکٹر ابوظہیر ربانی، خورشید حیات، محمد شہزاد، ڈاکٹر ماجد دیوبندی، ڈاکٹر محمد علیم، ڈاکٹر پرویز شہریار، جناب محمد نسیم، ڈاکٹر رحمان مصور، ڈاکٹر خان محمد رضوان، جناب عشرت ظہیر، جاوید رحمانی، نہاں رباب، ڈاکٹر حبیب سیفی، محمد افضل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

کیے۔ افضل حسین خان (ریسرچ اسسٹنٹ) کے شکریے پر تقریب کا اختتام عمل میں آیا۔

اس پروگرام میں پروفیسر کوثر مظہری، پروفیسر خالد جاوید، پروفیسر ندیم احمد، پروفیسر عمران احمد عندلیب، پروفیسر سرورالہدیٰ، ڈاکٹر شاہ عالم، ڈاکٹر شاہد تسلیم، ڈاکٹر خالد مبشر، ڈاکٹر سید تنویر حسین، ڈاکٹر مشیر احمد، ڈاکٹر محمد مقیم، ڈاکٹر محمد آدم، ڈاکٹر جاوید حسن، ڈاکٹر ثاقب عمران، ڈاکٹر روبینہ شاہین، ڈاکٹر راہین شمع، ڈاکٹر غزالہ فاطمہ، ڈاکٹر خوشتر زریں ملک اور ڈاکٹر نوشاد منظر کے علاوہ بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالر اور طلبہ و طالبات موجود تھے۔

○

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی میں 'کاپی رائٹ کی باریکیاں اور اس کے متعدد پہلو' کے عنوان سے خصوصی لیکچر کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت پروفیسر شوبھا سیوا سنکرن، ڈین اسکول آف لینگویجز لٹریچر اور کلچرل اسٹڈیز

جے این یو نے کی۔ خطبہ جناب تبریز احمد نے پیش کیا۔

اس موقعے پر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے افتتاحی اور تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ کتابیں ہماری سب سے بہترین دوست ہیں۔ ہمارے طالب علمی کے دور میں ہم لوگ اپنے پروجیکٹ کی تکمیل کے لیے دلی کی مختلف لائبریریوں میں جایا کرتے تھے اور آج کافی عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ان کتابوں کی شکل ذہن میں موجود ہیں۔ موجودہ دور میں تمام چیزیں ڈیجیٹل ہو رہی ہیں طلبا اس سے گھر بیٹھے فائدہ اٹھا رہے ہیں جو کہ ان کا حق ہے لیکن لائبریری آنے جانے اور کتابوں سے شغف رکھنے میں طلبہ کو ہمیشہ آگے آگے ہونا چاہیے اس سے آپ کی صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے۔ اسکول آف لینگویج لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز کی ڈین پروفیسر شوبھا سیوا سنکرن نے صدارتی خطبے میں کہا کہ کاپی رائٹ بہت اہم ہے اور رائٹر کو عوامی مفاد کا خیال رکھنا چاہیے تاہم اس بابت جو قوانین ہیں اس کا مکمل احترام کرنا چاہیے، آج ہم بین الاقوامی یوم کاپی رائٹ اور عالمی یوم کتاب منا رہے ہیں، یہ کافی اہم ہے۔ مقرر جناب تبریز احمد گروپ ڈائریکٹر اے جے پی گورنمنٹ انٹرز اینڈ پبلک پالیسی ڈیل ٹکنالوجی نے کاپی رائٹ کی باریکیاں اور اس کے متعدد پہلو پر اپنے بسیط خطبے میں کہا کہ کاپی رائٹ، ٹریڈ مارک، انٹی لیکچول پراپرٹی ان سب کو سمجھنا ضروری ہے۔ اسکوپ امپیکٹ کسی بھی کمپنی کے لیے لیے بہت اہم ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مائکروسافٹ جیسی کمپنیاں بھی اپنا کافی رائٹ محفوظ رکھتی ہیں اور اس سے انھیں کافی منافع بھی حاصل ہوتا ہے۔ آخر میں مقرر جناب پرویز نے کاپی رائٹ کے سلسلے میں سامعین کے سوالات کا تشفی بخش جواب بھی دیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر شفیع ایوب اور ڈاکٹر توقیر راہی نے اظہار تشکر کا فریضہ انجام دیا۔ اس پروگرام میں سینٹر کے سینئر استاذ ڈاکٹر توحید خان، ڈاکٹر پرویز اعظمی، ڈاکٹر رشی کمار شرما، ڈاکٹر شیو پرکاش، پروفیسر سدھیر پرتاب سنگھ، ڈاکٹر ملکھان سنگھ، شعبہ فارسی سے پروفیسر اخلاق احمد آہن، شعبہ عربی سے پروفیسر قطب الدین، ڈاکٹر محمد اجمل، دہلی یونیورسٹی کے ستیہ وتی کالج سے ڈاکٹر رکن الدین، ڈاکٹر لیاقت، ڈاکٹر امتیاز رومی، ڈاکٹر شاہد حبیب فلاحی ریسرچ اسکالرس میں ونود کمار، ظہور، مہران، کلیم احمد، محترمہ انورادا، شہلا کے علاوہ بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالرس، طلبا و طالبات موجود تھے۔ اس سیشن کے بعد کثیر لسانی شعری نشست کے عنوان سے مشاعرے کا بھی انعقاد ہوا جس کی صدارت مشہور شاعر اور ایڈوکیٹ ناصر عزیز نے کی جب کہ مہمان اعزازی کے طور پر پروفیسر اخلاق احمد آہن شامل ہوئے۔ اس نشست میں اردو، ہندی، فارسی اور پشتو زبان کے شعرا نے سامعین کو محظوظ کیا۔ شعری نشست کی نظامت بھی ڈاکٹر شفیع ایوب نے کی۔ نشست کا اختتام خصوصی خطبہ اور شعری نشست کے کنوینر ڈاکٹر نصیب علی کے اظہار تشکر پر ہوا۔

○

شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی میں 'علمی معاشرے میں کتاب اور قرات کی اہمیت و افادیت' کے حوالے سے پروگرام کا انعقاد کیا گیا، اس کی صدارت شعبہ اردو کے استاذ ڈاکٹر ارشاد نیازی نے کی اور خطبہ پروفیسر ابوبکر عباد نے دیا۔ خطبے میں پروفیسر ابوبکر عباد نے کہا کہ کونسل کی جانب سے یہ ایک اچھی پیش رفت ہے، کتابوں سے ختم ہوتے رشتے کو بحال کرنے کے لیے کونسل نے یہ قدم اٹھایا ہے، کونسل کے نئے ڈائرکٹر شمس اقبال ایک متحرک و فعال شخص ہیں، کتابیں ان بہت سی کھڑکیوں کو کھولتی ہیں، جو عموماً بند رہتی ہیں، کتابیں ذہن سازی کرتی ہیں، کتاب بہترین دوست ہوتی ہے، یہ مقولہ بدل لیجیے، کتاب ایک بہترین محبوبہ ہوتی ہے، دنیا کا کوئی ایسا موضوع نہیں، جس پر کتاب نہ لکھی گئی ہو، ان کتابوں کو پڑھ کر دیکھیں، محسوس کریں گے کہ ذہن روشن ہو گیا، کتابوں کے مطالعے سے اپنی اور دوسروں کی جہالتوں کا بھی احساس ہوتا ہے۔ کسی مخصوص کورس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا، کورس سے الگ بھی مطالعہ انتہائی ناگزیر ہے، کورس دراصل ایک اسکل ہے، مطالعہ اصل ہے۔ مطالعے سے اپنے محسوسات و جذبات کے اظہار کا سلیقہ بھی ملتا ہے۔ چار کتابوں کو پڑھ کر دنیا و مافیہا کے اسرار سے واقفیت ناممکن ہے، مسلسل مطالعہ ہی مسائل کے حل کا واحد راستہ ہے، ہر دن کے مطالعے سے انسان ہر دن خود کو فروغ دیتا ہے، مطالعے سے نئی روشنی ملتی ہے، مطالعہ منجمد خیالات میں کنکری مارنے کا عمل ہے، مطالعہ تنقیدی شعور میں بیداری کا عمل ہے، جو طلبا زیادہ

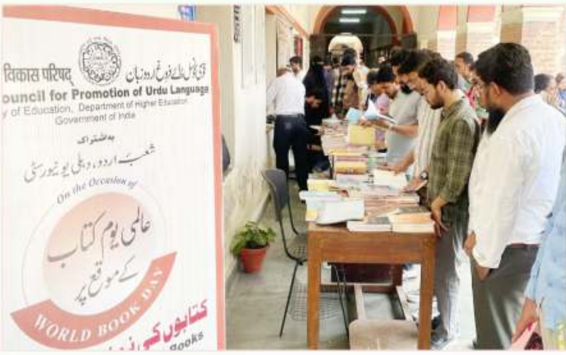

مطالعہ کرتے ہیں، ان کی فہم زیادہ بہتر ہوتی ہے، دنیا کے کسی بھی بڑے انسان کی عظمت کا راز ان کا بے تحاشا مطالعہ ہے، بعض لوگوں نے کہیں سے باضابطہ فراغت حاصل نہیں کی، لیکن ان کے کثرت مطالعہ نے انھیں بلند مقام عطا کیا، کورس کرکے گریجویٹ، ماسٹر اور ڈاکٹر بنیں گے لیکن مسلسل مطالعے سے دانشور بنیں گے، مطالعہ آپ کو تحمل سکھاتا ہے، مطالعہ تعصب سے بچاتا ہے۔

ڈاکٹر ارشاد نیازی نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ دنیا کے تمام مذاہب میں علم کی طویل روایت رہی ہے۔علم کے حصول کے ذرائع کتابیں ہیں، آپ لوگ زیادہ سے زیادہ مطالعہ کریں اور کتابوں کو دوست بنائیں، قومی کونسل اور شعبہ اردو کے مشترکہ پروگرام سے مجھے یقین ہے کہ طلبا وطالبات اور ریسرچ اسکالرز کو فائدہ ہوگا۔ قبل ازاں پروگرام کا تعارف کراتے ہوئے کونسل کے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر اجمل سعید نے کہا کہ اس پروگرام کے انعقاد کا مقصد یا اس کی اہمیت یہ ہے کہ کتابوں کے مطالعے کا کلچر عام ہو، طلبا و طالبات اور ریسرچ اسکالرز زیادہ سے زیادہ مطالعے کے عادی بنیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا ایک مقصد کتاب خوانی کے کلچر کو عام کرنا بھی ہے۔کونسل کے ڈائرکٹر شمس اقبال اور شعبے کی صدر پروفیسر نجمہ رحمانی کی خصوصی دلچسپی کی وجہ سے یہ پروگرام کامیابی کے ساتھ منعقد ہو رہا ہے۔

پروگرام کی نظامت ڈاکٹر علی احمد ادریسی نے کی۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کے اس اقدام کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ کونسل کا یہ اقدام علمی، مطالعاتی اور فکری ترجیحات میں اضافے کے ساتھ کتابوں کو خرید کر پڑھنے کے رجحان کو بھی فروغ ملے گا۔

ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر امتیاز احمد کے شکریے پر پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔

○

جامعہ ہمدرد دہلی میں 'کتابیں اور شخصیت سازی: اہمیت وافادیت' کے عنوان پر تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس عنوان پر خطبہ وزارت آیوش حکومت ہند میں ریسرچ آفیسر سائنٹسٹ لیول IV سی سی آر یو ایم، ڈاکٹر امان اللہ نے پیش کیا۔ انھوں نے اپنے وقیع خطبے میں کتاب کی اہمیت وافادیت اور تعلیم پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے طلبا وطالبات کو زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے کی ترغیب دی۔

اس موقع پر انھوں نے تفصیل سے طلبا وطالبات کو سمجھایا کہ کتابیں شخصیت سازی میں کس طرح کا کردار ادا کرتی ہیں اور کتابوں کا رشتہ مستقبل سازی میں کس قدر گہرا ہوتا ہے۔

پروفیسر عاصم علی خان ڈین ایس یو ایم ای آر جامعہ ہمدرد نے موضوع کا تعارف کرایا۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے شاہنواز محمد خرم ریسرچ آفیسر قومی اردو کونسل نے عالمی یوم کتاب اور قومی اردو کونسل کے کتاب مشن کا مفصل تعارف پیش کیا۔

پروگرام کے کنوینر پروفیسر خورشید احمد انصاری، صدر لٹریری کلب، جامعہ ہمدرد نے بتایا کہ ٹیکنالوجی کے آنے کے بعد کتابوں کے پڑھنے کا طریقہ بدلا ہے لیکن ابھی بھی کتابوں کے شوقین ہیں۔ انھوں نے سامعین کو دیکھتے ہوئے گلزار صاحب کی ایک بہترین نظم بھی سنائی۔

پروگرام کی نظامت ڈاکٹر وارث متین مظہری، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامیات جامعہ ہمدرد نے کی۔

آخر میں قومی اردو کونسل کے ریسرچ اسسٹنٹ محمد شہاب الدین نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

قابل ذکر ہے کہ مذکورہ چار یونیورسٹیوں اور کونسل کے صدر دفتر میں اس موقعے پر سہ روزہ نمائش کتب اور فروخت کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں کثیر تعداد میں ریسرچ اسکالر اور اساتذہ نے حصہ لیا۔ اس موقعے پر پونے دو لاکھ کے قریب قیمت کی کتابیں بھی فروخت ہوئیں۔ قومی کونسل کے اس مشن اور تقریب کو لوگوں نے خوب پسند کیا۔ ہر طرف اس کی پذیرائی ہو رہی ہے۔

■

عبدالحق

دکنی ادب کے فکری اور ثقافتی حوالے

وقت ایک تسلسل کا نام ہے۔ جو ازل سے ابد تک ایک لمحے کا وقفہ کیے بغیر آگے کی طرف گامزن ہے۔ اسے قیام ہے اور نہ آرام۔ قدرت نے تکوینی نظام کے تحت رات اور دن کو اندھیرے اور اجالے میں تقسیم کیا ہے، جو بشری ضرورتوں کی کفالت کے لیے ہے۔ ہر لمحہ ماضی میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ گزرے ہوئے زمانے کو قدیم شمار کرتے ہیں، جو اسی زمانِ تسلسل کا حصہ ہوتا ہے۔ گویا جدید وقدیم کا شمار انسانی تصورات کا پیدا کردہ ہے۔ مکاں کا بھی یہی معاملہ ہے۔ شمال وجنوب بھی تکوینی اشارات ہیں۔ انسان کو ان حدود سے بے نیاز اور بالاتر آفاق سے بھی پرے اور بے کراں پہنائی کے حامل تصورات کا پیکر بنایا گیا ہے۔ اسے ان تعینات میں محدود ہونے سے منع کیا گیا ہے۔ بندوں کو شب وروز یا شمال وجنوب کے پھندوں میں گرفتار نہ ہونے کی تاکید وتنبیہ کی گئی ہے۔ دستورِ دین کا بھی یہی منشا اور ماحصل ہے۔ مگر اولاد آدم کی بدنصیبی دیکھیے کہ وہ آفاقی وسعتوں سے قطعِ نظر ملکوں اور شہروں کے ساتھ مختلف اطراف کے محدود تصورات میں گم ہوگیا ہے۔ ذہنِ انسانی کی بد مذاقی قابل افسوس ہے کہ ہم شہروں اور علاقوں کی عصبیت کے شکار ہوگئے۔ ہمیں آفاقی اور چرخِ نیلی فام سے بھی پرے کی بے کراں وسعتوں سے آشنا کیا گیا تھا۔ مردِ آفاقی جوارض وسماں کی پہنائیوں کو بھی خاطر میں نہ لاتا ہو وہ شمال وجنوب میں دربدری کا شکار ہوجائے یہ کسی بوالعجبی سے کم نہیں۔

دکن کے دیدہ ورسخن ور ولی کی وسعتِ نظر ملاحظہ ہو: ولی کی وسعتِ فکر سے دبستانِ دکن کے فکری رویے اور رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ دکن کے شعرا کا یہ رویہ ان کے فکری امتیاز کی علامت ہے۔ ولی کو بطور مثال ملاحظہ فرمائیں۔

هرگز ولی کے پاس تم باتاں وطن کی مت کہو
جونیہہ کے کوچے میں ہے اس کوں وطن سے کیا غرض

اسی وسعتِ نظر کی وجہ سے ولی جنوبی ہند سے شمال کی طرف طویل سفر کی تکلیفوں کو گوارا کرتے ہیں۔ دہلی کے شعرا نے لکھنؤ کا سفر کیا۔ وہ بھی تلاشِ معاش یا ذاتی آرام و آسائش کی خاطر۔ جب کہ ولی نے ان سب سے بے نیاز ہوکر دہلی میں قدم رنجہ فرمایا۔ میر نے لکھنؤ میں پناہ لی مگر دہلی کی یادیں دل سے زائل نہ ہوئیں۔ دہلی اندوہِ دل کا سبب بنا رہا وہ لکھنؤ کو کوستے بھی رہے۔ انھیں کا قول ہے۔

خرابہ دہلی کا دہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں
متاعِ ہنر پھیر کر لے چلو
بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

شاید ہی کسی ادب کو یہ تخلیقی امتیاز حاصل ہو کہ اس کا پہلا فن کار اتنی ضخامت رکھتا ہو۔ اور پھر شعری اعتبار سے دیکھیے کہ روایتی غزل کے علاوہ دوسرے اصناف پر بھی عبور رکھتا ہو۔ کرۂ زمین کے ہر خطے کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ جو ادب ودانش کے ساتھ ذکر وفکر کے سرچشموں پر مخصوص اثرات مرتب کرتے ہیں۔ یہ ایک لاشعوری عمل ہے جو نوعِ بشر کے باطن کو غیر محسوس طور پر تغیرات سے دوچار کرتا رہتا ہے۔

راقم کے نزدیک دکنی ادب کا ایک نمایاں امتیاز قلی قطب شاہ کا وجود ونمود ہے جو ایک بے مثال گراں مایہ سرمایۂ سخن کا خالق ومالک ہے ان کی بے کراں تخلیقی فعالیت اور شعری ثقافت کی جامعیت حیرت فروز ہے۔ اردو ہی نہیں عالمی ادب کی بیش تر ترقی یافتہ تخلیقات میں یہ مثال موجود نہیں ہے کہ اسی سے سخنوری کا آغاز ہوا اور ایک عظیم فن کار بن کر عرصۂ ادب پر نورفشاں ہو وہ لاکھوں اشعار کی تخلیق کا باعث بنے۔ اور صدیوں تک فن کی تخلیق وتزئین کی فیض رسانی کا سرچشمہ قرار پائے ساتھ ہی نظمِ سلطنت اور امورِ سیاست کے معاملات کی پاسبانی بھی کرتا رہے۔ تخلیق کے کاتبِ تقدیر نے یہ سعادت دکنی ادب کے مردِ دانش کی پیشانی جمالی پر رقم کی تھی۔

آپ اندازہ لگائیں کہ دکنی تخلیق کے سرمایے میں کیسے کیسے نابغۂ روزگار ہیں جو ہماری حیرت فزائی میں اضافہ کرتے ہیں۔ قلی قطب شاہ (1525-1612) پہلے صاحبِ طرز تخلیق کار تصور کیے جاتے ہیں۔ قلی قطب شاہ عالمی ادب میں ایک بے مثل فن کار ہیں۔ وہ ایک مملکت کے مالک اور پوری ریاست کے حکمراں ہیں۔ امورِ سلطنت کی مصروفیت دیکھیے اور سرمایۂ سخنوری کا وزن ووقعت ملاحظہ ہو جس کے دامن سخن میں تقریباً تین لاکھ اشعار موجود ہوں۔ دنیائے تخلیق کا یہ معجزہ ہے کہ پہلا شاعر

شعری ثروت سے اس حد تک گراں بار ہے TGraham Baily نے اپنی کتاب میں اس عجوبے کا اظہار کیا ہے:

"It is astonishing that the first poet should have been so well equipped"

شاید ہی کسی ادب کو یہ تخلیقی امتیاز حاصل ہو کہ اس کا پہلا فن کار اتنی ضخامت رکھتا ہو۔ اور پھر شعری اعتبار سے دیکھیے کہ روایتی غزل کے علاوہ دوسری اصناف پر بھی عبور رکھتا ہو اور انسانی محسوسات کے لطیف ترین عنوانات ان کے کلام میں کثرت سے موجود ہیں۔ جس نظم نگاری کا ذکر انگریزوں کی آمد سے کیا جاتا ہے اس کی ابتدا ہی نہیں بھرپور صورتوں میں معانی کے یہاں کثرت سے موجود ہیں۔ ہندوستان کے خاک وخمیر اور دین وثقافت کی تصویروں کے مرقعے قلی قطب شاہ نے جس کثرت سے قلمبند کیے گئے ہیں وہ ادب میں ایک مدت تک موقوف رہے ہیں۔ ان کی غزل آج بھی شہرۂ عام کی صورت رکھتی ہے۔

پیا باج پیالا پیا جائے ناں
پیا باج یک تل جیا جائے ناں
کتے ہیں پیا بن صبوری کروں
کیا جائے اما کیا جائے ناں

قلی قطب شاہ نے مظاہرِ فطرت کے آغوش میں پلنے والے انسانی جذبات کی ترجمانی کو معراجِ کمال کی بلندی بخشی ہے وہ مقامی مزاج ومظاہر کو شعری اسالیب کے پیراہن میں پیش کرنے والے پہلے فن کار ہیں۔ دکنی ادب کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں عجم کے ساتھ عربی ثقافت کی بھی نمایاں طور پر ترجمانی ہوتی رہی ہے۔ قلی قطب شاہ کے کلام میں وافر مثالیں موجود ہیں ایک مثال ملاحظہ ہو۔

کروں ابتدا حمد کرتار کا کہ منعم ہے کرتار سنسار کا
وہی رب نرنجن ہے لاریب فیہ

ثقافتی اسالیب کا اظہار قلی قطب شاہ کا وصفِ خاص ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔

یوسفِ گم گشتہ آئے گا بہ کنعاں غم نہ کھا
گھر ترا امید کا ہوگا گلستاں غم نہ کھا

خواجہ حافظ کا شعر ہے۔

یوسفِ گم گشتہ آید بہ کنعاں غم مخور
کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

خواجہ شیراز کی کئی غزلوں کے تراجم ان کا منفرد شعری اسلوب ہے۔ تہذیبی کثرتوں کے علائم وآثار سے قلی قطب شاہ کی شہرت ومقبولیت اور مطالعہ وتحسین میں متواتر اضافہ ہوتا رہے گا۔ ہماری کم نگہی ہے کہ ہم نے بارہ پیاریوں تک اپنی تنقید کو محدود کر کے ایک عظیم فن کار کی ذہنی وفکری وسعتوں کو نظر انداز کیا ہے۔

نیناں انجھوں سو دھوں پگ اپ پلک سو جھاڑوں
جے کوئی خبر سوں لیاوے مکھ پھول کا تمہارا
تج خیال کی ہوس تھی ہے جیو ہمن سو زندہ
او خیال کد نہ جاوے ہم سر تھے تک بہارا

قلی قطب شاہ کے پیشِ نظر ثقافت کے مختلف رویے بڑی اہمیت کے حامل ہیں، جن سے ہندوستانی تہذیب عبارت ہے۔ عرب کے سوز اور عجم کے ساز کے ساتھ ہندی نغمے کا آہنگ قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھیں سے اردو ثقافت کا خمیر تیار ہوا ہے۔ قلی قطب شاہ نے اپنے فکر وفن کی ترکیب وتطہیر میں ان عناصر کو شریکِ فن بنایا ہے وہ اپنا تقابل انھیں تہذیبی تلازموں سے کرتے ہیں۔

معانی شعر تیرا ہے یا کہ شعرِ خاقانی

ولی کا مصرع یاد آتا ہے۔

سنیں تو وجد کریں انوری وخاقانی

معانی پروردۂ دکن تھے۔ مگر عرب وعجم کے ثقافتی سرمایے سے بھرپور آگہی رکھتے تھے۔ نوعِ بشر کے جذبہ واحساس کی دنیا بھی ان کے دامنِ نگاہ سے دور نہ تھی۔ لطیف محسوسات سے دنیائے تخلیق منور کی۔

اے خوش خبر صباتوں لے جا جواں قداں کن
چمناں کی آرزو میں بیٹھے ہیں مے پرستاں
گالاں ہیں گالاں پیالے ملھاری
نویلی نئی کونپلیاں تھے جو انی

یہ امتیاز بھی قابلِ ذکر ہے کہ تخلیق کے معیار اور محاسن پر حکیمانہ گفتگو کے نکات دکن کے سخن وروں نے پیش کیے ہیں۔ بلکہ ان کی ترجیحات میں یہ موضوع ناگزیر اہمیت کا حامل رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے شعریات کے ضابطوں کی حنابندی کی ہے دنیائے فن کا دستورِ دین رقم کرنے میں دکن کے شعرا کی بصیرت افروز نگاہوں کو آفریں کہتا ہوں۔ جنھوں نے ادب وتخلیق کے آغاز میں ہی انتقادی اصول واسالیب متعین کیے اور شعری تنقید کے ضابطوں کی بنیاد رکھی۔ وہ ضابطے بھی ایسے مستحکم اور منظم ہیں کہ کئی صدیاں گزرنے کے باوجود ان کی معنویت اور اہمیت آج بھی مسلم ہے اور نقد شعر کے لیے مستعمل ومتداول ہیں۔ ان سے انحراف یا چشم پوشی نہیں کی جاسکتی، کیونکہ وہ اصول بلند تخلیقی اقدار کے حامل ہیں جن پر اسلاف نے غور وفکر کے بعد انتقادی آئین کی اساس قائم کی تھی۔ انتقادی آئین کے اصول دکن کے فن کاروں کے لیے انتقادی حکم نامے کی حیثیت سے محترم تھے وہ خلوص کے ساتھ ان ضابطوں پر کاربند رہے اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی انھیں لازم قرار دیا۔ ان کے قلم سے رقم کیے ہوئے ان انتقادی اصولوں میں آج ابدیت کی تصویر محفوظ ہے۔ یہ دکنی ادبیات کا ایک امتیاز ہے کہ شعری انتقادیات کے اصول واسالیب منضبط کیے گئے۔ اور ان کی مربوط اور بلند تخلیقی ہنرمندی سے معمور مثالیں بھی پیش کی گئیں۔ شمال میں دور دور تک ایسی نظیر نہیں ملتی۔ مختلف فن کاروں نے منتشر اور غیر مربوط طور پر کہیں کہیں فن میں اظہار کیا۔ اس انتقادی بحث کی بہترین مثال ملاوجہی کی تخلیقات ہیں۔

قلی قطب شاہ عالمی ادب میں ایک بے مثل فن کار ہیں۔ وہ ایک مملکت کے مالک اور پوری ریاست کے حکمراں ہیں۔ امورِ سلطنت کی مصروفیت دیکھیے اور سرمایۂ سخنوری کا وزن ووقعت ملاحظہ ہو جس کے دامنِ سخن میں تقریباً تین لاکھ اشعار موجود ہوں۔ دنیائے تخلیق کا یہ معجزہ ہے کہ پہلا شاعر شعری ثروت سے اس حد تک گراں بار ہے

دکنی سرمایۂ ادب کا ایک دوسرا دُرِ شاہ وار ملاوجہی (وفات 1659) ہے۔ راقم کے نزدیک ملاوجہی ایک حیرت فروز شخصیت کے مالک ہیں۔ اردو ادب میں ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔ وہ ایک گراں قدر شعری تخلیق مثنوی اور

بے مثل تمثیل کے موجد و مالک ہیں۔ نیرنگ خیال کے مصنف کے نوشتۂ تقدیر میں دو ہزار سے زائد بیانیہ اشعار پر مشتمل کوئی کتاب نہیں ہے۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ وجہی کے روبرو اردو میں کوئی ایسی نظیر نہ تھی۔ تمثیلی ادب کے وہ معمارِ اول ہیں۔ وہ بجا طور پر ملک الشعرائی کے مستحق تھے۔ اردو کو یہ پہلا اعزاز بھی ان کے توسط سے حاصل ہوا۔ فنی یا شعری اصولِ نقد پر قطب مشتری کے منظوم بیانات کو اولین نقوش میں شمار کر سکتے ہیں۔ اشاروں میں دراصل پوری شرح وبسط موجود ہے یہ اصول قدما کے زمانے سے مروج ومعروف تھے۔ وجہی نے ان ضابطوں کو نئی زبان کے تخلیقی مزاج کو متعین کرنے کے لیے لازمی سمجھا اور مثنوی میں منظوم کیا۔ اس پر قدرے تفصیل سے گفتگو درکار ہے۔ دراصل قطب مشتری کسی جہاں نما سے کم نہیں۔ وجہی نے جو طرز فغاں ایجاد کی وہ مثنوی نگاری کا طرز بیان بن کر مقبول ہوا۔ وجہی نے انتقادی بصیرت کو بروئے کار لاکر تنقیدی ضابطے متعین کیے ہیں۔ جنھیں ہم کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ان اصولوں کو شعری سخن وری کا دستور دین کہہ سکتے ہیں۔

مثنوی کی ابتدا میں حمد ونعت ومنقبت کے بعد 'در شرح شعر گوید' کا باب ایک انوکھی نظیر ہے۔ وجہی نے انتقادی آگہی کے ساتھ شعری تخلیق کے اصولِ فن مرتب کیے ہیں۔ تقریباً 72 اشعار پر مشتمل یہ شعری انتقاد نامہ اور نقدِ شعر کا ضابطۂ تخلیق ہے۔ ان اصولوں کی شرح وتفسیر کے لیے پوری کتاب رقم کی جاسکتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ تنقید کے ان حکیمانہ نکات کی معنویت ابتدائی دور کے فن کاروں کی انتقادی فرزانگی کی فکر انگیز مثال پیش کرتی ہے۔ ربطِ کلام کو دستورِ شعر کا اساسی رکن قرار دیا گیا ہے۔ بے ربط گفتگو کو ممنوع اور ناسزاوار دید کہہ کر اس سے پرہیز کرنے کی دعوتِ فکر دی گئی ہے۔ دوسرا اہم رکن کلامِ سلیس ہے سلاست سے معمور ایک شعر 'غیر سلیس' پچیسوں اشعار سے بہتر اور معتبر ہے۔ وجہی کی جرأت گفتار دیکھیے کہ وہ اعلان کرتے ہیں کہ جسے مربوط شعر کہنے کا ملکہ نہیں اسے شاعری سے سروکار رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بسیار گوئی بڑا عیب ہے۔ خوب سے خوب ایک شعر ہزاروں شعر پر سبقت رکھتا ہے ایک اور اہم اصول بیان کیا گیا ہے کہ لفظ ومعنی میں ہم آہنگی یا ارتباط لازم ہے ورنہ شعر اثر آفرینی اور رعنائی خیال کے اظہار سے محروم ہوگا۔ ملا وجہی کے فکر افروز شعری بیان ملاحظہ ہوں۔

جو بے ربط بولے بتیاں پچیس
بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس

جسے بات کے ربط کا فام نئیں
اسے شعر کہنے سوں کچ کام نئیں
نکوکر توں لئی بولنے کا ہوس
اگر خوب بولے تو یک بیت بس

علامہ اقبال نے ارتباطِ لفظ ومعنی پر حکیمانہ گفتگو کی ہے۔ اسے جان وتن کے ارتباط سے تعبیر کیا ہے۔ جدید اردو تنقید کی پہلی کتاب مقدمہ شعر وشاعری کے مباحث پیش نگاہ ہیں۔ ارتباطِ کلام، سلاست اور لفظ ومعنی کے رشتوں پر حالی نے بہت زور دیا ہے۔ یہ سارے نکات اسلاف اور قدما کے اصولوں سے ہی ماخوذ ومستعار ہیں۔ مگر ان کی تجدید اور تفکیر پر دکن میں بڑی توجہ دی گئی ہے وجہی کی بصیرت کو آفریں ہو کہ انہوں نے تین سو سال قبل ان اصولوں کی حنابندی کی۔ انہوں نے لفظ ومعنی کے ارتباط کے ساتھ لفظوں کے انتخاب کا شعور بھی لازم قرار دیا ہے۔ یہ بھی ہے کہ اساتذہ کے مستعمل ذخیرۂ الفاظ سے استفادہ ضروری ہے۔

دکنی سرمایۂ ادب کا ایک دوسرا دُرِ شاہ وار ملاوجھی ہے۔ راقم کے نزدیک ملاوجھی ایک حیرت فروز شخصیت کے مالک ہیں۔ اردو ادب میں ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔ وہ ایک گراں قدر شعری تخلیق مثنوی اور بے مثل تمثیل کے موجد ومالک ہیں۔ نیرنگ خیال کے مصنف کے نوشتۂ تقدیر میں دو ہزار سے زائد بیانیہ اشعار پر مشتمل کوئی کتاب نہیں ہے۔

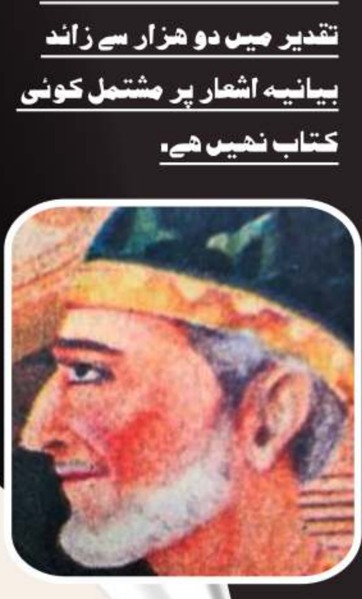

چنے لفظ لیا ہور معنی بلند

کتنے پتے کی بات کہی ہے کہ لفظوں کے انتخاب کے ساتھ معنی کی بلندی سے معمور الفاظ ہی مستعمل ہوں تا کہ عظمتِ شعر قائم ہو۔ یہ ایک کلیہ ہے جو تخلیقی ہنر مندی کے لیے جوہرِ فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ معنی کی تہہ داری اور تمازت سے ہی فنی محاسن ممکن ہے۔ اس باب میں کئی اور بھی اہم اصولوں کا ذکر ہے۔ وجہی نے بڑی دردمندی سے جاوداں فن کے لیے انھیں لازم قرار دیا ہے گویا جگر کاوی یا خونِ جگر کے بغیر کوئی فن پارہ دیرپا نہیں ہوسکتا۔

وجہی نے اپنی زبان میں اس نکتے کو اس طرح بیان کیا ہے۔

ہنروند اس کون کہیا جائے گا
جکوئی اپنے دل نے نوا لیائے گا

ان کے علاوہ وجہی نے فن کو مقدس اور وہبی فیضان بتایا ہے۔ اس کے دائرہ اظہار میں پاکیزہ مضامین کی ہی گنجائش ہے۔

ہر ایک بول ہے وجی یو بول نین

اس سلسلۂ کلام کے اختتام پر ایک اور مثال حاضر کرنا چاہوں گا۔ وجہی نے شعری فن کو نگینہ سازی سے تشبیہ دی ہے گویا آراستگی یا حسن آفرینی کو تلازمۂ فن بتایا ہے۔ ساتھ ہی اس عمل میں مشقت ومزاولت کو تقاضائے فن قرار دے کر ایک بڑی حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

سنار ہو کے سننے کے لفظاں گھڑیا
تن معنی چن چن انن پر جڑیا

مشق ومحنت کے بارے میں وجہی نے لکھا ہے۔

یتا میں مشقت کیا اس سبب
کہ پڑھ کر اسے منج کریں یاد سب

دیگر فن کاروں کی طرح ولی نے بھی جگہ جگہ شعری صنعت گری کے اصولوں پر اشارے کیے ہیں۔ ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

ولی نے نازک خیالی پر زور دیا ہے اور اپنے فن کی خوش نمائی میں اسے تحسین کے طور پر پیش کیا ہے۔

ہوا ہے شہرہ عالم میں مری نازک خیالی کا

اپنی طبیعت کے فطری تقاضے یا خمیر میں شامل اس عنصر کو نشان زد کیا ہے۔

ولی ہر شعر میں میرے نزاکت جلوہ پیرا ہے
عزیزاں طبع میں میری عجب نازک خیالی ہے

یہی نازک خیالی ہے جو فکرِ عالی کے وجود و نمود کا سبب بنتی ہے ولی کی نازک خیالی کے یہ لطیف اشارے خود ان کے کلام کی سب سے ممتاز خوبی ہے۔ جن میں حسن و لطافت اور پاکیزگیِ خیال کو فکرِ عالی سے ہم کنار کیا گیا ہے۔

جگ کے ادا شناساں ہیں جن کی فکر عالی
رنگیلے شعر کا کہنا کیا تھا ترک مدت سوں

بلند خیال رکھنے والے ہی مرے اشعار کی قدر کر سکتے ہیں۔

اے ولی جو کہ ہیں بلند خیال
شعر میرا پسند کرتے ہیں

وجہی نے فکرِ بلند کو خوش آمدید کہا تھا۔ ولی بھی اس فکرِ عالی کو سربلندی عطا کرتے ہیں۔ فن میں فکر کی بلندی و برنائی ملزوم ہے۔ ولی کے نزدیک فکرِ عالی رکھنے والے ہی جذب وجنوں کے کیف سے سرشار ہو سکتے ہیں۔

کہ عشق سرو قد رکھتا ہے جس کی فکر عالی ہے

دوسری جگہ اسی کو فکرِ رسا سے تعبیر کیا ہے۔ خود ستائی میں یہ خیال در آیا ہے۔

پڑھتے ہیں ولی شعر ترا عرش پہ قدسی
باہر ہے تری فکرِ رسا حدِّ بشر سوں

ولی نے نقدِ شعر کی نسبت سے ایک اور حکیمانہ راز بیان کیا ہے جس کی ادب میں بڑی اہمیت ہے۔ فن کو خواص پسند نہیں بلکہ اسے جمہور کے جذبات کا ترجمان ہونا چاہیے۔ تصورِ تخلیق کی یہ عمومیت پسندی قابل ذکر ہے۔

اپنے اشعار کو ہرگز توں نہ دے جذبۂ خواص

ولی کا یہ نکتہ ان کی شعری و فکری تخلیق کا آئینہ ہے۔ ادب کو عوام سے تعلق ہے مخصوص اشرافیہ سے نہیں۔ فن کو عوام کے جذبہ واحساس کی ترجمانی کے لیے وقف ہونے کی ضرورت ہے۔

میر نے بھی شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

کہہ کر ولی کے نقطۂ نظر کی تائید کی ہے۔ دکن کے سخن وروں کی تنقیدی نظر پر مزید غور و فکر کی ضرورت ہے۔ وجہی کی طرح لفظ و معنی کے ارتباطِ حسن پر بھی ولی کی نظر ہے۔ جس میں ان کی شعری اور حکیمانہ بشارت بھی شامل ہے۔ معانی کی پُر نور معنویت ولی کے پیشِ نظر ہے۔ اور لفظ رنگیں کی سحر آفرینی سے آگہی اس ارتباطِ حسن کی محکم دلیل ہے۔

نورِ معنی ہے آفتابِ سخن　　لفظِ رنگیں ہے مطلعِ رنگیں
جلوہ پیرا ہو شاہدِ معنی　　جب زباں سوں اٹھے نقابِ سخن

قلی قطب شاہ کا کلام بھی فن کے نقد و انتقاد کی نکتہ آفرینوں سے بھر پور ہے۔ محمد نصرت نصرتی (وفات 1674) نے کلام رنگیں کو گھنیرے شعر شوقِ افزا سے تعبیر کیا ہے۔ اس ترکیب کی وسعت اور بے کراں معانی کی پہنائی قابل غور ہے۔

بکھاں اے نصرتی ہر دم گھنیرے شعر شوق افزا

فن اور نقدِ فن کے نظریات پر دکن کے حوالے سے تفصیلی گفتگو ایک جامع مقالے کی متقاضی ہے۔ یہاں چند فن کاروں پر اشارے کیے گئے ہیں۔

شعری انتقاد کا احساس اور اظہار تقریباً ہر فن کار کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ یہ دکن پر ہی موقوف نہیں۔ راقم کا معروضہ یہ ہے کہ ہمارے قدیم کلاسیکی فن کاروں نے اصولِ فن پر بہت ہی مفید اور اہم گفتگو کی ہے۔ فن کے محاسن و معائب پر اصولی کتاب نہ سہی مگر اشعار میں ان کے مباحث اور محاسبے منتشر صورتوں میں موجود ہیں۔

بعض مفروضات نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ بلکہ وہ بڑے مہلک ثابت ہوئے ہیں۔ لمحوں کی بے بصیرتی نے قرنوں اور صدیوں تک گمراہی پھیلائی ہے۔ دکنی ادب کی تفہیم و تحسین بھی ایک بے بنیاد مفروضے کی ہدف بنی رہی۔ حیرت ہے کہ اردو کے ایک بڑے فن کار جس کو ہم خدائے سخن بھی تسلیم کرتے ہیں۔ میر تقی میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا کے آغاز میں ایک انتہائی اندوہ ناک بات لکھ دی:

''ریختہ از دکن است۔ چوں از آنجا یک شاعر مربوط برنخواستہ لہٰذا شروع بنام آنہا نکردہ''

گویا پورے دکنی ادب کو لائقِ اعتنا نہ سمجھا اور کسی بھی فن کار کو شاعرِ مربوط نہ کہہ کر اردو ادب کی پہلی تاریخی کتاب یا تذکرے میں پہلا پتھر غلط مفروضے پر رکھا گیا۔ کج فہمی کی وہ دیوار آج تک درست نہ ہو سکی۔

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر

ایک دوسرا مفروضہ ایہام گوئی کی تاریخ سے شروع ہوا۔ جب اردو کو 'بموافقِ محاورۂ شاہ جہان آباد' کے اعلامیہ سے سابقہ پڑا۔ زبان و بیان کی بے کراں وسعتوں کو شہروں اور علاقوں میں محدود کرنے کی شعوری کوشش کی گئی۔ اس بیش بہا سرمایۂ ادب کی بازآفرینی کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ اس ذخیرے کے امتیاز اور امکانات بے حد وسیع اور وقیع ہیں۔ اس ادب نے اردو ادب کی تاریخ کی قدامت کو تین سو سال سے زائد اضافے کی صورت بخشی ہے۔ اردو کی تاریخ اٹھارہویں صدی یا شاہ حاتم و آبرو سے نہیں شروع ہوئی۔ فخر الدین نظامی کی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' (1421-1434) کو ابتدائی تخلیق کہا جاتا ہے۔ راقم کی نظر میں ہماری ادبی تخلیق نظامی سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل ملا داؤد (ولادت 1286) کی مثنوی چندائن سے شروع ہوتی ہے۔ یہ ہماری بدتوفیقی نہیں بلکہ حرماں نصیبی ہے کہ ہم نے ملا داؤد کو دوسروں کے حوالے کر کے ناقابلِ تلافی نقصان کیا ہے۔ یہ خسرو کے معاصر ہیں۔ خسرو کا سارا کلام مشکوک و مشتبہ ہے مگر ملا داؤد کا نہیں۔ وہ متعین اور تحقیق شدہ ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

پرش ایک سرجس اجیارا　　ناؤں محمدؐ جگت سوں پیارا
جبہ لگ ہبے پرتھمی سری　　او تہ ناؤں منادی پھری

فخر الدین نظامی کی زبان بھی دیکھ لیں۔

محمدؐ بڑا راوتِ جگ تھا　　کہ شجرا چرن رائے جگ گ تھا
نبی یار تھے یار تھے جھار جھار　　بچارن نبی کام کرتے بچار

دکن نے مقامی زبانوں اور بولیوں کو ہم قبول کیا اور وسعتِ نظر کا ثبوت دیا۔ جو بعد میں متروک ہو گیا۔

دکنی ادب کو قدامت کے اعتبار سے بڑا امتیاز حاصل ہے۔ ہماری ادبی تاریخ صدیوں پرانے سرمایۂ تخلیق کے بہت بڑے ذخیرہ سے گراں بار ہے۔ یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ قدیم دور میں قابلِ رشک فن کاروں کی ایک کہکشاں آباد ہے۔ قلی قطب شاہ کے علاوہ وجہی، نصرتی، غواصی، ابن نشاطی جیسے سخنور اپنی مثال آپ ہیں۔ زمانی اعتبار سے اس ادب کو ایک فوقیت اور اولیت حاصل ہے۔ اس ذکر کے بغیر ادب کا تصور محال ہے۔ ابتدائی دور ہونے کے باوجود تخلیقی سرمایہ بے کراں وسعتوں سے ہم دوش ہے۔ بیانیہ شاعری کی ایسی مثال مشکل سے ملے گی۔ دکن کا یہ بھی ایک مخصوص امتیاز ہے بیانیہ شاعری نے مثنوی نگاری کو فروغ بخشا۔ یہ شاعری جذبہ واحساس کے ساتھ مظاہرِ عالم کی ترجمانی کا مؤثر وسیلہ ہے۔

اردو اور ولی دونوں مخلوط معاشرہ کے پروردہ تھے۔ دونوں کی سرشت میں لسانی اور ثقافتی سرشاری کا جوہر خاکِ وطن سے عبارت ہے۔ ولی صاحب نظر اور دور اندیش لسانی مبصر تھے۔ وہ مستقبل اور مقبولیت حاصل کرنے والی زبان کو اپنے آئینہ ادراک میں محسوس کر چکے تھے وہ جنوب و شمال کے فرق اور فاصلے کے قصے کو ایک جست میں تمام کرنے والے لسانی مفکر کی حیثیت سے پردہ تخلیق پر نمودار ہوئے۔ کلام میں بکھرے جابجا اشعار کے حوالے ہی کافی نہیں ہیں پوری پوری غزل مذکورہ بحث کی حمایت میں موجود ہے جن سے ولی کی بصیرت کا عرفان ہوتا ہے۔ کلیات کی غزل 441 کے چند اشعار لسانی حوالوں کے لیے توجہ طلب ہیں۔

کوچہ یار عین کاسی ہے　　جوگی دل وہاں کا باسی ہے
اے صنم تج جبیں اپر یہ خال　　ہندوئے ہر دوار باسی ہے
زلف تیری ہے موج جمنا کی　　تل نزک اس کے جیوں سنیاسی ہے

اس امتیاز کی دل کشا روایت کی مثالیں قلی قطب شاہ اور ولی کے کلام میں کثرت سے موجود ہیں۔ راقم کے نزدیک یہ عنصر دکنی ادب کی ایک نمایاں شناخت ہے۔ بلکہ اسے ایک عام رجحان یا رویہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جلیل القدر شاعر ولی پر اکتفا کر کے تفصیل سے گریز کر رہا ہوں۔ ولی نے مذہبی اقدار و اعمال کے خمیر سے اپنی شعری تخلیق کا ایوان تعمیر کیا ہے۔ تلمیحات و اشارات کی یہ کثرت اور تکرار اقبال کے علاوہ اردو کے کسی دوسرے فن کار کے شعری مجموعے میں موجود نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کئی امور میں ولی و اقبال ایک دوسرے سے قریب نظر آتے ہیں۔ ولی کی شاعر میں مذہبی حوالوں یا اقدار کا اجتماع ایک خوش نما کشکول ہے۔

تہذیبی علائم و آثار کے ذکر سے دکنی ادب خصوصیت کے ساتھ قابلِ رشک ہے۔ مثنویوں کے ساتھ غزلوں میں بھی روشن مثالیں ملتی ہیں۔ تینوں ثقافتی زاویے معاشرتی زندگی کی ہم آہنگی کی دلیل ہیں۔ یہ صرف ان کے ذاتی دین و مذہب تک محدود نہیں ہے۔ عقیدہ و مسلک کے اساطیری اثار و علائم کے وافر اشارات ولی کے کلام میں موجود ہیں۔

ہوتا ہے جیو مرا شاد اس کی بنسی سوں
گنگا رواں کیا ہوں اپس کے نین سیتی
آ رے صنم شتاب ہے روزِ نہان آج
جودھا جگت کے کیوں نہ مریں تج سوں اے سجن
ترکش میں تج نین کے ہیں ارجن کے بان آج
گرچہ چھمن ہے تیرا نام ولی　　اے سجن تو کسی کا رام نہیں
یاد کر کے خط کوں زلف صنم　　کام ہندو کا بید خوانی ہے
کیا وفا دار ہیں کہ ملنے میں
دل سوں سب رام رام کرتے ہیں
تری زلفاں کے حلقہ میں رہے یوں نقشِ رخ روشن
کہ جیسے ہند کے بھیتر لگیں دیوے دوالی کے

ہند و عرب کے ثقافتی آثار کے ساتھ ایران کے شعری و ثقافتی نشانات بھی کم نہیں ہیں۔ ولی کے کلام میں فارسی شعراء کا کثرت سے ذکر ہے۔ ولی کے یہ حوالے اردو شاعری میں غالب و اقبال کے علاوہ کہیں یہ کثرت نظر نہیں آتی۔ ولی نے محبوب کے سراپائے حسن کی شبیہہ سازی میں فارسی شعرا کے ناموں سے حیرت خیز فائدہ اٹھایا ہے۔

ترا مکھ مشرقی حسن انوری جلوہ جمالی ہے
نین جامی جبیں فردوسی و ابرو ہلالی ہے

یہ چھ شعرا کے جمال آفریں ناموں سے نسبت رکھتے ہیں۔

ان عناصر کے تذکرے میں یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ دکنی ادب کا قابلِ ذکر پہلو اخلاقی اقدار کی ترسیل و ترجمانی بھی ہے، جو اس کے امتیازات میں شامل ہیں۔ بیشتر سخنورانِ دکن نے اس پہلو کا احترام کیا ہے اور ان اقدار سے تخلیق کو آراستہ کیا ہے۔ ایک دو مثالوں سے وضاحتی اشارہ مقصود ہے۔ ولی درویش ہیں۔ مفکر یا مصلح نہیں ہیں اپنے شعارِ دین کی پاسبانی کرتے ہیں مگر وہ روئے زمین کے تمام ابنائے آدم کو رشتۂ بشریت میں برابر کی فضیلت کے قائل اور وحدتِ آدم کے ہر رنگ میں اختلاط پر قائم ہیں شہر سورت پر لکھی جانے والی نظم کے اشعار میں ان تصورات کا برملا اظہار ہے۔

اِتی آتش پرستاں کی ہے بستی
سکھے نمرود واں آتش پرستی
فرنگی اس میں اِتے ہیں کلہ پوش
عدواں جن کی گنتی میں ہو بے ہوش
وہاں ساکن اتے اہل مذہب
کہ گنتی میں نہ آویں ان کے مشرب
اگرچہ سب ہیں وہ ابنائے آدم
ولے بینش میں رنگا رنگِ عالم

انھیں قدروں سے متعلق ان کے اخلاقی محسنات بھی ہیں۔ جو ہر بشر کے لیے دائمی اقدار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ولی نے فلاح انسانی کے لیے انھیں مشروط قرار دیا ہے۔ دوسری اعلیٰ قدروں پر بھی نظر ہے

قسمت تری ہو حق پہ ناہونا امیدیاں
حاجت اپس کی کہنہ ونو اوس سوں کہہ ولی
سب کام اپس کے سونپ کے حق کوں پخت ہو
یہ ہے تمام مقصدِ گفت وشنید کا

زندگی کی کامرانیوں کے یہ زریں اصول اور اعمالِ حسنہ کے ضابطے اسرارِ فطرت کے تقاضے ہیں۔ ان اقدار کے نہاں خانوں میں فوز وفلاح کے راز مضمر ہیں۔ شاعر کی تاکید ہے کہ تقدیر کو سنوارنے کے لیے جولاں و سرگرداں رہنا پڑے گا۔ پوری غزل انقلابی بیداری کا پیغام پیش کرتی ہے۔

غفلت میں وقت اپنا نہ کھو　　ہوشیار ہو ہوشیار ہو
کب لگ رہے گا خواب میں　　بیدار ہو بیدار ہو

ایسی آوازیں دوسرے سخن وروں کے یہاں بھی موجود ہیں۔ قلی قطب شاہ کی قناعت و اطاعت پسندی کی تاکید ملاحظہ ہو۔

سب اختیار میرا تج بات ہے پیارا
جس حال سوں رکھے گا ہے او خوشی ہمارا

زیر مطالعہ ادب کا ایک اور امتیاز ہے۔ جو فطری اور انسانی نفسیات کے لطیف ترین محسوسات سے وابستہ ہے۔ محبت انسانی سرشت کا سب سے محترم اور محرک جذبہ ہے۔ جس کے مضمرات و ممکنات کی بے کراں کیفیات ہیں۔ یہ حدود و قیود سے آزاد ہے۔ یہ شاعری کا سب سے محبوب موضوع بھی ہے۔ اس جذب وکیف میں کرۂ ارض کے تمام انسان شریک ہیں۔ تاریخ عالم کے ہر دور میں حوادث اور واردات کا مختلف صورتوں میں اظہار ہوتا رہا ہے۔ فطرت نے اسی سبب مرد وزن کے مراسمِ محبت کو تکوینی نظام کے طور پر فروغ دیا ہے۔ ہماری شعری تخلیق میں خاص طور پر غزل کی شاعری کو عالمی شہرت حاصل ہے۔ غزل نے لطیف سے لطیف اور نازک سے نازک محسوسات کو پیش کر کے سب سے زیادہ اعتبار حاصل کیا ہے۔ فارسی شاعری کی پیروی کے ساتھ دوسرے اسباب کے تحت صنفِ نازک سے مردوں کا اظہارِ محبت محبوب تھا۔ دکنی ادب میں اس جذبے کی ترجمانی جنسِ لطیف کی جانب سے بھی ہوا ہے۔ جسے عینِ فطرت کہا گیا ہے۔ قلی قطب شاہ کے کلام میں مثالیں موجود ہیں۔

سہیلی بنے نیلی رت میں شوانی
مگھا چھائے انبر رنگا رنگ نہانی
عشق کے بنے بن سوپک نادگاوے
پپیہا کے بولاں سوں پیو پیو فغانی

کلیاتِ ولی اور ولی پر مونوگراف مرتب کرتے وقت دکنی ادب کا مطالعہ کیا تو محسوس ہوا کہ اس ادب میں ہزاروں گہرہائے آب دار موجود ہیں۔

مصادر

1 کلیاتِ ولی، مرتبہ پروفیسر عبدالحق، مینکر پٹ مشن نئی دہلی 2019
2 دیوانِ حاتم، مرتبہ پروفیسر عبدالحق دہلی 2010
3 قطب مشتری، مرتبہ پروفیسر م۔ن سعید کرناٹک اردو اکیڈمی بنگلور 2017
4 متاعِ فن، مرتبہ پروفیسر عبدالحق قومی کونسل نئی دہلی 2013
5 دیوانِ غالب مرتبہ پروفیسر عبدالحق مینکر پٹ مشن، نئی دہلی 2021
6 اقبال اور آرزوئے انقلاب، پروفیسر عبدالحق، نئی دہلی 2022
7 A History of Urdu Literature T.Graham Baily.
8 دکن میں اردو، ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی، نئی دہلی

■

Prof. Abdul Haq
Professor Emeritus, Dept. of Urdu
Delhi University
Delhi-110007
Mob.:9350461394

شکیل احمد خان

اردو شاعری اور ہندوستانی تہذیب

اردو زبان اپنے تشکیلی دور سے لے کر موجودہ دور تک کسی بھی سطح پر ہندوستانی ماحول، معاشرے اور مشترک مزاج اور سماج سے بے نیاز نہیں ہوئی ہے۔ یہ اس کے خمیر میں شامل ہے۔ یہ اخوت و محبت کی زبان ہے اور اتحاد و اتفاق کی علامت بھی، وطن دوستی، وطن پرستی، مساوات، رواداری اور قومی یکجہتی کی ضمانت بھی، اس کا ادب، اس کی شاعری اسی کی ترجمان ہے۔ داستان ہو کہ ناول، افسانہ ہو کہ انشائیہ، طنز و مزاح ہو کہ سفرنامہ، مرثیہ ہو کہ قصیدہ، غزل ہو کہ نظم سبھی مشترکہ تہذیب کی آئینہ دار بھی ہیں اور اس زبان کو تقویت پہنچانے کا باعث بھی۔

اردو زبان گنگا جمنی تہذیب اور ہند ایرانی کلچر کی منہ بولتی تصویر ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر ادب اپنے ماحول کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ چنانچہ مقامی عناصر، جغرافیائی حالات، عقائد و رسوم، تہذیب و تمدن، تقریبات و تہوار غرض معاشرتی زندگی کے تمام پہلو اپنے عہد کی ادبی تخلیقات میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اردو زبان پر عربی اور فارسی کا اثر ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں جو اردو ادب میں ہندوستانی عناصر سے آمیز ہو کر بڑی رنگ برنگی تصویریں تخلیق کی ہیں اور ہماری گنگا جمنی تہذیب کے حسین مرقعے اپنے دامن میں محفوظ کر لیے ہیں۔ جہاں تک عربی کا تعلق ہے اردو پر اس کے اثرات براہِ راست نہیں بلکہ بیشتر فارسی کے ذریعے مرتب ہوئے ہیں اور اردو نے جس فارسی کے زیرِ سایہ تربیت پائی وہ بیرونی زبان نہیں بلکہ ہندوستانی فارسی تھی، جس کی روایت صدیوں سے ہندوستانی فضا میں پروان چڑھ رہی تھیں اور اسے 'سبکِ ہندی' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور یہ ہندوستانی فارسی عوام کے بڑے حلقے اور خواص میں استعمال کی جاتی تھی۔ بہت سے ہندوستانی شاعر اسی 'سبکِ ہندی' میں شاعری کرتے تھے۔

اردو زبان کی مختلف اصنافِ سخن میں شاعری ایک اہم وسیلہ قرار پائی ہے، جس نے مشترکہ تہذیب کی علامت کو اجاگر کرنے میں اہم اور قابلِ اعتنا کردار نبھایا ہے۔ شاعری میں بھی صنفِ نظم ہی نے سب سے زیادہ ہندو مسلم میں اتحاد، بھائی چارگی، باہمی اختلاط، اخوت،

اردو زبان گنگا جمنی تہذیب اور ہند ایرانی کلچر کی منہ بولتی تصویر ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر ادب اپنے ماحول کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ چنانچہ مقامی عناصر، جغرافیائی حالات، عقائد و رسوم، تہذیب و تمدن، تقریبات و تہوار غرض معاشرتی زندگی کے تمام پہلو اپنے عہد کی ادبی تخلیقات میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اردو زبان پر عربی اور فارسی کا اثر ہے۔

ہمدردی، یگانگت، مساویانہ حقوق، میل جول اور اپنا پن کے احساس کو نمایاں کرنے میں معاون کردار ادا کیا ہے، اردو صنفِ نظم میں ایسے شعرا کی کمی نہیں ہے جنھوں نے ان موضوعات کو اپنی شاعری کا اہم وسیلہ بنا کر عوام کے دلوں پر راج کیا۔ مختلف ادوار میں مختلف شعرا حضرات کی آمد نے صنفِ نظم کے دامن کو مالا مال کیا۔ اردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کے آب و گل کی خوشبو ابتدا سے ہی ادبی فضا کو معطر و معتبر کیے ہوئے ہے۔ نظیر اکبرآبادی کی نظموں پر نظر ڈالیے۔ نظیر اکبرآبادی اُردو کے پہلے عوامی اور پہلے ترقی پسند شاعر ہیں۔ ان کی شاعری ایک ایسے خودرو پودے کی مانند ہے جو چمن بندی کے تکلفات سے آزاد رہ کر کھلی فضا میں پھلتی پھولتی ہے۔

حالی، آزاد، سرسید کی نیچرل نظم و نثر کو پرکھیے، جن میں ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کی حقیقت کی نادر و نایاب جھلکیاں نمایاں نظر آئیں گی۔ ہندوستان میں جب وطنیت اور قومیت کا سیاسی تصور پیدا ہوا تو شعرائے کرام کے لب و لہجے میں خود بہ خود تبدیلی پیدا ہوئی۔ شروع شروع میں اکبر الہ آبادی، برج نرائن چکبست، ظفر علی خاں، درگا سہائے سرور، علامہ اقبال، تلوک چند محروم، جوش ملیح آبادی، احسان دانش، ساغر نظامی، اور دوسرے شعرائے کرام کے نام اس سلسلے میں لیے جا سکتے ہیں۔

آزاد ہندوستان اور جمہوریت میں یقین رکھنے والا ہندوستان، ہندوستان کی ساری تاریخ، اس کے سارے سرمائے، اس کی کثرت نما اور وحدت اساس تہذیب، کشمیر سے کنیا کماری اور گجرات سے گوہاٹی تک اس کی

اردو زبان جدید ہندوستانی زبان ہے۔ یہ کھڑی بولی کا ادبی روپ ہے۔ کھڑی بولی کا علاقہ دہلی، میرٹھ اور روہیل کھنڈ ڈویژن پر مشتمل ہے۔

بساط رنگین اور اس کے سارے نقش اور آثار، اس کی زبانوں، اس کے کھیت اور کھلیان، اس کے صنعتی اداروں اور کارخانوں، اس کے پہاڑ، دریا، جنگل اور میدان، اس کے اونچے ابرو والے شہری اور اس کے بھولے بھالے عوام، اس کے پنڈت اور ودوان اور اس کے اَن پڑھ دیہاتی، سبھی کو اپناتا ہے، سب پر نظر رکھتا ہے اور اس کے دل کی دھڑکن میں سبھی کے دل کی دھڑکن شامل ہے۔

اردو زبان جدید ہندوستانی زبان ہے۔ یہ کھڑی بولی کا ادبی روپ ہے۔ کھڑی بولی کا علاقہ دہلی، میرٹھ اور روہیل کھنڈ ڈویژن پر مشتمل ہے۔ دھریندر ورما نے بھی یہ تسلیم کیا ہے ''تاریخی نقطۂ نظر سے کھڑی بولی ہندی کی بہ نسبت... کھڑی بولی اردو کا چلن بہت پہلے ہونے لگا تھا۔''

اردو کے قدیم ترین نمونے صوفیہ کے جستہ جستہ فقروں یا جملوں کے علاوہ صرف منظوم شکل میں ملتے ہیں۔ ان دستیاب نمونوں کی بحر عموماً ہندی ہے۔ ہندی کا مخصوص چھند دوہا ہے۔ ہندی کے مسلمان صوفی شعرا کے یہاں دوہا اور چوپائی بے حد مقبول چھند ہیں۔ اردو نظم کے قدیم ترین نمونے دوہے کی بحر میں ملتے ہیں۔ بابا فرید کا وہ کلام جو گرنتھ صاحب میں محفوظ ہے، دوہا چھند ہی میں ملتا ہے۔ امیر خسرو کی ہندوی یا ہندی شاعری کا پہلا مستند نمونہ دوہے کی شکل میں ملتا ہے۔ سودا، حاتم، انشا، جرأت، نظیر سب کے یہاں دوہے ملتے ہیں۔

چوپائی کی بحر دکنی شعرا کے یہاں ملتی ہے۔ بعض دکنی شعرا نے غزلوں تک میں ہندی بحریں استعمال کی ہیں۔ ولی سے پہلے دکنی ادب پر ہندی اور ہندو دیومالا کا گہرا اثر ہے۔ سترہویں صدی میں دکن میں اردو کا خاصا ادبی سرمایہ ملتا ہے، جس پر ہندوستانی مزاج کی چھاپ مسلم ہے، یہاں تک کہ قدیم اردو کے اس سرمایے کو تمام تر ہندی کہنے کا میلان ہندی والوں میں ملنے لگا ہے۔ جیسے ہندوستانی موسم اور ہندوستانی عورت کے داخلی جذبات ایک دوسرے سے مل کر شیر و شکر کا سا لطف پیدا کرتے ہیں۔

دکنی غزل گویوں کے سرتاج ولی کے یہاں بھی بکثرت ہندوستانی تلمیحات استعمال کی گئی ہیں۔ یہاں یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ قلی قطب شاہ اور ولی دکنی کا کلام ہندوستانی عناصر سے لبریز ہے۔ اسی طرح میر تقی میر کی مثنویاں ہوں یا شکار نامے ہر جگہ مقامی رنگ اور ہندوستانی فضا نظر آتی ہے۔ نعتیہ قصائد کی تشبیب میں ہندوستانی فضا نہایت حسن کے ساتھ محسن کاکوری کے مشہور نعتیہ قصیدے میں ملتی ہے۔

انیس ودبیر کے مرثیے واقعاتِ کربلا سے متعلق ہیں اور ان کے کردار عربی ہیں لیکن ان کی روح ہندوستانی ہے۔ ان کی نشست و برخاست، طرزِ گفتگو، رسم ورواج حتیٰ کہ مزاج تک ہندوستانی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اردو مثنویاں بھی ہندوستانی عناصر سے عاری نہیں ہیں۔ سحرالبیان، گلزارِ نسیم، زہرِ عشق، میں ان کی جھلک قدم قدم پر نظر آتی ہے واجد علی شاہ کا رہس، امانت کی اندر سبھا اور واسوخت رنگین اور جان صاحب کی ریختی غرض کوئی صنف ایسی نہیں جو ہندوستانی رنگ میں رنگی ہوئی نہ ہو۔

اردو کی پیدائش ہی دو بڑی تہذیبوں کے ملاپ کا نتیجہ ہے۔ یوں تو ہر زبان دلوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہے، لیکن اردو بطور خاص یہ فریضہ انجام دیتی آئی ہے کیونکہ محبت، وسیع النظری اس کی سرشت میں داخل ہے۔ تہواروں کی بات کریں تو ہولی کا رنگین اور جھمکتا ہوا روپ ہمیں نظیر اکبرآبادی نے دکھایا ہے۔

محمد حسین آزاد نے نیچرل شاعری کا پرچم بلند کیا تو اس کے تلے جمع ہونے والے نظم گویوں کے لیے لازم ہوگیا کہ اپنے معاشرے اور ماحول کی حقیقی ترجمانی کریں۔ حالی کی مسدّس اپنے سماج کا آئینہ ہے۔ رفتہ رفتہ اردو نظم کی روایت جوان ہوئی۔ اکبر، چکبست، اقبال، اختر شیرانی، جوش، احسان دانش، میراجی، فیض وغیرہ کے کلام میں ان کے عہد کی ہندوستانی زندگی مختلف انداز میں جلوہ گر ہوئی۔

1960 کے آس پاس، جب اردو ادب میں جدیدیت کا دور دورہ ہوا تو اس کے بڑے مفید نتائج برآمد ہوئے اور اردو شاعری میں ہندوستان زیادہ پھیل کر داخل ہوا اور دیومالائی علامت نگاری کو فروغ ملا۔ اردو کی نئی نظموں میں ہندوستانیت جس حد تک رونما ہوئی ہے اور ان میں ہندوستانی دیومالا سے جتنا استفادہ کیا گیا ہے۔

ہندوستانی شہروں کے نام بھی اردو شاعری کے لیے نئی چیز نہیں تھی۔ ولی نے سورت کی تعریف کی تو میر، ذوق اور کئی دوسرے شعرا کے پاس دلّی کا ذکر مختلف پہلوؤں سے کیا گیا ہے۔ نازنینانِ کلکتہ غالب کی غزل کا موضوع بن چکی ہیں۔ کبھی مجاز نے لکھنؤ کی تعریف میں اشعار کہے تو کبھی اقبال نے فرزندانِ علی گڑھ سے خطاب کیا۔ بمبئی کا ذکر بھی بہت سے شعرا کے یہاں آیا ہے۔ صبح بنارس اور شامِ اودھ کے حسن و جمال کی تعریف وتوصیف میں بے شمار شاعروں کے اشعار ملتے ہیں۔ نئی غزل نے بھی اس صحت مند روایت کو کافی آگے بڑھایا، چنانچہ کلکتہ سے متعلق تو باقاعدہ ایک طویل نظم 'کلکتہ ایک رباب' (حرمت الاکرام) کتابی صورت میں شائع ہوچکی ہے۔ غرض یہ کہ کلکتہ، گوہاٹی، بھوپال، رام پور، دہلی وغیرہ شہروں کا ذکر مختلف نہج سے آیا ہے۔

دراصل اردو کی پیدائش ہی دو بڑی تہذیبوں کے ملاپ کا نتیجہ ہے۔ یوں تو ہر زبان دلوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہے، لیکن اردو بطور خاص یہ فریضہ انجام دیتی آئی ہے کیونکہ محبت، وسیع النظری اس کی سرشت میں داخل ہے۔ تہواروں کی بات کریں تو ہولی کا رنگین اور جھمکتا ہوا روپ ہمیں نظیر اکبرآبادی نے دکھایا ہے۔

اردو غزلیات میں ماحول ومعاشرت، تہذیب وتمدن، رسوم وروایات، رہن سہن، توہمات پرستی، زیورات، دیومالائی اثرات اور مقامات وغیرہ کی جو جھلکیاں نظر آتی ہیں، انھیں دیکھ کر ہندوستان سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ آج ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری نئی غزل کے شعرا نے بہت حد تک عجمی تلمیحات وتشبیہات سے کنارہ کشی اختیار

کر کے ہمارے ملک کی تلمیحات وتشبیہات مثلاً: کوہِ الوند، طورِ سینا، کوہِ بیستوں کے استعمال سے پرہیز کر کے ہمارے ملک کے پہاڑ، دریا جنگلات اور تالاب وغیرہ کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ پرانی علامات کی جگہ نئی علامات نظر آنے لگی۔ ہندوستانی موسم، ہندوستانی چاند سورج، یہاں کے جنگلات، یہاں کے درخت، غرض یہ کہ تمام عالم گیر علامات کے ساتھ خالص ہندوستانی جنگلات اور پہاڑوں کا ذکر ہماری اردو غزلیات میں نظر آتا ہے۔

اکثر غزل گو شعرا کے اشعار میں کہیں دیپک راگ، کہیں برکھا رُت، شامل ہے تو کہیں ہندوستانی سرزمین میں پائے جانے والے درخت اور پودوں کی بھرمار نظر آتی ہیں۔ کئی شعرا کے اشعار میں آپ کو چھتوں پر نیم کی ہری ہری شاخیں نظر آئے گی، تو کہیں نیم کی پتّیوں کا ذکر ملے گا، کہیں نیبو کی کیاری، تو کہیں پیپل کی بلندی، اور اس پیپل کی گھنے سائے کا تذکرہ، آم جو خاص طور سے ہندوستانی درختوں کا سرتاج ہے۔

اردو غزل گویوں کے موضوعات میں چنار کی شاخیں، کیکر اور جامن کے درخت، ببول اور شہتوت، بانسوں کے جھنڈ ناگ پھنی اور بیر کے پودے، مہوے کے درخت، شیشم کے تناور پیڑ صندل کے پودے، کیلے کے پودے، برگد کا پیڑ، اسی طرح شریفے بھی اس ہندوستانی فضا میں نظر آتے ہیں۔

اسی کے ساتھ ہمیں اردو غزل میں کھیتوں کا تذکرہ، چنچل پنچھیوں کا ذکر، گندم، سرسوں، کپاس کی فصلوں کا ذکر، غرض ہندوستان میں اگائی جانے والی تمام فصلیں بھی موجود ہے۔

اردو غزل ہندوستانی پھولوں کی خوشبوں سے مہک رہی ہے۔ جہاں اردو غزل گویوں کی فکر کو رات کی رانی کی خوشبو بھی معطر کرتی ہے وہی ہندوستانی روایت کے مطابق اس کے آس پاس سانپوں کا خدشہ بھی ہوتا ہے۔ ہندوستان کا قومی پھول کنول بھی اردو غزل میں جلوہ گر ہے، سورج مکھی کی موجودگی بھی ہے، اور متعدد شعرا کے یہاں سرسوں کے پیلے پیلے پھولوں کا تذکرہ بھی موجود ہے، ان ہندوستانی پھولوں کے ساتھ ساتھ سبزہ بھی ہندوستانیت سے بیگانہ نہیں ہے۔

اردو غزل گویوں کے موضوعات میں چنار کی شاخیں، کیکر اور جامن کے درخت، ببول اور شہتوت، بانسوں کے جھنڈ ناگ پھنی اور بیر کے پودے، مہوے کے درخت، شیشم کے تناور پیڑ صندل کے پودے، کیلے کے پودے، برگد کا پیڑ، اسی طرح شریفے بھی اس ہندوستانی فضا میں نظر آتے ہیں۔

اردو غزل میں پروانے کے ساتھ ساتھ جگنو بھی نظر آتا ہے، ہرنوں کی قلانچوں کے ساتھ جنگل میں ناچتے مور بھی، پہاڑوں کی چوٹیوں پر گلہریاں دکھائی دیتی ہیں، درختوں پر کوئل کی کوک سنائی دیتی ہے تو کہیں مٹھو میاں، تو کہیں مینا پنجرے میں نظر آتی ہے، غرض ہر ہندوستانی چرند پرند کا ذکر اردو غزل میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ اردو غزل میں ہندوستانی موسم، رسم ورواج، کا بھی تفصیلی تذکرہ موجود ہے، اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اردو زبان میں 'بارہ ماسہ' جیسی خالص ہندوستانی صنف سخن موجود ہے۔ جس پر ہندوستانیت کا ایک خاص اثر نظر آتا ہے اور اسی طرح کسی ملک کے تیوہار بھی اس ملک کی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں، ہندوستان میں مختلف فرقوں کے لوگ بستے ہیں، ان فرقوں کے تیوہاروں کا ذکر بھی اردو غزل میں تفصیل کے ساتھ ملتا ہے، اور ان تیوہاروں پر ہندوستانی مشترکہ کلچر کا بہت گہرا اثر ہے، جس کی تفصیل بیان کرنے کی گنجائش یہاں نہیں، جہاں عید، شب برات، محرم اشعار میں موجود ہیں، وہی دیوالی، دسہرہ، گنگا اشنان، درگا پوجا، ہولی، کا بھی ذکر غزل میں نظر آتا ہے۔

اردو غزل میں سوت کاتنے، دھان کوٹنے، ساحلوں پر مانجھیوں کے گیت، دل کے دیے میں لہو جلا کر کاجل پارنے کا ہندوستانی عمل، غرض یہ کہ خالص ہندوستانی زندگی، ہندوستانی کھیل تماشے، تفریحی مشغلے، کبوتر بازی، شادی بیاہ کی تقریبات اور ان سے متعلق رسم ورواج، ثقافت، تمدن، سکھیوں کی ٹولی کا بابل کے گیت گانا، مانگ میں سندور بھرا جانا، ہلدی ملنے سے بدن کا زرد ہونا، یہی نہیں بلکہ دیگر علاقائی عقائد کی آمیزش بھی ہماری مشترکہ تہذیب کی جھلکیاں اردو غزل کے اشعار میں موجود ہیں۔

اردو غزل کے ہی اشعار میں آپ نے دیکھا رادھیکا بھی ہے شوخ کنہیا بھی، رام بھی، راون بھی، لچھمن بھی، بلکہ یوں سمجھیے کہ مہابھارت، رامائن، اور میگھ دوت وغیرہ کے تمام کردار نظر آتے ہیں۔ آپ نے اردو غزل میں ہی محسوس کیا ہوگا کہ رام چندر جی کے بن باس کا واقعہ پوری اردو غزل کے لیے کشش کا باعث ہے۔

آخر میں یہ جاننا ضروری ہے کہ اردو غزل میں تاریخ ہند کی بھی بھرپور عکاسی ملتی ہیں اور ہر ایک ہندوستانی تاریخ سے واقف ہے، اردو غزل نے ہندوستان کی تاریخ سے بھی اپنے لیے تشبیہات وتلمیحات اور مواد اخذ کیا ہے اور ہندوستانی سماج کے تصورات ورجحانات اجاگر کیے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے اردو زبان وجود میں آئی اور ایک مشترکہ تہذیب بھی۔ اسی لیے یہ تمام عناصر ایک دوسرے کو بھی متاثر کرتے رہے ہیں اور اردو غزل کے یہ تمام اشعار اردو شاعری کی اس روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں، جو ہندو مسلم گنگا جمنی تہذیب کا مظہر ہے۔

مشہور ماہر لسانیات اور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے 'مراثی انیس میں ہندوستانیت' کا جائزہ لیتے ہوئے کہا:''

یہ واقعہ ہے کہ زبان کا استعمال اپنے ساتھ ایک مخصوص ذہنی فضا، ایک مخصوص ملکی مزاج اور ایک مخصوص سماجی رنگ لے کر آتا ہے اور جس شاعر کی لفظیات اور ان کے استعمال کا دائرہ جتنا بڑا ہوگا اسی نسبت سے زبان کا اپنا مخصوص سماجی رنگ اس کی شاعری میں زیادہ جھلکے گا۔''

(ماہنامہ آجکل، جون 1975، دہلی، میرانیس نمبر ص 29)

غرض یہ کہ اردو غزل جس مجموعی فضا کی تخلیق کرتی ہے۔ وہ خالص ہندوستانی فضا ہے اور اردو میں ایسے اشعار موجود ہیں جن میں غیر مرئی ہندوستانیت رچی وبسی ہے اور اردو غزل میں بہت کثرت سے شامل ہے، جن کی نشاندہی کے لیے سیکڑوں صفحات بھی ناکافی ہیں۔

■

Dr. Shakeel Ahmad Khan
Dept of URDU
Government Vidarbha Institute of
Science & Humanities
Amravati- 444 604 (MS)
shakeelykhan@gmail.com

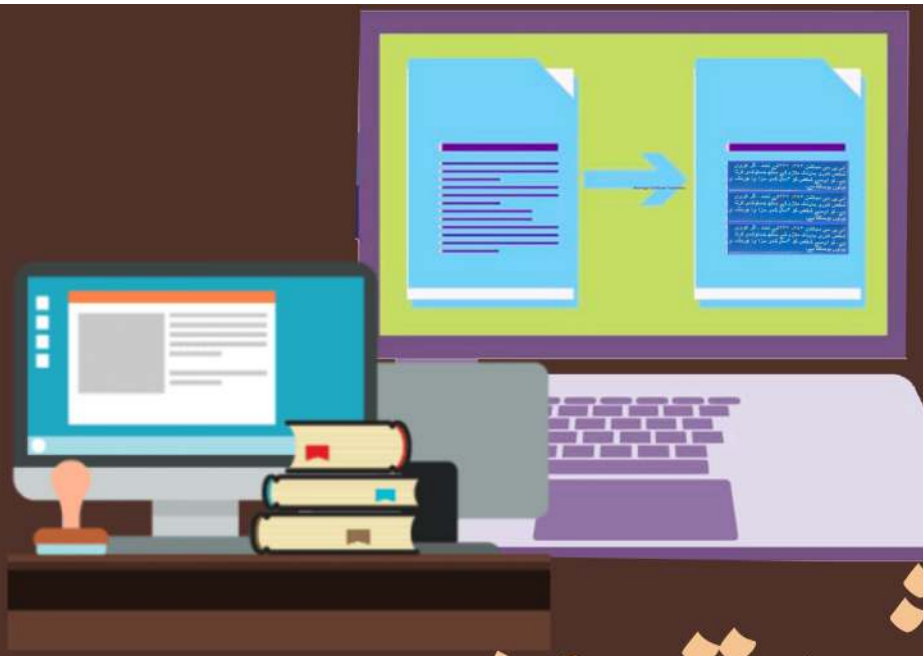

پرویز احمد

اردو میں مشینی ترجمہ مضمرات و ممکنات

آج اردو میں مشینی ترجمہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اب یہ بات کرنا کہ اردو میں مشینی ترجمہ ممکن ہے یا نہیں؟ کم عقلی یا دقیانوسی خیالات جیسی بات تسلیم کی جائے گی کیونکہ اب ہمیں مشینی ترجمے کے بارے میں یہ سوچنا ہے کہ موجودہ وقت میں مشین 85 فیصد یا اس سے تھوڑا کم یا زیادہ درست ترجمہ فراہم کر رہی ہے، اس میں مزید بہتری کیسے لائی جائے؟ کیونکہ اب اسے مانجھنے ہی کا کام رہ گیا ہے۔ مشین کا کام انسان کے کام کو آسان سے آسان تر بنانا ہے یعنی اگر مشین نے ہمارے 5 دن کے کام کو 5 گھنٹے کا کام بنا دیا تو بس ہے۔ اس کے بعد ہمیں ترجمہ شدہ متن کو ایک بار دیکھنا ضروری ہے کہ مشین نے کہیں سمجھنے میں غلطی تو نہیں کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشینی ترجمے کے عمل پر ابھی بھی متواتر بہتر سے بہترین بنانے کا کام چل رہا ہے۔ مشین کے ذریعے کیے گئے ترجمے کو ایک بار بھی نہ دیکھنا تو بڑی بھول ہوگی۔ کیونکہ انسانی ترجمے میں بھی بعض اوقات ایسی ایسی غلطیاں دیکھنے کو مل جاتی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ جیسے ایک صاحب نے female elephant کا ترجمہ خاتون ہاتھی اور gobar gas plant کا ترجمہ گوبر گیس کا پودا بھی کیا ہے۔ جب ناچیز نے اس مضمون کو لکھتے وقت Gobar gas plant اور male feelephant کا ترجمہ stars21.com سے تجربے کے طور پر کیا تو مشین نے مادہ ہاتھی اور گوبر گیس پلانٹ ترجمہ کیا۔ اسی طرح کسی وقت مشین نے سری لنکا کا ترجمہ 'جناب لنکا' بھی کیا تھا لیکن اب ایسا ممکن نہیں ہے۔

درج بالا مثالیں پیش کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جب انسان سے سہو ہو جاتا ہے تو مشین کا کیا ہے؟ وہ تو بہر حال مشین ہے۔ اس کی تو ابھی بھی تربیت جاری ہے۔ خیر اب مشینی ترجمہ بھی وہاں تک پہنچ چکا ہے کہ اب اس میں مزید بہتری کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔

ہر زبان کا اپنا مخصوص نظام ہوتا ہے، جو اس کی پرداخت میں شامل ہوتا ہے، اسی طرح اردو بھی ہے۔ مشینی ترجمے کے سلسلے میں اردو کی ساخت، املا، جملہ اور تحریر کے نظام کو بروئے کار لانے میں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور اب بھی کچھ نہ کچھ مسئلے آتے رہتے ہیں، یہاں ان مسائل کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

اردو املا کے مسائل

مشینی ترجمے میں اردو املا کے بہت سے مسائل تھے/ ہیں۔ کیونکہ حرف سازی کرنے والوں کے ہاتھ کچھ مخصوص طریقے سے چلتے ہیں۔ اِن پیج کی خوبی یہ ہے کہ اس میں 'ی' اور 'ے' جب کسی لفظ کے درمیان آتی ہیں تو ان کا فرق مٹ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں صرف 'ی' اور 'ے' کا مسئلہ نہیں ہے۔ اس سے بڑا مسئلہ تو آیئے، لیجیے (لیجئے، لیجیئے، لیجیۓ)، دیجیے اور کیجیے کا ہے، جن کے ایک سے زائد املا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اب آیئے ایک نظر اردو املا کے چند مسائل پر ڈالتے ہیں۔

عموماً اردو میں اعراب کا استعمال نہیں کیا جاتا، جس کی وجہ سے مشین (کمپیوٹر) کو متن کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ مثلاً: اگر کوئی م+ی+ل = میل لکھتا ہے تو اسے مِیل، مِیل اور مَیل اور ر+ی+ل= ریل لکھتا ہے تو اسے رِیل اور ریل پڑھا جا سکتا ہے۔ اب ی اور ے کو چھوڑ دیں تو گنَا، گُنا اور گِنا؛ جو، جَو اور جُوْ اور بَنا، بِنا اور بُنا کا معاملہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ انھیں کب کیا پڑھنا ہے؟ اسے انسان متن کے پس منظر کو سمجھ کر پڑھ سکتا ہے۔ اب مشین بھی یہ کام کر سکتی ہے۔ کیونکہ مصنوعی ذہانت نے اس کام کو آسان بنانے کی طرف بڑی تیزی سے پیش قدمی کی ہے۔ اب مشین بھی انسانوں کی طرح پس منظر کو سمجھ کر پڑھ سکے گی ایسا تصور کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ اب مصنوعی ذہانت کے بل بوتے کو پائلٹ اور چیٹ جی پی ٹی ہمارے ایک حکم پر نہ صرف بنیادی اطلاع بلکہ مضمون لکھ کر دینے کے لیے بھی بے چین نظر آتے ہیں۔ اب انھیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چند برسوں میں اطلاعاتی ٹیکنولوجی کے ذریعے بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے اور کچھ نئے چیلنجز پیدا ہوں گے۔ اطلاعاتی ٹیکنولوجی کی روز افزوں ترقی کو دیکھ کر ایسا تصور کیا جا رہا ہے کہ آئندہ چند برسوں میں مشینی ترجمے کی صورت حال پوری طرح تبدیل ہو جائے گی۔

اردو املا میں خالی جگہ کا مسئلہ

ہم نے درج بالا سطور میں جو مثالیں پیش کی ہیں، وہ صرف املے کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ان الفاظ کی قواعدی حیثیت کا بھی مسئلہ ہے۔ کمپیوٹر کی ساخت ایسی ہے کہ وہ دو خالی جگہوں کے درمیان جو کچھ بھی ہے، اسے ایک لفظ تسلیم کرتا ہے جب کہ اردو میں ایسے بہت سے لفظ ہیں، جن کو الگ الگ لکھا جاتا ہے اور اہلِ اردو اسے ایک ہی لفظ تصور کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی سمجھنا ہے کہ اردو میں خالی جگہ (Space) کا مسئلہ دو طرح کا ہے۔ اول: ا، د، ڈ، ذ، ر، ڑ، ز، ژ، و کے کسی لفظ کے درمیان یا آخر میں آنے سے پیدا ہوتا ہے اور دوسرا لفظ کے درمیان اسپیس آنے سے پیدا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر: 'ذاکر آیا اور زید کو لے کر گیا'۔ اس جملے کے لفظ کے آخر میں ایسے حروف آئے ہیں جو بعد کے حروف سے دوستی نہیں کرتے جیسا کہ دیگر حروف کرتے ہیں یعنی ر، ا، د اور و۔ ہمیں اسے پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی جب کہ کمپیوٹر دو خالی جگہوں کے

موجودہ وقت میں مشین 85 فیصد یا اس سے تھوڑا کم یا زیادہ درست ترجمہ فراہم کر رہی ہے، اس میں مزید بہتری کیسے لائی جائے؟ کیونکہ اب اسے مانجھنے ہی کا کام رہ گیا ہے۔ مشین کا کام انسان کے کام کو آسان سے آسان تر بنانا ہے یعنی اگر مشین نے ہمارے 5 دن کے کام کو 5 گھنٹے کا کام بنا دیا تو بس ہے۔ اس کے بعد ہمیں ترجمہ شدہ متن کو ایک بار دیکھنا ضروری ہے کہ مشین نے کہیں سمجھنے میں غلطی تو نہیں کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشینی ترجمے کے عمل پر ابھی بھی متواتر بہتر سے بہترین بنانے کا کام چل رہا ہے۔

درمیان جو کچھ ہوتا ہے، اسے ایک لفظ سمجھتا ہے۔ اب اگر مذکورہ جملے پر غور کریں تو اس میں خالی جگہ 'لے' کے بعد چھوڑی گئی ہے۔ اس لیے کمپیوٹر 'ذاکر آیا اور زید کو' ایک ہی لفظ سمجھے گا۔ اب اس لفظ کو مشین جب اپنے لغت سے ملان کرے گی تو اسے ایسا کوئی لفظ ملے گا ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ وہ متبادل زبان میں ترجمہ فراہم کرنے سے قاصر ہوگی۔ دوم قسم کی مثال ایسے الفاظ کی ہے، جن کے درمیان خالی جگہ ہوتی ہے۔ جیسے: تاج محل، دیدہ ور، ذمہ داری، دانش مندی، صحت مند، صورتِ حال، حملہ آور، بین الاقوامی، خانہ خراب، حتی الامکان، وغیرہ۔ یہاں بھی معاملہ کمپیوٹر کی تربیت کے بالکل برعکس ہے۔ اس کے لیے باقاعدہ اصول لکھے گئے اور پروگرامنگ کی گئی ہے تا کہ مشین لفظ کو سمجھ سکے اور اس کا جواب دے سکے۔

کمپیوٹر دو خالی جگہوں کے درمیان جو کچھ بھی ہوتا ہے، اسے ایک لفظ تسلیم کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ جملے میں آئے تمام الفاظ کا صرفی ونحوی تجزیہ کرتا ہے پھر ہدفی زبان میں جملے تخلیق کرتا ہے۔ اب اگر زیرِ بحث جملے کو پیش نظر رکھیں تو 'ذاکر آیا اور زید کو لے کر گیا' میں خالی جگہ نہ ہونے کے باعث مشین اسے ایک ہی لفظ سمجھے گی جو کہ کمپیوٹر کی ڈکشنری میں موجود نہ ہوگا تو وہ جملے کا ترجمہ کرنے سے قاصر ہوگی۔ جب کہ جملے کا صرفی اور نحوی تجزیہ حسب ذیل ہے:

لفظ	صرفی تجزیہ	نحوی تجزیہ
ذاکر	اسم خاص	اسمی فقرہ
آیا	فعل	فعلی فقرہ
اور	حرف عطف	عطفی فقرہ
زید	اسم خاص	اسمی فقرہ
کو	حرفِ ربط	فعلی فقرہ
لے	فعل	
کر	امدادی فعل	
گیا	امدادی فعل	

(وضاحت: '... لے کر گیا' کو اگر اِن بیچ میں بنا خالی جگہ چھوڑے لکھیں گے تو یہ 'لیکر' بن جائے گا جو کہ کسی لغت میں نہیں ہوگا مگر یوٹی ایف 8 یا یونی کوڈ میں ایسا نہیں ہوتا۔)

مشینی ترجمہ حاصل کرنے کے لیے جب ہم مشین کو کوئی مواد فراہم کرتے ہیں تو مشین سب سے پہلے اس متن کا تجزیہ کرتی ہے یعنی جملے میں استعمال تمام لفظوں کے ''ماخذ، زمرہ، جنس، تعداد، شخص، حالت اور زمانے کا علم حاصل کرتی ہے اور دوسری سطح پر جا کر ہدفی زبان میں اس کی ساخت کے مطابق جملہ تخلیق کرتی ہے۔ آیئے اس بات کو ایک مثال کے ذریعے سمجھتے ہیں۔

لفظ	ماخذ	زمرہ	جنس	تعداد	شخص	حالت	زمانہ
word	root	category	gender	number	person	case	tense
ہم	میں	ضمیر	کوئی نہیں	جمع	متکلم	راست	00
لوگ	لوگ	اسم	مذکر	جمع	غائب	راست	00
گھر	گھر	اسم	مذکر	واحد	غائب	راست	00
سے	سے	حرف ربط	کوئی نہیں	00	00	00	00
آ	آنا	فعل	کوئی نہیں	00	00	00	00
رہے	رہ	امدادی فعل	مذکر	جمع	00	00	ماضی
ہیں	ہے	امدادی فعل	کوئی نہیں	جمع	00	00	حال

مذکورہ جدول میں جتنی اطلاعات درج کی گئی ہیں، اسے مشین فوراً سے پیشتر حاصل کر لیتی ہے۔ اس کے بعد صرفی و نحوی تجزیہ کر کے اگلی سطح پر جا کر جملے تخلیق کرتی ہے۔ اس سلسلے میں Word generator کا کام کافی اہم اور کسی حد تک تشفی بخش ہو چکا ہے۔ یہ وہ اطلاعات ہیں، جن پر مشینی ترجمے کی بنیاد بھارت میں 25-20 برس قبل رکھی گئی تھی۔ قواعد اور واحد جمع کے اصول، لفظی ذخیرہ، لغت اور زبان کی ساخت پر جب کام ہو چکا تب ہم یہاں پہنچے ہیں کہ آج مصنوعی ذہانت پر 'کو پائلٹ' اور 'چیٹ جی پی ٹی' میدان میں آئے اور آتے ہی وہ کارنامے انجام دیے کہ دنیا حیرت زدہ رہ گئی۔ یہ نہ صرف ترجمہ کرتے ہیں بلکہ مضمون، پی پی ٹی اور حکم دینے پر دیگر کام بھی کرتے ہیں۔

لفظ کی قواعدی حیثیت

زبان کا نظام بالکل ریاضی کی طرح 4=2+2 کے مصداق طے شدہ ہے۔ مثال کے طور پر ''لڑکا جاتی ہے، لڑکی جاتا ہے، لڑکے جاتے ہے اور لڑکیاں جاتی ہے'' کبھی نہیں ہوسکتا کیونکہ جملے میں استعمال کیے گئے تمام لفظوں کا آپس میں ایک رشتہ ہوتا ہے۔ فاعل کے واحد جمع اور مذکر مونث سے جملے کی ساخت طے ہوتی ہے۔ جملے میں فعل، فاعل اور مفعول کے درمیان ایک ساختیاتی رشتہ ہوتا ہے۔ فرڈی نینڈ سوسیور کے بہ قول جملے میں استعمال لفظوں کا آپس میں دو طرح کا رشتہ ہوتا ہے؛ اول افقی اور دوم عمودی۔

اس بحث کو یہیں چھوڑتے ہیں کیونکہ اس کی بحث یہاں چھیڑی جائے گی تو مضمون کی مرکزیت متاثر ہوگی اور طوالت بھی بڑھے گی۔ اس لیے ہم اپنے اسی موضوع پر آتے ہیں کہ کسی بھی لفظ کی کوئی طے شدہ قواعدی حیثیت نہیں ہوتی بلکہ یہ بات اہم ہوتی ہے کہ متکلم نے کسی لفظ کو اپنے جملے میں کس طرح برتا ہے، اسی سے اس مخصوص لفظ کی قواعدی حیثیت طے پائے گی۔ اب یہ بات لکھنے یا بولنے والے کے استعمال پر منحصر ہے کہ متکلم کس لفظ کو جملے میں کس طرح برتتا ہے؟ مثال کے طور پر ہم یہاں 'اور' کو منتخب کرتے ہیں، جس کے دل چسپ نتائج سامنے آئیں گے۔ ویسے تو قواعد میں 'اور' ایک معمولی حرف ہے، جس کی حیثیت عموماً 'حرف عطف' کی ہوتی ہے لیکن جب اہل اردو اسے استعمال کرتے ہیں تو اس لفظ کی قواعدی حیثیت: حرفِ عطف، صفت، صفت مقداری، اسم اور حرفِ تاکید کی بھی ہوجاتی ہے۔ جیسے:

1 حامد 'اور' ساجد ساتھ ہی نکلے۔ حرف عطف
2 کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں 'اور'۔ ارے! اس کی تو بات ہی 'اور' ہے۔ صفت
3 تھوڑا 'اور' لیجیے۔ صفت مقداری
4 اب کسی 'اور' کی بات کرتے ہیں۔ اسم
5 یہاں سے جاؤ ورنہ 'اور' پٹو گے۔ حرف تاکید

درج بالا مثالوں سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ ایک ہی لفظ کو ہم کئی طرح سے استعمال کرسکتے ہیں۔ جب ایک ہی لفظ مختلف قواعدی حیثیتوں سے مختلف جملوں میں استعمال ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ ان تبدیلیوں اور قواعدی زمروں کا سمجھنا مشین کے لیے بھی اہمیت کا حامل ہوگا۔ یہ مثالیں اس لیے پیش کرنی پڑیں کہ قارئین مشینی ترجمے کی دشواریوں، قواعدی پیچیدگیوں اور مشینی سمجھ کے دائرہ کار کو بھی بہ خوبی سمجھ سکیں۔ خاکسار کی مراد یہ ہے کہ مشین انسان کی طرح خود سمجھ کر فیصلہ نہیں کرسکتی بلکہ اس کے لیے پروگرامنگ اور تربیت کی ضرورت پڑتی ہے، جس کے لیے کمپیوٹیشنل لنگوسٹ کا کام انتہائی اہم ہوجاتا ہے۔ جن لوگوں نے قواعدی اصول، لفظوں کی مختلف حیثیت، مشینی ساخت کو سمجھ کر یہ کام انجام دیا اور دے رہے ہیں، وہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ وہ اپنے کام کو مزید بہتر بنانے کی کوششیں لگاتار کررہے ہیں حالانکہ شروع میں ان کو بہت سخت سست بھی سننا پڑا تھا۔ مشینی ترجمے کے سلسلے میں اب کو پائلٹ اور چیٹ جی پی ٹی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ دو برسوں میں انھوں نے بڑی برق رفتاری سے کام کیا ہے اور آج یہ دونوں مشینی ترجمہ، مضامین لکھنے اور پی پی ٹی بنانے جیسے کام کو آسان تر بنا رہے ہیں لیکن یہ تبھی ممکن ہوسکا جب زبان کے بنیادی اصولوں کا کام قدرے بہتر شکل میں آچکا تھا۔

> **مشینی ترجمے کے سلسلے میں اب کوپائلٹ اور چیٹ جی پی ٹی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ دو برسوں میں انھوں نے بڑی برق رفتاری سے کام کیا ہے اور آج یہ دونوں مشینی ترجمہ، مضامین لکھنے اور پی پی ٹی بنانے جیسے کام کو آسان تر بنا رہے ہیں لیکن یہ تبھی ممکن ہو سکا جب زبان کے بنیادی اصولوں کا کام قدرے بہتر شکل میں آ چکا تھا۔**

اردو آزاد الفاظ کی ترتیب والی ایک زبان

(Urdu is a free word order language)

اردو اور ہندی دونوں ہی لفظ کی آزاد ترتیب والی زبانیں ہیں یعنی جملے میں لفظ کو آگے پیچھے کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ معنیٰ کی ترسیل اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ جیسے: ''ساجدہ باغ میں گئی۔ باغ میں گئی ساجدہ۔ گئی باغ میں ساجدہ۔ ساجدہ گئی باغ میں'' وغیرہ۔ یہ ترتیب بھی مشین کو سمجھ میں آنی چاہیے۔ اس کے لیے tree bank کے اصول اپنائے گئے ہیں۔ (ٹری بینک کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں، مشینی ترجمے کی تکنیک اور اردو، آج کل، مارچ 2012، ص 20)

ابھی تک اس مضمون میں ہم نے جتنی باتیں کی ہیں، ان کا تعلق computational linguistics سے ہے۔ ٹری بینک کا قاعدہ یہ ہے کہ جس طرح اردو زبان لفظ کی آزاد ترتیب کی حامل ہے، اسی طرح ٹری بینک میں مشین بھی کسی بھی طرح سے جملے کو بروئے کار لاسکتی ہے۔ جیسے 'اسجد نے وارث کو کتاب دی' کی ترتیب کو ہم کئی طرح سے لکھ سکتے ہیں اور بول بھی سکتے ہیں، جس کی مثال اوپر آچکی ہے۔ ٹھیک اسی طرح مشین بھی جملے کا استعمال کرسکتی ہے۔ مشینی ترجمہ آج مصنوعی ذہانت /کوپائلٹ کے ذریعے (بندے نے اسی کا تجربہ کیا ہے) جتنی تیزی اور درستگی سے ہورہا ہے، اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ شاعری کی سطح پر بھی پہنچے گا۔

اردو املا کے مسائل کا حل اور لفظ کی قواعدی حیثیت

اردو میں املے کا مسئلہ دو طرح کا ہے، جس کا ذکر ہم نے پچھلے صفحے میں کیا ہے۔ اول مسئلہ ہجے کا اور دوسرا قواعدی حیثیت کا ہے۔ جیسے: پاؤں، پاوں، پانوں اور گاؤں، گاوں، گانوں، علاحدہ، علیحدہ، علٰیحدہ، علٰحدہ، علاحدہ، صحت مند اور ذمہ دار جیسے لفظوں کا ہے۔ مثال کے طور پر 'میں دسہری 'پانوں' تو فوراً ہی گنگ جاؤں'۔ اس جملے میں پانوں بہ معنی پیر یا پان کی جمع پانوں یا پاؤں یعنی پیر یا پانا کا حاصل مصدر (پیر کو 'ی' سے لکھیں گے تو پیر ہوجائے گا) مشین کیسے فیصلہ کرے گی کہ کیا درست ہے؟ اسی طرح گاؤں؛ گانا کا حاصل مصدر یا گانوں بہ معنی موضع یا گانا کی جمع گانوں۔ ایسے الفاظ میں املے ہی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ لفظ کی قواعدی حیثیت کا بھی ہے۔ دوسرا مسئلہ لفظوں کے درمیان آنے والی خالی جگہوں (Space) کا ہے یعنی تاج محل، اعظم گڑھ، حیدرآباد، جگر مرادآبادی جیسے اسمِ خاص کا، جن میں درمیان میں خالی جگہ بھی آتی ہے۔ تیسرا مسئلہ صحت مند، ذمہ داری، حتی الامکان وغیرہ جیسے لفظوں کا ہے۔ ہم نے ابھی تک املا کے جن مسائل پر بات کی ہے، ان میں سے زیادہ تر مسائل پر کام ہوچکا ہے یعنی کمپیوٹر کو اس بات کی تربیت دی جاچکی

ہے کہ کوئی علاحدہ، علیحدہ، علیحدہ، علحدہ، کیجیے، کیجئے، کیجیئے، کیجیۓ، آپکے، اسکے، انکے اور اسکیلیے بھی لکھے تو وہ اس کو سمجھ کر صحیح جواب دے سکے لیکن وہ جواب میں صحیح املا ہی لکھے گا۔ زبان کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو ایسے لفظ جن کی قواعدی حیثیت الگ ہو، ان کو دوسرے لفظ کے ساتھ ملا کر نہیں لکھا جانا چاہیے۔ مثال کے طور پر اسکے، انکے، آپکے، کیلیے اور اسکیلیے جیسے لفظوں کو اگر مدِ نظر رکھا جائے تو 'اس'، 'ان' اور 'آپ' ضمیر ہیں اور 'کے' حرفِ ربط ہے۔ اس لیے اِن دو قواعدی حیثیت کے حامل لفظوں کو ملا کر نہیں لکھا جانا چاہیے۔ افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ اردو میں ابھی بھی 'آپکیلیے' لکھا جا رہا ہے، جب کہ اردو کی کسی بھی لغت میں آپکیلیے یا کیلیے جیسے لفظ نہیں ملیں گے تو ظاہر ہے کہ ترجمہ کیسے ہوگا۔ جب کہ آپ 'ضمیر'، کے 'حرفِ ربط' اور لیے 'متعلق فعل' ہے یعنی تین الگ الگ قواعدی حیثیت کے حامل لفظوں کو ملا کر لکھنا، ان کے ساتھ سلوکِ ناروا کرنے جیسا نہیں ہے؟ اب اگر ایسے لفظ کو مشینی ترجمے کے لیے استعمال کیا جائے گا تو مشین ہی کا قصور نکلے گا کیوں کہ ہم نے انسانی ذہن کو سمجھ کر اس کی تربیت نہیں کی۔ کمپیوٹر بنانے والوں نے اس کی ساخت ایسی بنائی ہے کہ وہ ہر لفظ کی قواعدی حیثیت دیکھ کر صرفی اور نحوی تجزیہ کر کے جملے تخلیق کرتا ہے۔ جب کمپیوٹر کی لغت میں 'آپکیلیے' لفظ نہیں ہوگا تو وہ ترجمہ کہاں سے فراہم کرے گا؟ اس لیے ماہرین کے ذریعے اردو املے کے سلسلے میں جو مشورے دیے گئے ہیں، ان پر عمل کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ اس سے مشینی ترجمے میں بھی خاطر خواہ بہتری آئے گی۔

اردو فانٹ کے مسائل

جب کمپیوٹر میں اردو لکھنے کے لیے اِن پیج کے علاوہ دوسرا کوئی اختیار نہیں تھا تب سے آج تک کمپیوٹر سائنس اور ٹیکنولوجی نے اتنی تیزی سے ترقی کی ہے کہ آج ہر کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، ٹیبلٹ اور موبائل میں اردو موجود ہے اور یہ ساری ترقی پچھلے 25-20 برس

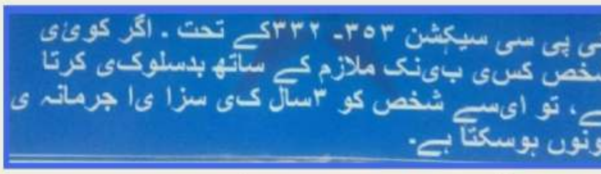

کے اندر ہی ہوئی ہے۔ اب ماہرین کا کرم ہے کہ اردو تقریباً ہر پلیٹ فارم پر موجود ہے۔ اردو والوں کو صرف اسے متحرک کرنا رہتا ہے لیکن اردو میں آج بھی اردو فونٹ کا ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اس کا عملی پہلو حسب ذیل ہے۔

درج بالا فوٹو میں فونٹ اردو املے کے اعتبار سے نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مسئلہ بھی ہے، جس میں لفظوں کے اندر درار آجاتی ہے۔ چاہے اسے جمیل نوری نستعلیق میں لکھا جائے یا علوی نستعلیق میں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو فونٹ کے دو طرح کے مسئلے یونی ایف 8 میں ہیں۔ درج بالا عکس میں موجود متن کو اگر اردو کے مخصوص فونٹ میں تبدیل کر لیا جاتا تو حرف ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔ اگر ہم مشینی ترجمے سے کوئی مواد اردو میں منتقل کر رہے ہیں تو ایک کلک میں ترجمہ کی ہوئی تحریر کو اردو فونٹ میں ڈھال لینا چاہیے۔ ایسا نہ کرنے سے حروف الگ الگ ہو گئے ہیں جو اردو تحریر سے واقف آنکھوں میں کھٹکتے ہیں۔ فونٹ کے اس مسئلے کو لے کر international institute of information technology-Hyderabad نے یو این او کو 2009-2010 میں لکھا تھا کہ اردو فانٹ اور گنتی میں مسائل آ رہے ہیں لہٰذا اس کی کوڈنگ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے لیکن کیا ہوا؟ خدا جانے!

" آج اردو میں مشینی ترجمہ جس مقام پر ہے، اسے دیکھ کر مایوسی قطعی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ پچھلے پندرہ برسوں سے اس میدان میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہمارے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ جب سے مصنوعی ذہانت کی بنیاد پر چیٹ جی پی ٹی اور کوپائلٹ نے ترجمہ کرنا شروع کیا ہے، اس سے بڑی تیز رفتاری آئی ہے۔ "

ایک گزارش

آج کا دور صارفیت کا دور ہے اور اس وقت زیادہ تر کمپنیاں کمپیوٹر، ٹیبلٹ، موبائل اور لیپ ٹاپ میں اردو فراہم کر رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ صوتی حرف سازی کی سہولت اردو میں بھی دستیاب ہے۔ اب اردو والوں کی یہ ذمے داری ہے کہ اپنے کمپیوٹر، لیپ ٹاپ اور موبائل میں اردو کو متحرک کریں اور پیغام رسانی کے لیے اردو ہی کو زیادہ سے زیادہ استعمال کریں اور 'رومن اردو' سے گریز کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس چیز کے جتنے زیادہ صارف ہوتے ہیں، کمپنیاں اس کی ترقی کی طرف اتنا زیادہ دھیان دیتی ہیں۔ اس طرح اردو املا اور فونٹ کے جو مسائل ابھی بھی ہمیں نظر آ رہے ہیں، ان مسائل کو دور کرنے کا کام بھی ہوگا اور مسائل بھی دور ہوں گے۔

آج اردو میں مشینی ترجمہ جس مقام پر ہے، اسے دیکھ کر مایوسی قطعی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ پچھلے پندرہ برسوں سے اس میدان میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہمارے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ جب سے مصنوعی ذہانت کی بنیاد پر چیٹ جی پی ٹی اور کوپائلٹ نے ترجمہ کرنا شروع کیا ہے، اس سے بڑی تیز رفتاری آئی ہے۔ یہ ایک متواتر کام ہے، جس میں نئے چیلنجز وقتاً فوقتاً آتے رہیں گے اور پھر اس کا حل بھی تلاش کیا جاتا رہے گا۔ اردو میں ٹیکنولوجی کا استعمال جوں جوں بڑھے گا، اسی قدر بہتری بھی آتی جائے گی۔ مشین کا کام انسان کے کام کو سہولت پہنچانا اور چار دن کے کام کو چار گھنٹے کا بنانا ہے اور اس وقت یہ کام سلیقے سے ہو رہا ہے۔ مصنوعی ذہانت اور چیٹ جی پی ٹی جب بازار میں آئے تو ہمیں یہ لگا کہ خدا معلوم اس میں اردو ہے کہ نہیں لیکن جب تجربہ کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اردو ہے اور ترجمہ کے ساتھ ساتھ مضمون نگاری اور دیگر سہولتیں بھی ہیں۔ زبانیں دو طرح کی ہوتی ہیں: اول فطری زبان (Natural language) اور مصنوعی زبان (Artificial language)۔ فطری زبان وہ ہے، جس سے ہم سماج میں اپنی ترسیل کا کام لیتے ہیں اور مصنوعی زبانیں کمپیوٹر میں استعمال ہوتی ہیں۔ جیسے C, C++ وغیرہ۔ مصنوعی ذہانت کے ذریعے کمپیوٹر کو انسانی دماغ کی طرح کام کرنے کی صلاحیت فراہم کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ کوپائلٹ ہو یا چیٹ جی پی ٹی؛ اگر ہم غالب رمیر کے شعر کی تشریح یا ان کی شاعری کی خصوصیات پر مضمون لکھنے کو کہتے ہیں تو وہ سر دست لکھنا شروع کر دیتے ہیں لیکن اردو میں ابھی آن لائن اتنا مواد دستیاب نہیں ہے، اس لیے مختصر جواب ہی ہمیں ملتا ہے۔ امید یہ ہے کہ جیسے جیسے اردو میں آن لائن مواد بڑھے گا، ویسے ویسے مضمون کا لکھنا اور دیگر سہولیات بھی مزید بہتر ہو جائیں گی۔

■

Dr. Pervez Ahmed
Associate Professor
CIL, SLL&CS
JNU, New Delhi-110067
Email: p123azmi@gmail.com
Cont. no. 9419033383

نارائن پاٹیدار

سرزمین جاؤرہ اور ساحر افغانی

ایک اجمالی جائزہ

مالوہ کی بااختیار ریاست جاؤرہ (گلشن آباد) میں اردو شعر و ادب کا سلسلہ عرصۂ طویل پر محیط ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین بجا طور پر اس خطے کو ایک جزیرۂ اردو کہا ہے وہ اپنے مضمون 'جاؤرہ: ایک جزیرۂ اردو' میں جاؤرہ میں اردو شعر و ادب کی روشن اور تابناک روایات کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''مجموعی طور پر اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج، ثروت مندی اور برومندی میں ریاست جاؤرہ نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان کے پیش نظر اگر اسے مدھیہ پردیش کا 'جزیرۂ اردو' کہا جائے تو درست ہوگا۔ اب بھی اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ بطور مسودہ، مخطوطہ اور قلمی نسخہ پردہ خفا میں ہے جو محتاج تحقیق و اشاعت ہے۔ اگر یہ مایہ ناز ادبی سرمایہ منظر عام پر آ جائے تو اردو ادب کی تاریخ میں گراں قدر اضافہ ہوگا۔''

(بحوالہ سہ ماہی فکر و تحقیق، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اکتوبر تا دسمبر 2023، ص 23)

بانیِ ریاست افتخار الدولہ نواب عبدالغفور خان بہادر دلیر جنگ (دورِ حکومت تقریباً 1808 سے 1825 تک) کے زمانے سے لے کر آزادیِ ہند (1947) تک اس ریاست پر چار نوابین کی حکمرانی رہی ہے۔ نواب عبدالغفور خان کے بعد محتشم الدولہ نواب غوث محمد خان بہادر شوکت جنگ (دورِ حکومت تقریباً 1825 سے 1865 تک) اس کے بعد احتشام الدولہ نواب محمد اسمٰعیل خان بہادر فیروز جنگ (دورِ حکومت تقریباً 1865 سے 1895 تک) اور پھر آخر میں فخر الدولہ نواب محمد افتخار علی خان بہادر صولت جنگ (دورِ حکومت تقریباً 1895 سے 1947 تک) والی جاؤرہ رہے ہیں۔ متذکرہ نوابین کے ادوار حکومت میں اردو شعر و ادب نے ترقی کی مختلف منازل طے کیں اس لیے کہ والیان ریاست خود ادب پرور اور ادب نواز ہونے کے ساتھ ساتھ جوہر قلم سے آراستہ تھے۔

نواب غوث محمد خان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف اردو ادب کی بے لوث خدمت کی بلکہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے الگ الگ فنون کے قابل اور منتخب ماہرین کو جاؤرہ بلایا جس سے یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ اور یوں اس خطّے میں اردو شعر و ادب کی روایت مستحکم ہوتی گئی۔ پروفیسر وسیم الدین اپنے مضمون 'جاؤرہ میں اردو زبان و ادب' میں نواب غوث محمد خان کے متعلق رقم طراز ہیں:

'' نوابین میں غوث محمد خان کا زمانہ (1825 سے 1865 تک) ریاست کا سنہرا زمانہ کہلاتا ہے... یہ نہایت بیدار مغز اور سلجھے ہوئے نواب تھے۔ لکھنؤ، دہلی، بریلی، شاہجہاں پور، کانپور وغیرہ مقامات سے قابل ہستیوں کو چن چن کر بلایا اور ریاست کا کام کاج ان کے سپرد کیا۔ نواب غوث محمد خان خود بھی ایک اچھے ادیب تھے اور ادب نوازی میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان کی ذاتی تصانیف میں سیرا محتشم، سیر گاہ محتشم اور تذکرۂ سلاطین مغلیہ بہت مشہور کتابیں ہیں۔''

(بحوالہ مدھیہ پردیش میں اردو زبان و ادب: پروفیسر آفاق احمد، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال 1996، ص 150)

ماقبل آزادی جاؤرہ میں جن شاعروں اور ادیبوں نے اردو شعر و ادب کی ترقی و ترویج میں نمایاں رول ادا کیا ان میں نوابین کے علاوہ خصوصاً مرزا عظیم بیگ عظیم، پیر جی محمد یوسف خاں یوسف، نظام الدین نظام، عالم گیر محمد خاں عالم، فرحت گلشن آبادی، مشرف یار خاں شرف، حیا گلشن آبادی، ضیا گلشن آبادی، متین الدین خان متین گلشن آبادی، مفتی احمد علی احمد گلشن آبادی، بیدل گلشن آبادی، خواجہ اکبر حسین اکبر گلشن آبادی، خستہ گلشن آبادی، ادیب گلشن آبادی اور محمد شفیع گلشن آبادی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

آزادی کے بعد علاقۂ مالوہ کی اس خودمختار ریاست (جاؤرہ) کا ہندوستان میں انضمام ہو گیا اور پھر اسے مدھیہ پردیش کے ضلع رتلام کی ایک تحصیل بنا دیا گیا۔ یہ جاؤرہ کی خوش نصیبی ہے کہ یہاں نوابین کے ادوار حکومت سے لے کر آج تک مذہب کے نام پر کوئی فساد نہیں ہوا۔ ما قبل آزادی یہاں شعر و سخن کا جو چراغ روشن ہوا تھا آزادی کے بعد کچھ عرصے تک اس کی لو مدھم ہو گئی۔ اس عہد کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر وسیم الدین تحریر فرماتے ہیں:

''1947 کے بعد، ریاستی نظام ختم ہوا جمہوری نظام آیا۔ قدروں کی شکست و ریخت ہوئی... اس دوران ادبی سطح پر مکمل جمود طاری رہا۔ ادبی سرگرمیوں میں تعطل آیا 1960 کے بعد صاحبزادہ سلطان حامد خاں ثروت نے اپنی کوششوں سے جاورہ کی ادبی فضا کو متحرک بنایا طرحی مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوا شاعروں کی بڑی تعداد ابھری۔ ان میں بزرگوں کے ساتھ ساتھ نوجوان شعرا بھی شامل تھے۔ استادی اور شاگردگی کی روایت بھی چلتی رہی اساتذہ میں ناداں، بیدل، خستہ، شفیع، عزیز الرحیم عشرت مشہور تھے۔ ان کے شاگردوں کا سلسلہ طویل ہوتا گیا۔''

(بحوالہ مدھیہ پردیش میں اردو زبان و ادب: پروفیسر آفاق احمد، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال 1996، ص 157)

آزادی کے بعد جاؤرہ میں جن شعرا و ادبا حضرات نے اردو شعر و ادب کی آبیاری میں اپنا خون جگر صرف کیا ان میں متذکرہ بزرگ اساتذہ شعرا کے علاوہ خطیب گلشن آبادی، ادیب گلشن آبادی، معظم خان ساحر افغانی، مرزا غفار بیگ اثر گلشن آبادی، سیف الدین سیف گلشن آبادی، پروفیسر وسیم الدین، سردار سنگھ ساتھی، صابر گلشن آبادی، واقف حیدری اور باحیات بزرگوں میں غیاث الرحیم شکیب، شباب گلشن آبادی اور محمد رفیع گلشن آبادی وغیرہ کے نام قابل ستائش ہیں۔ عارف علی قریشی عارف، یوسف سحر، غلام معین الدین خاں معین، حیات گلشن آبادی، عبدالنوری گلشن آبادی، افضل نوری گلشن آبادی،

عاصی گلشن آبادی، جہانگیر نیازی اور احمد رضا گلشن آبادی وغیرہ موجودہ عہد کے اہم شعرا ہیں۔ اس کے علاوہ شہر جاؤرہ میں نوجوان شعرا کی جونئی نسل پروان چڑھ رہی ہے ان میں شاکر رضا گلشن آبادی، شاد گلشن آبادی، حسان گلشن آبادی، عرفان حسین گلشن آبادی، فیضان گلشن آبادی، سہیل گلشن آبادی، حنیف گلشن آبادی اور فرحان گلشن آبادی وغیرہ کے نام قابل تعریف ہیں۔

الغرض دور جدید میں بھی سرزمین جاؤرہ اردو شعر و ادب کے لحاظ سے سرسبز و شاداب ہے۔ ساحر افغانی کا تعلق اسی زرخیز زمین سے ہے۔ ان کا اصل نام معظم خان اور تخلص ساحر تھا۔ ان کے آبا و اجداد افغانستان اور پاکستان کے درمیانی سرحدی علاقے (سوات گھاٹی) میں سکونت پذیر تھے۔ یہاں آئے دن غدر ہوتا تھا۔ اس افرا تفری سے تنگ آکر وہ مع اہل و عیال ہندوستان آگئے۔ اسی نسبت سے انھوں نے اپنے تخلص کے ساتھ افغانی لفظ کا اضافہ کیا ہے۔ طبابت ان کا خاندانی پیشہ تھا۔ ان کے داداحد ادمحمد خان کرنال (جو فی الحال صوبۂ ہریانہ کا ایک ضلع ہے) کے نواب یاقوت علی خان کے یہاں حکیم تھے اور ان کے والد محترم پیارے میاں ریاست جاؤرہ کے آخری نواب محمد افتخار علی خان کے یہاں حکمت کا کام کرتے تھے۔ ساحر کی ولادت 1936 میں جاؤرہ میں ہوئی۔ پیدائش سے کچھ دن پہلے ہی ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کی والدہ ہی نے ان کی پرورش کی۔ اس وقت ان کے گھر کے معاشی حالات ناگفتہ بہ تھے۔ ابتدائی تعلیم مہاتما گاندھی اسکول جاؤرہ سے حاصل کی۔ جیسے تیسے میٹرک تک تعلیم حاصل کی اس کے بعد ان کا فوج میں سلیکشن ہوگیا مگر ان کی دادی نے انھیں فوج میں جانے نہ دیا۔ گھریلو ذمے داریوں کے تحت انھوں نے مختلف قسم کی دکانوں (جس میں سٹے کی دکان بھی شامل ہے) اور مقامات مثلاً حسین ٹیکری، شوگر میل وغیرہ میں کام کیا۔ اس طرح ان کی زندگانی بہت ہی پریشانیوں میں گزری، غربت نے ان کا خوب امتحان لیا مگر انھوں نے کبھی ہار نہ مانی اور اس یقین کے ساتھ امید کا دامن تھامے رکھا کہ

ظلمت شب کا بے کراں لشکر
ایک جگنو سے ہار جاتا ہے

ساحر افغانی نے مختلف شعری اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کی غزلیں ملک کے علاوہ بیرون ممالک کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتی تھیں۔ وہ محب اردو تھے۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے ان کا ذہن شعر و سخن کی طرف مائل تھا چنانچہ کمسنی میں ہی شعر کہنے لگے اور جلد ہی ایک پختہ شاعر بن گئے۔ انھوں نے ملک کے مختلف علاقوں میں منعقد ہونے والے یادگار کل ہند مشاعروں میں شرکت کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو کے زیر اہتمام ہونے والے کئی مشاعروں میں بھی حصّہ لیا۔ ایک بڑا کامیاب مشاعرہ بمبئی کے نہرو سینٹر میں (مشہور فلمی اداکار دلیپ کمار کی صدارت میں) منعقد ہوا تھا جس میں موصوف نے اردو کے بڑے بڑے اور باکمال شعرا مثلاً کیفی اعظمی، ندا فاضلی، جاوید اختر وغیرہ کی موجودگی میں اپنا کلام سنایا اور اپنے پرکشش و منفرد اشعار کے ذریعے شعرا اور سامعین سے خوب داد و تحسین حاصل کی۔ اس مشاعرے میں انھوں نے ایک نظم بعنوان 'وراثت' پڑھی تھی۔

ساحر افغانی نے ملک کے مختلف علاقوں میں منعقدھونے والے یادگار کل ھند مشاعروں میں شرکت کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو کے زیر اہتمام ھونے والے کئی مشاعروں میں بھی حصّہ لیا، ایک بڑا کامیاب مشاعرہ بمبئی کے نھرو سینٹر میں (مشھور فلمی اداکار دلیپ کمار کی صدارت میں) منعقدھو ا تھا جس میں موصوف نے اردو کے بڑے بڑے اور با کمال شعرا مثلًا کیفی اعظمی، ندا فاضلی، جاوید اختر وغیرہ کی موجودگی میں اپنا کلام سنایا اور اپنے پر کشش و منفرد اشعار کے ذریعے شعرا اور سامعین سے خوب داد وتحسین حاصل کی۔ اس مشاعرے میں انھوں نے ایک نظم بعنوان 'وراثت' پڑھی تھی۔

ساحر صاحب ڈاکٹر اختر نظمی (جو ایک مدت تک کملا راجہ گرلز کالج گوالیار میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز رہے) کو اپنا استاذ مانتے تھے اور مشہور شاعر ساحر لدھیانوی کے کلام کو پسند کرتے تھے۔ ساحر لدھیانوی سے متاثر ہوکر ہی انھوں نے اپنا تخلص ساحر اختیار کیا۔ بمبئی ریڈیو اسٹیشن کے ایڈیٹر ہارون الرشید صاحب اور بہترین نغمہ نگار نوشاد صاحب ان کے خاص دوستوں میں شامل تھے۔ عارف علی قریشی عارف گلشن آبادی، فضل حیات گلشن آبادی، یوسف سحر گلشن آبادی، صبر گلشن آبادی اور احمد رضا گلشن آبادی وغیرہ ان کے عزیز شاگرد ہیں۔ ساحر افغانی بہت ہی خوددار انسان تھے۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا انھیں گوارا نہ تھا۔ وہ تا عمر معاشی بدحالی سے لڑتے رہے۔ جب زندگی کے آخری ایاّم میں شدید بیمار پڑے تو کہنے لگے

سلگتی بھوک سسکتی ہوئی یہ بیماری
نہ تاب ضبط ہے مجھ میں نہ حوصلہ باقی
ہیں چند سکّے بشکلِ عذاب ہاتھوں میں
شدید جنگ ہے اس وقت دو تقاضوں میں
دوا خریدیں کہ بچوں کے واسطے روٹی

گلشن آبادکی شعری دنیا کا یہ درخشاں ستارہ 21 مئی 2016 کو غروب ضرور ہوگیا مگر ان کے اشعار اب بھی اہل جاؤرہ کو ازبر ہیں، جو ان کی شعری عظمت کی دلیل ہے۔ ان کے ہم عصر شعرا ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کی وفات پر ان کے عزیز دوست استاذ غیاث الرحیم شکیب نے اظہار غم کے ساتھ بطور خراج عقیدت غالب کا یہ شعر پڑھا تھا۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

ساحر افغانی ایک حساس ذہن کے مالک اور زود گو شاعر تھے۔ بجا طور پر ان کا شمار جاؤرہ کے استاد شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں عمدہ اور گراں قدر فن پاروں کے بے شمار نمونے موجود ہیں۔ غزل گوئی ان کا خاص اور پسندیدہ میدان رہا ہے۔ ان کے کلام میں غزلوں کی تعداد زیادہ ہے، جو صنف غزل سے ان کی گہری دلچسپی کا مظہر ہے۔ غزل کے متعلق ان کا یہ خیال واقعی حق بجانب ہے۔

غزل کے نام پر میں ذہنی عیاشی نہیں کرتا
میرے اشعار سن کر مسکرانا بھول سکتے ہو

ساحر افغانی نہایت ہی بے باک انسان تھے۔ ان کی غزلوں کا مطالعہ کرتے وقت جو خوبی ہمارے ذہن کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ہے ان کی جسارت اور دیانت داری۔ وہ جس جرأت کے ساتھ سوچتے تھے اتنی ہی سچائی سے اس کا اظہار کرتے تھے۔ سیاسی پیچیدگیوں کے متعلق ان کا رویہ بہت ہی بے باکانہ تھا۔

موصوف نے اس عجیب و غریب دنیا کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور اس کی نیرنگیوں سے واقف ہوئے۔ انھوں نے انسانی زندگی سے متعلق مختلف اسرار و رموز کو اپنے منفرد انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

کاندھے پہ اس کا بوجھ اٹھانے کے بعد بھی
دیوار عمر بھر رہی چھت کے دباؤ میں

رشتے بھی گھر کے ساتھ ہی تقسیم ہو گئے
آنگن میں کیسے بیٹھ کے اب گفتگو کریں

تنہاں ہوا تو جھیل کا پانی سسک اٹھا
پنچھی تو اپنی پیاس بجھا کر چلے گئے

برگد کا بوڑھا پیڑ انھیں دیکھتا رہا
خانہ بدوش ڈیرا اٹھا کر چلے گئے

جھلس رہے ہیں حوادث کی آگ میں انساں
امیر شہر کے چہرے پہ تازگی کیوں ہے

کوئی حل نہیں یارو ذہن میں دماغوں میں
زندگی بھٹکتی ہے آج تک سوالوں میں

محنت پیہم زندگی کی علامت ہے۔ محنت ومشقت کے بغیر کامیابی کا تصور ممکن نہیں۔ ساحر اس خیال کے فرماں بردار تھے۔ اپنے مخصوص انداز میں تحریر فرماتے ہیں۔

پی کے محنت کا لہو اگتی ہیں فصل بے مثال
ورنہ کھیتوں میں تو مٹی کے سوا کچھ بھی نہیں

ساحر نے غم زندگی کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

سوچتا ہوں کہ زمانے سے مٹا دوں تجھ کو
زندگی اتنا پریشان کیا ہے تو نے

زندگی کے دامن پر کتنے زخم لگتے ہیں
شام کے اندھیروں میں صبح کے اجالوں میں

اس فانی دنیا میں ہماری حیات دوروزہ کب ختم ہو جائے کوئی نہیں جانتا اور یہی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ آج انسانی دنیا نے ترقی کی بے شمار منزلیں ضرور طے کر لی ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ ایسے ایسے مہلک ہتھیار ایجاد ہو چکے ہیں جو چند لمحوں میں پوری دنیا کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فاضل شاعر فرماتے ہیں۔

حیران کرنے والی ترقی کے باوجود
دنیا ملی تباہی کے نزدیک تر مجھے

ساحر کا یہ شعر حال اور مستقبل دونوں کی غمازی کرتا ہے۔ ان کی رحلت کے بعد کووڈ 19 کی وجہ سے تباہی کے جو منظر دیکھے گئے وہ موجودہ نسل کبھی نہیں بھول سکتی۔

ساحر افغانی نے چھوٹی چھوٹی بحروں میں بہت ہی موثر غزلیں لکھی ہیں۔ جاؤرہ میں ان کی غزلیں آج بھی لوگ گنگناتے ہیں۔

تم ہمیشہ یہ سلسلہ رکھنا
ملنے جلنے کا راستہ رکھنا

تجربہ قربتوں کا کہتا ہے
درمیاں تھوڑا فاصلہ رکھنا

یہ بھی آداب ہیں محبت کے
دشمنوں سے بھی رابطہ رکھنا

موت رقصاں ہے ہر طرف لیکن
زندہ رہنے کا حوصلہ رکھنا

عادتاً لوگ مشورہ دیں گے
معتبر اپنا فیصلہ رکھنا

خط مٹاتے ہیں غم جدائی کے
آپ جاری یہ سلسلہ رکھنا

عافیت چاہتے ہو گر ساحر
یاد ہر ایک حادثہ رکھنا

ساحر افغانی نے عمدہ نظمیں بھی تحریر کی ہیں۔ ان میں واپسی، وراثت، زندگی اور پاگل وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ آزاد نظم 'پاگل' میں انھوں نے شرافت کی آڑ میں ہو رہی زیادتیوں کو اجاگر کیا ہے اور ایک پاگل کے ذریعے عوام کے مختلف مسائل پر سوالات کیے ہیں۔ وہ ایسے سماج کے خواہاں تھے جہاں خون کی ندیاں نہیں بلکہ امن وشانتی کا ماحول ہو۔ نظم ملاحظہ ہو۔

آزادی کے بعد جاؤرہ (گلشن آباد) میں جن شاعروں نے بے غرض و غایت اردو شعر وسخن کی خدمت کی ان میں ساحر افغانی کو ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ نئے تقاضوں کا احساس جابجا نظر آتا ہے۔

کاش تم نہیں ہوتے
کاش میں نہیں ہوتا
یہ زمیں نہیں ہوتی آسماں نہیں ہوتا
چاند اور سورج سے
بیکراں خلا میں بھی روشنی نہیں ہوتی
کیا کہا میں پاگل ہوں
میں یہ مان لیتا ہوں
باوجود اس کے اک سوال ہے مرا؟
جانے کتنی صدیوں سے
رزم گاہِ عالم میں
ہم سبھی کے ہاتھوں میں
چمچماتی تلواریں
مختلف طریقوں سے مختلف مسائل پر
روز ایک دوجے کو
قتل کرتی رہتی ہیں
یعنی رسم چنگیزی
یعنی جبر فرعونی
چہار دانگ عالم میں ختم ہو نہیں سکتا
پھر بھی آپ کہتے ہیں
میں تو ایک پاگل ہوں
باوجود اس کے میں بار بار کہتا ہوں
کاش تم نہیں ہوتے
کاش میں نہیں ہوتا
یہ زمیں نہیں ہوتی، آسماں نہیں ہوتا
صرف ایک سناٹا
اور کچھ نہیں ہوتا

اس کے علاوہ ساحر افغانی نے قطعات بھی لکھے ہیں۔ غزل سے علیحدہ ہوئی یہ صنف غزل کی طرح ہر بحر میں لکھی جاتی ہے۔ ساحر کا ایک قطعہ پیش خدمت ہے۔

محدود روشنی ہے ذہن سوچتا نہیں
تاریکیوں کی سمت کوئی دیکھتا نہیں
قبروں پہ لوگ آج بھی بنواتے ہیں محل
انمول زندگی کو کوئی پوچھتا نہیں

مختصراً یہ کہ آزادی کے بعد جاؤرہ (گلشن آباد) میں جن شاعروں نے بے غرض وغایت اردو شعر وسخن کی خدمت کی ان میں ساحر افغانی کو ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ نئے تقاضوں کا احساس جابجا نظر آتا ہے۔ ان کے شعری محاسن کے متعلق پروفیسر وسیم الدین بجا فرماتے ہیں:

" ساحر افغانی جدید لہجہ کے شاعر ہیں ان کی شاعری میں عصری مسائل کی بھرپور عکاسی ملتی ہے ان کی تلاش وجستجو بھی متاثر کرتی ہے۔"

(بحوالہ مدھیہ پردیش میں اردو زبان و ادب: پروفیسر آفاق احمد، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال 1996، ص159)

ساحر افغانی کا کلام فکر وفن ہر دو لحاظ سے پختہ اور زوردار ہے۔ ان کی شاعری فن شعرگوئی اور طرز تحریر کی نزاکتوں سے آراستہ وپیراستہ ہے۔ انھوں نے اپنے گہرے تجربات، مشاہدات اور احساسات کی مدد سے نہایت ہی خوش فکر اشعار تحریر کیے ہیں۔ بلاشبہ ان کا کلام اردو شعر و ادب کا بیش قیمتی سرمایہ ہے۔ مگر افسوس اب تک ان کا یہ کلام شائع نہ ہو سکا۔

■

Dr. Narayan Patidar
Bhagat Singh Govt. PG College
Jaora, Distt.: Ratlam- 457226 (MP)
Cell.:8305365238
narayanpatidar.ujn1984@gmail.com

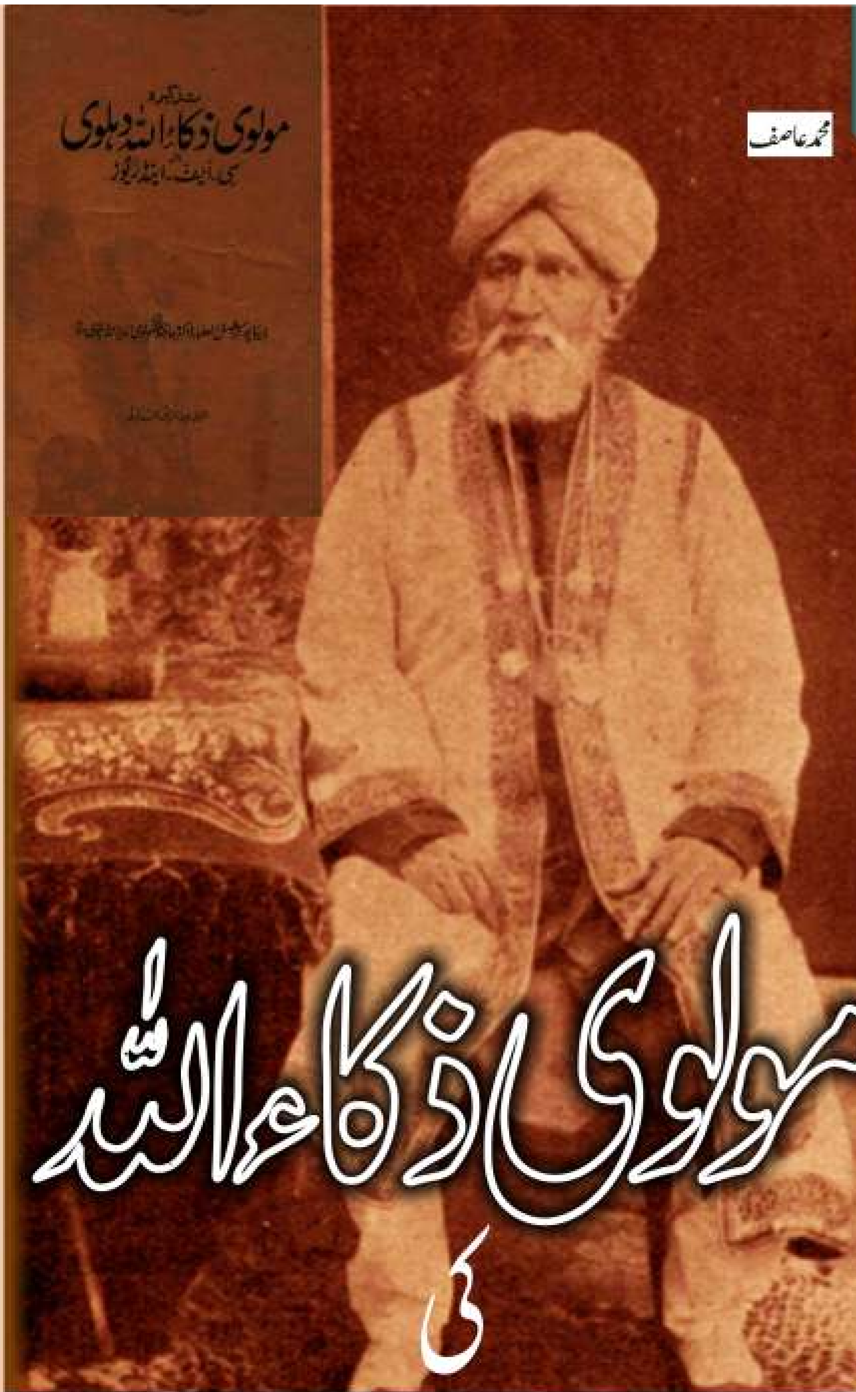

مولوی ذکاءاللہ کی ادبی خدمات

محمد عاصف

انیسویں صدی کا نصف آخر جسے اردو ادب کی تاریخ میں دور جدید کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔اس دور میں اردو ادب نے بڑی سرعت کے ساتھ ترقی کی۔اس دور میں ایسے نامور اور بلند پایہ ادیب پیدا ہوئے جو ماہرفن اور بالغ نظر تھے۔ان ادیبوں نے اردو نثر کے قدیم انداز بیان جو'فسانہ عجائب' اور دیگر تصانیف میں ملتا تھا جس میں مقفی، مسجع اور مرصع انداز بیان کی فراوانی تھی۔انھوں نے اس قدیم اور پر تکلف انداز بیان کو ترک کیا اور اردو نثر میں پہلی بار سلاست و روانی اور سادگی کو جگہ دی،جس کے سبب اس میں ہر قسم کے خیالات کو سادگی، بے تکلفی اور وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کی گنجائش پیدا ہو گئی۔ان نثر نگاروں کی مسلسل کاوشوں سے اردو نثر میں ایک حیرت انگیز انقلاب رونما ہوا۔انھوں نے وقت کے اہم تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی تحریروں سے اردو ادب کے دامن میں وسعت پیدا کی اور اردو ادب کو ایک نئی روش سے روشناس کرایا۔انہی نثر نگاروں میں ایک اہم نام مولوی ذکاءاللہ کا بھی آتا ہے، جو ایک مورخ، مترجم، مضمون نگار، سوانح نگار، انشائیہ نگار، تبصرہ نگار اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ان کی کتابیں اپنے دور میں بہت مقبول و مشہور تھیں۔ یہ کتابیں اسکولوں کے نصاب میں بھی شامل تھیں۔

ذکاءاللہ ایک باشعور اور عصری آگہی سے بہرہ ور، بیدار مغز شخصیت کے حامل تھے۔ان کے آبا و اجداد غزنی سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔اس خاندان کے افراد کا شمار اپنے وقت کے عالم و فاضل میں ہوتا تھا۔

مولوی ذکاءاللہ 20اپریل 1832 میں دہلی کے کوچہ بلاقی بیگم میں پیدا ہوئے۔یہ وہ محلّہ تھا جہاں بڑے بڑے عالم و فاضل پیدا ہوئے۔مولانا شاہ ولی اللہ،شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بھی اسی محلے کے تھے۔سرسید بھی اسی محلے کے ایک گھر میں پیدا ہوئے تھے۔

ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد ان کا داخلہ دلی کالج میں ہوا۔جہاں انھوں نے اپنی اعلیٰ ذہنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا اور جلد ہی ان کا شمار ماسٹر رام چندر اور شیخ امام بخش صہبائی کے خاص شاگردوں میں ہونے لگا۔دلی کالج میں تعلیم مکمل کر کے وہ اسی کالج میں ریاضی کے معلم ہوئے۔پھر اس کے بعد آگرہ، مدراس، بلند شہر اور مراد آباد وغیرہ جگہوں پر درس و تدریس کے مختلف عہدوں پر فائز ہوئے۔آخر میں وہ میور سینٹرل کالج الہ آباد میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ 1887 میں اس کالج سے سبکدوش ہوئے۔ انیس سال کی عمر سے لے کر آخری ایام تک اپنی تمام عمر تصنیف و تالیف میں گزار دی۔

ذکاءاللہ ایک اچھے تبصرہ نگار تھے۔انھوں نے کثیر تعداد میں ان کتابوں پر تبصرہ کیا ہے جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئے تھے۔انھیں شاعری سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے تبصرے میں ایک سائنٹفک نقاد کی طرح شاعری کے ہر نقطے پر نظر ڈالتے ہیں۔اس سلسلے میں ان کا تبصرہ'مسدس مد و جزر اسلام' کو لیا جا سکتا ہے، جس میں وہ ایک سائنٹفک نقاد کے طور پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

ذکاءاللہ کے مطابق شاعری کیا ہے اس کی وضاحت اپنے تبصرہ'مسدس مد و جزر اسلام' میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''شاعر کا فقط یہی کام نہیں کہ وہ اپنے اشعار میں کسی چیز کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھڑا کر دے بلکہ اصل کام اس کا یہ ہے کہ اس تصویر کو دکھا کر دل و دماغ میں اس کی تصویر کو جگا دے اور ایک استعجاب اور بوالعجبی

پیدا کر دے اور اس کے تمام اسرار کھول دے اور تعلق کو انسان کے ساتھ بتلا دے۔اسی کو شاعر کا معجزہ یا سحر حلال کہتے ہیں اور اسی کا نام شاعری ہے۔''[1]

اردو انشائیہ نگاری میں ذکاء اللہ نے اپنے دلکش اور شگفتہ انداز بیان کی وجہ سے اپنی ایک الگ شناخت بنائی ہے۔ان کی تحریروں سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ انگریزی کے نامور مضمون نگار بیکن سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔انھوں نے اپنے انشائیہ میں معلومات کا دفتر بھر دیا ہے۔خوبصورت تشبیہات اور خیالی استعارات سے اپنے انشائیہ کو دلکش اور جاندار بنایا ہے۔اس سلسلے میں ان کا انشائیہ 'آگ' کی یہ عبارت دیکھیے جس میں آگ کی مختلف کیفیات کو کتنے نرالے ڈھنگ سے بیان کیا گیا ہے۔آگ کی اہمیت و افادیت کا ذکر کرتے ہوئے مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

''آگ ہی ہماری دشمن جاں سوز بھی ہے اور دوست دل افروز بھی، وہ گھر گھر مبارک مہمان ہے، مہربان دوست ایسی کہ ہماری راحت کے لیے ہمارے رنج وتکلیف کو دور کرنے کے لیے آسائش و آرام کے واسطہ صد ہا ضرورت زندگی کے رفع کرنے کے واسطے وہ سامان مہیا کرتی ہے۔ ہمارے چولہے پر ماما گری کرتی ہے۔اپلے کنڈے جلا کر روٹی اور کھانا پکاتی ہے۔آگ ہی نے انسان کو پکانا سکھایا ہے۔جس کے سبب سے وہ اور حیوانوں سے ممتاز ہو گیا ہے، جیسا کہ انسان حیوان ناطق کہلاتا ہے۔''[2]

ذکاء اللہ ریاضی داں بھی تھے۔ ان کی ریاضی کی صرف وہی کتابیں مشہور نہیں ہوئیں جو درس وتدریس کے نصاب میں شامل تھیں بلکہ ان کی غیر درسی کتابوں کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ان کا پسندیدہ موضوع ریاضی تھا۔اسی لیے اس موضوع پر انھوں نے کثیر تعداد میں کتابیں لکھی ہیں۔ ان کتابوں کا کمال یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے طالب علم میں رٹنے والی شکایت ختم ہو جائے گی۔انھوں نے نہ صرف ریاضی کی کتابیں تصنیف کی ہیں بلکہ انگریزی میں لکھی ریاضی کی معتبر کتابوں کو اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ ان کتابوں کی خوب تعریف ہوئی ہے۔

لارڈ نارتھ بروک نے ان کی اس محنت کی بہت تعریف کی ہے۔وہ کہتے ہیں:

''ریاضی کی کتابوں کے جس سلسلہ کو منشی ذکاء اللہ نے شائع کیا ہے اور جس کی شمال مغربی صوبہ کے ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم نے بے حد تعریف و توصیف کی ہے اس کی نسبت یقین کیا جاتا ہے کہ وہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کی درخواست پر اور اس کی مدد سے شروع کیا گیا ہے۔منشی ذکاء اللہ بدیہی طور پر یہ کام نہایت اچھے طریقے سے انجام دیا ہے۔اور توقع کی جاتی ہے کہ مزید اعتراف اور مدد سے وہ اسی کام کو جاری رکھ سکیں گے اور سائنس کی دوسری شاخوں کی جانب اپنی توجہ مبذول کر سکیں گے۔''[3]

وہ بلا کے لکھنے والے تھے۔انھوں نے مختلف موضوعات پر قلم کاری کر

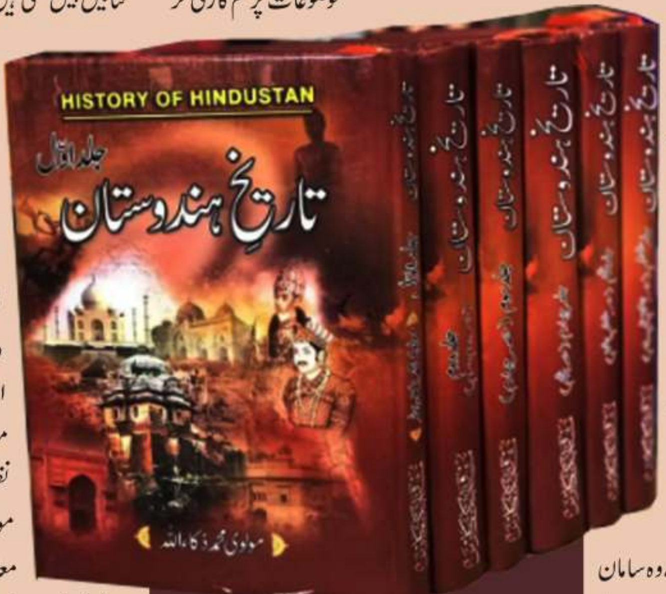

اردو انشائیہ نگاری میں ذکاء اللہ نے اپنے دلکش اور شگفتہ انداز بیان کی وجہ سے اپنی ایک الگ شناخت بنائی ہے،ان کی تحریروں سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ انگریزی کے نامور مضمون نگار بیکن سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔

کے اردو کے نثری سرمائے میں مزید اضافہ کیا ہے۔جدید تحقیق کے مطابق ذکاء اللہ نے 157 کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔بقول عبدالحق خود ایک چھوٹا سا کتب خانہ بن سکتی ہے۔ہر قسم کے موضوعات پر قلم اٹھانے کے سبب ہی خواجہ الطاف حسین حالی نے ان کے متعلق کہا تھا کہ:

''ذکاء اللہ کا دماغ بنیے کی دوکان ہے۔جس کو جس چیز کی ضرورت پیش آئی وہاں سے مل گئی۔''

ان کی کثیر تصانیف کے سلسلے میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اگر ان کی ساری تصانیف کا وزن کیا جائے تو جملہ تصانیف کا وزن ذکاء اللہ پر بھاری پڑے گا۔

انھوں نے اپنی تصانیف کے ذریعے اردو ادب کے نثری ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔اس کے علاوہ بے شمار مضامین اخبار و رسائل میں بھی لکھے ہیں۔ ان کے ہم عصروں میں کسی نے بھی اتنی کثیر تعداد میں کتابیں نہیں لکھی ہیں جتنی ذکاء اللہ نے لکھی ہیں، لیکن ان سب کے باوجود انھیں وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جو ان کے ہم عصر ادیبوں کو ہوئی تھی۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کتابوں کی طوالت۔معمولی کاغذ اور ظاہری حسن میں دلکش نہ ہونے کے باعث لوگ اس سے مستفیض نہ ہو سکے۔یہی وجہ ہے آج ان کی کتابوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔بس ان کے بعض مضامین کہیں کہیں درسی کتابوں میں نظر آجاتے ہیں۔

مولوی ذکاء اللہ علی گڑھ تحریک کے معاون و مددگار تھے۔انھیں 'مدرسۃ العلوم' سے جذباتی لگاؤ تھا۔اس کالج سے بے پناہ جذبۂ عقیدت و محبت کا اندازہ ذکاء اللہ کے اس انمول جملے سے لگایا جاسکتا ہے:

''میری ساری زندگی کی امیدیں اس کالج سے وابستہ ہیں، اگر اسے کوئی نقصان پہنچا تو میری زندگی کا کام تباہ اور برباد ہو جائے گا۔''[4]

یہی محبت ہے جو ذکاء اللہ کو بار بار علی گڑھ لاتی رہی ہے۔جب بھی وہ میور کالج الہ آباد میں پڑھانے کے لیے دلی سے آتے تو پہلے وہ علی گڑھ جا کر رات بھر سرسید کے یہاں قیام کرتے پھر صبح علی گڑھ سے الہ آباد کے لیے روانہ ہوتے تھے۔اسی رغبت کی بنا پر انھوں نے اپنے بیٹے مولوی عنایت اللہ کو علی گڑھ میں ہی تعلیم دلائی تھی۔

ذکاء اللہ شروع ہی سے مدرسۃ العلوم کی ترقی کے خواہاں تھے۔اس کی قیام کے لیے انھوں نے سرسید کو مزید امداد دی۔وہ ہمہ وقت اس کالج کی خدمت میں پیش پیش رہے۔کالج کے سبھی معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

1866 میں ذکاء اللہ نے سائنٹفک سوسائٹی کی رکنیت اختیار کی تب انھوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ اردو زبان کو درس وتدریس کا ذریعہ بنایا جائے اور اس کے دامن کو مغربی

علوم کے جواہرات سے مالا مال کیا جائے۔ جبکہ ایسے وقت میں ہر شخص ان کے خلاف تھا۔ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی کہ اعلیٰ مغربی تعلیم ملکی زبانوں کے ذریعے دی جا سکتی ہے۔ اپنے اس نقطۂ خیال کو ثابت کرنے کے لیے وہ برابر لڑائی لڑتے رہے، جس میں ان کی ہار یقینی تھی تب بھی وہ ہار نہیں مان رہے تھے بلکہ ہمت و بہادری کے ساتھ اردو ذریعہ تعلیم کے لیے برابر لڑتے رہے۔

ذکاء اللہ سچے وطن پرست تھے انھیں اپنے ملک ہندوستان سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ اپنی تاریخ میں ملک کے شاندار ماضی کا حال بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنے ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ملک کی سربلندی کے خواہاں تھے۔ انھیں اپنے ملک سے والہانہ محبت تھی۔ وہ اپنے ملک کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ ان کا اپنے وطن سے محبت کے جذبے کا اندازہ اس عبارت سے لگایا جا سکتا ہے:

''ہندوستان ہماری مادرِ وطن ہے۔ ملک جس نے ہمیں جنم دیا۔ ہم نے یہاں اپنے گھر بنائے، یہاں شادی بیاہ کیے، بچے پیدا کیے، یہیں اس سرزمین، جس کی خاک میں ہمارے پرکھوں کی خاک ملی ہوئی ہے۔ ایک ہزار سال سے خود ہمارا مذہب اسلام ہندوستان سے بڑے مستحکم اور قریبی بندھنوں سے بندھا ہوا ہے اپنے مخصوص تمدن کی بعض عظیم ترین کامیابیاں اسلام نے یہیں ہندوستان ہی میں حاصل کی ہیں۔ اسی لیے ہمیں ہندوستان کی تاریخ اور یہاں کی حکومت سے محبت کرنا چاہیے۔''[5]

انھوں نے سائنس اور جدید علوم پر نہایت پر اثر، مفید اور معلوماتی مضامین لکھ کر اردو مضمون نگاری کی سمت میں کشادگی پیدا کی۔ ان کی کتابوں نے اردو زبان کو سادہ، آسان اور عام فہم اسلوب عطا کیا۔ آج ان کی کتابوں کو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہے۔ ان کتابوں کی اب کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے جبکہ ان کی بعض شاہکار تصنیف جیسے کہ ملکہ وکٹوریہ، کرزن نامہ، تاریخ ہند جیسی کتابوں سے لوگوں کی دلچسپی برقرار رہی لیکن اس کی طوالت کی بنا پر ان کتابوں سے استفادہ نہیں کر سکے۔ اس بات کا ذکاء اللہ کو بہت افسوس تھا بقول ذکاء اللہ:

''مسرت سے فرماتے تھے کہ جن علوم وفنون کی کتابوں کا میں نے ترجمہ کیا وہ اب الماریوں میں بند پڑی رہے گی۔''[6]

ادبی حیثیت سے ذکاء اللہ کا کارنامہ بے مثال ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے کارناموں کا چاہے اعتراف نہ کیا جائے، چاہے ان کو پوری طرح بھلا دیا جائے تب بھی ان کا نام اردو زبان و ادب میں ہمیشہ زندہ جاوید رہے گا۔ جب بھی دلی کالج کے طلبہ اور استاد کا نام لیا جائے گا تو اس میں مولوی ذکاء اللہ کا نام بھی آئے گا۔ جو اس کالج کے طالب علم بھی تھے اور استاد بھی۔

ذکاء اللہ کی کثیر تعداد میں کتابیں ان کی خداداد صلاحیت اور ان کے کمالات کا ذکر مولوی بشیر الدین صاحب اپنے مضمون ڈپٹی نذیر احمد واقعات دار الحکومت جلد دوم میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''میں تاریخ اور ریاضی میں علی الخصوص مسلمانوں میں آپ کا جواب نہ تھا۔ آپ کی تصانیف ایک نہیں دو نہیں سیکڑوں ہیں۔ جتنی ضخیم کتابیں آپ نے تصنیف کیں اور ترجمہ کیں، کسی نے نہیں کیں۔۔۔ بالکل عالمانہ فلسفیانہ رنگ تھا۔ گو شمس العلماء تھے مگر کہلائے ہمیشہ منشی اور یہ لفظ تھا بھی بہت موزوں، اتنا بڑا منشی ہی لکھاڑ دیکھنے میں نہیں آتا۔ خدا جانے قلم تھا یا مشین دماغ تھا۔ یہ معلومات کا لا

ذکاء اللہ سچے وطن پرست تھے انھیں اپنے ملک ہندوستان سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ اپنی تاریخ میں ملک کے شاندار ماضی کا حال بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنے ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ملک کی سربلندی کے خواہاں تھے۔

محدود وغیر متناہی ذخیرہ۔ ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے اور شاید پیدا ہوتے ہوں مگر فی زمانہ مسلمانوں میں تو ہوتے نہیں اور سارا ہندوستان چھان مارو ایک بھی ان جیسا نہیں ملے گا۔''

آنے والے وقت کے تقاضوں کی اہمیت کا اندازہ وہ پہلے ہی لگا چکے تھے۔ اس لیے انھوں نے نئی سائنسی معلومات اور مغربی علوم کی ضروریات کے پیش نظر کتابیں لکھیں۔ ان کا نظریہ ادب افادی اور اخلاقی تھا۔ وہ ادب کے ذریعے قوم کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ رسکن (Ruskin) کی طرح انھیں بھی ادب اور اخلاقیات میں ایک اٹوٹ رشتہ نظر آتا تھا۔ ان کے مضامین کے مجموعے تہذیب الاخلاق آریہ ہند، مکارم الاخلاق اور 'محاسن الاخلاق' اس حقیقت کے مظہر ہیں۔ ان مجموعوں کے ناموں سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ ادب اور اخلاقیات کے باہمی ربط کے قائل تھے۔ ان کے مطابق مضمون نگاری کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے پیچھے کوئی سنجیدہ مقصد ہو۔ اسی مقصد کے تحت ان کے بیشتر مضامین اخلاقیات پر لکھے گئے ہیں۔ انھوں نے صنف مضمون میں تمثیل نگاری کی اہمیت کا احساس دلایا۔

ذکاء اللہ کا عہد اردو ادب کے لیے اصلاح کا دور تھا۔ انھوں نے پہلی بار صنف مضمون نگاری پر تنقیدی نظر ڈالی تھی اور 'ایسے' کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ان کے مطابق مضمون نگاری کا مقصد مقفّیٰ و مسجّع جملوں یا الفاظ وتراکیب کی شعبدہ بازی نہیں بلکہ سادہ نثر کو ترجیح دینا ضروری ہے۔ اردو نثر کی اس ادبی ہیئت کی ترقی میں ذکاء اللہ کی نثری خدمات ناقابل فراموش ہے۔

یہ ذکاء اللہ کا ہی کارنامہ تھا کہ انھوں نے یورپ اور ہندوستان کے درمیان ایک پل باندھنے کا کام کیا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مشرق کو ترک کیے بغیر مغرب کو کیسے اپنایا جا سکتا ہے۔ مغربی علوم کو حاصل کرنا اس وقت کا اہم تقاضا تھا لہٰذا انھوں نے مغربی علوم کی اہمیت وافادیت کا احساس اپنے ہم وطنوں کو دلایا۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ بغیر مغربی تعلیم کے قوم کے نونہالوں کی ترقی نہیں ہو سکتی۔ اسی خیال کو ضروری سمجھتے ہوئے انھوں نے سائنسی اور معلوماتی کتب لکھی ہیں۔

وہ اردو ذریعہ تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ ذکاء اللہ نے طلبہ کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے مغربی علوم کی کتابوں کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ تاکہ قوم کے نونہال اس سے فیض یاب ہو سکیں۔ وہ مادری زبان اردو کو درس وتدریس کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اردو میں کتابیں لکھ کر لوگوں کو مادری زبان کی اہمیت کا احساس دلایا۔

حواشی

1 تبصرہ یعنی ریویو مسدس مدوجزر اسلام، مولوی ذکاء اللہ، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ 1296ھ، 1880، ص 160 تا 168

2 فکر نو، مولوی ذکاء اللہ نمبر، مجلّہ ذاکر حسین کالج نئی دہلی، (مدیرہ) ڈاکٹر ممتاز فاخرہ مجیب، 2010، 2011، ص 200

3 سی ایف اینڈریوز، تذکرہ ذکاء اللہ دہلوی، (مترجم)، ضیا الدین احمد برنی، مشہور پریس کراچی 1952، ص 35-134

4 مضمون، سرسید کا نسائی جہت: اصغر عباس، مرتب قیصر جہاں، ص 103

5 مشیر الحسن، دہلی کے مسلمان دانشور (مترجم) مسعود الحق، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی 2006، ص 259

Mohammad Asif
Research Scholar, Urdu Dept
Allahabad University
Allahabad- 211002 (UP)
Cell.: 7800496829
asifmoha2018@gmail.com

عابد سہیل کی تنقید نگاری

محمد فہام الدین

صحت مند ادب کے لیے تنقید ضروری ہے۔ ادب اور تنقید کا رشتہ اٹوٹ سمجھا جاتا ہے۔ نقاد کا مطالعہ اور مشاہدہ گہرا ہونا چاہیے تاکہ وہ جس فن پارے پر تنقید کر رہا ہو اس کے بنیادی تقاضوں اور اس کی باریکیوں سے اپنے قاری کو اچھی طرح واقف کرا سکے۔ اس کا رویہ مخلصانہ اور غیر جانبدارانہ ہونا چاہیے۔ اس لحاظ سے عابد سہیل ایک اہم تنقید نگار ہیں۔ تنقید نگاری میں ان کا نام ہمیشہ ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا رہے گا۔ انھوں نے زیادہ تر اردو فکشن پر لکھا ہے۔ فکشن میں بھی اردو افسانے کو زیادہ ترجیح دی ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں لیکن ان کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ 'فکشن کی تنقید چند مباحث' 2000 میں شائع ہوا۔ اس میں سات مضامین اور سات اردو اہم افسانوں کے تجزیے ہیں جو اس طرح ہیں:

افسانہ کی تنقید۔ چند مباحث 1، افسانہ کی تنقید۔ چند مباحث 2، افسانہ کی تنقید۔ چند مباحث 3، تہذیب ثقافت اور افسانہ، ویرانے: ایک مطالعہ، اردو افسانہ، مسائل اور رجحانات، جدید ناول کا فن۔ ایک مطالعہ

افسانوں کے تجزیے:

پیتل کا گھنٹہ، افق اور عمود، تین مائیں۔ ایک بچہ، نیا قانون، مراسلہ، کھیل کا تماشائی، ٹیبل لینڈ

یہ مضامین اور تجزیے بقول مصنف 1968 اور 1998 کے درمیان لکھے گئے تھے جسے برائے نام نظر ثانی کر کے کتابی شکل میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ اس کتاب میں انتہائی مبسوط پیش لفظ بھی ہے جس سے اردو فکشن خاص طور سے اردو افسانے پر عابد سہیل کے خیالات و نظریات کا پتہ چلتا ہے۔ اردو فکشن کی تنقید پر بعد میں توجہ دی گئی۔ پروفیسر وقار عظیم اور ممتاز شیریں نے پہلے اس طرف توجہ دی اس کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، قمر رئیس اور وہاب اشرفی نے اس سلسلے کو مضبوط و مستحکم کیا۔ عابد سہیل اردو افسانے کی تنقید میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر تخلیق کار تھے۔ جب کوئی تخلیق کار تنقید کرتا ہے تو وہ ایک اچھے نقاد کے فرائض انجام دیتا ہے کیونکہ وہ تخلیقی کرب اور اس کی باریکیوں سے خود بھی گزر چکا ہوتا ہے۔ عابد سہیل ایک اچھے افسانہ نگار ہونے کے ساتھ اپنے مقبول رسالے ماہنامہ 'کتاب' کی ادارت بھی سنبھالتے تھے۔ اس دوران انھیں متعدد افسانوں میں سے معیاری افسانے کے انتخاب کے عمل سے گزرنا پڑتا تھا جس کی وجہ سے بھی ان کا ناقدانہ شعور بیدار رہا۔

'فکشن کی تنقید اور مباحث' اپنے طرز کی ایک منفرد کتاب ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ کے الفاظ میں'

''بنیادی طور پر وہ ایک تخلیق کار تھے اور تخلیق کار کی تنقید جس طرح تازہ کار اور غیر رسمی ہونی چاہیے، یہ مجموعہ ایسی تنقید کی مثال ہے۔ تنقید کو انھوں نے اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ مطالعے کا شوق، نئی نسل کے ادیبوں کی تحریروں کو خصوصی دلچسپی سے پڑھتے اور اپنی رائے بھی دیتے۔ ان کی رایوں میں ان کے مطالعے کی جھلک نظر آتی ہے۔ یادداشت اچھی پائی تھی اس لیے وقت ضرورت حوالے کا پیوند بھی لگا دیتے۔ کبھی مرعوب کرنے یا اپنی رائے کو بضد منڈھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہر بات عجز و انکساری سے شروع ہوتی اور خاکساری پر ختم ہوتی۔''[1]

عابد سہیل نے اس کتاب میں غیر رسمی اور غیر ادبی انداز سے افسانوی ادب کی فنی نزاکتوں کو زیر بحث لا کر اس کا پیش لفظ لکھا ہے۔ افسانہ کے متعلق سے بہت سے سوالات اٹھائے ہیں۔ وہ اس طرح ہیں۔

'پھر کیا ہوا' کی افسانوی ادب سے تعلق کی نوعیت کیا ہے۔

افسانے میں سارا کھیل واقعے کا ہوتا ہے اور واقعہ چونکہ 'زمان و مکان' کا اسیر ہوتا ہے اس لیے اسے مستقبل قریب اور مستقبل بعید میں اس کی علاقہ مندی Relevance کیسے قائم رہتی ہے؟

افسانے کے لیے حقیقت کا التباس حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ قاری کے ذہن میں یہ سوال پیدا نہ ہو کہ 'ایسا ہونا تو ممکن ہی نہیں' کیا یہ ممکن ہے کہ واقعہ حقیقت کو پوری طرح ڈھک لے۔

ہر صنف ادب کے کچھ نہ کچھ بنیادی اصول ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان سے روگردانی کو کس حد تک برداشت کیا جائے گا؟ شعر کی دنیا چونکہ چھوٹی ہوتی ہے اس لیے اس میں لسانی یا فنی سقم اور خیال ایک دوسرے کے بہت قریب ہوتے ہیں جب کہ افسانے میں ایسا نہیں ہوتا...... مسئلہ یہ ہے کہ افسانے میں خیال، زبان و بیان اور فن کی دوسری خامیوں اور خیال کے درمیان رشتے کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔

افسانے میں امکانات کی دنیا کا ایک چھوٹا سا حصہ ہی سما پاتا ہے۔ متعلقہ امکانات کے باقی حصے سے اس کا

کیا رشتہ ہوتا ہے؟

افسانہ نگار کے پاس جادو کی کون سی چھڑی ہوتی ہے جس کی وجہ سے قاری ماقبل اور مابعد زمان اور مکان کی تبدیلی اور اس کے عدم تعین کو قابل اعتنا نہ سمجھنے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔

ایک اور سوال افسانے کی تعریف کا ہے۔ کیا جدلیاتی مادیت کی طرح کوئی ایسا اصل الاصول پیش کیا جاسکتا ہے جو اس کی کثیر الجہاتی میں بھی اپنی معقولیت قائم رکھ سکے۔

اس کتاب میں مصنف نے اردو فکشن پر طویل گفتگو کی ہے۔ یہ مباحث سات مختلف عنوانات کے تحت لکھے گئے تنقیدی مباحث ہیں، جس میں افسانے کے مسائل اور رجحانات کو تخلیقی عمل کے پیمانے پر تولا گیا ہے۔ افسانے کی مبادیات سے متعلق کئی اہم سوالات اٹھائے گئے ہیں اور ان کا ممکنہ جواب تلاش کر کے تخلیق پارے کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

عابد سہیل نے افسانے کے حوالے سے جن مسائل کو اٹھایا ہے مثلاً افسانے کی تعبیر و تفہیم کو ناقابل اعتنا سمجھنا، اسے دوسرے درجے کی صنف تصور کیا جانا، شعر کے ماڈل پر پرکھنا، افسانے کے مقابل شعری ادب کو فوقیت دینا، یہ ایسی حقیقتیں ہیں جن سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔ شاہ نواز قریشی لکھتے ہیں:

''فکشن کی تنقید میں انھوں نے جس منطقی انداز میں جس مدلل طریقے سے افسانوی ادب پر گفتگو کی ہے اس طرح سے اس سے اس سلسلے میں کبھی کوئی بات نہیں ہوئی، نہ اس انداز میں کبھی کچھ لکھا گیا۔ انھوں نے افسانوی ادب کی عملی تنقید کے اصول متعین کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ چنانچہ فکشن کی تنقید کو اگر افسانویت یعنی افسانوی ادب کی بوطیقا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔''[2]

عابد سہیل بامقصد ادب کے حامی اور ترقی پسند نقطۂ نظر کے ہمنوا تھے۔ اس کتاب میں فکشن کی تنقید کے علاوہ 'تہذیب، ثقافت اور افسانہ' 'ویرانے ایک مطالعہ' اور 'جدید ناول کا فن: ایک مطالعہ' کا تجزیاتی محاکمہ بھی پیش کیا ہے۔

تہذیب و ثقافت ہر قوم کا قیمتی اثاثہ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے قوم کی شناخت ہوتی ہے۔ فکشن میں اس کی پیش کش ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ ہر ادیب اپنے فن کا خمیر ان تہذیبی و ثقافتی مٹی سے تیار کرتا ہے جن کی جڑیں سالہا سال کے آپسی میل جول اور بھائی چارے کے تحت فروغ پاتی رہی ہیں۔ تہذیب کی ترجمانی ادب کے ذریعے ہوتی رہی ہے۔ عابد سہیل نے اپنے مضمون 'تہذیب، ثقافت اور افسانہ' میں اسے اس طرح اجاگر کیا ہے:

''مشترکہ تہذیب، ثقافت جس کی ارفع ترین شکل ہوتی ہے، کے بغیر افسانہ کا وجود ممکن ہیں اور وہ اس تصور کا اس حد تک اسیر ہوتا ہے کہ شور زنجیر پا تک کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ یہ اسیری ہوتی ہی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ افسانہ میں اس کی موجودگی اس طرح ناگزیر ہوتی ہے جس طرح لکھنے کے لیے کاغذ، قلم یا اس طرح کی کوئی دوسری چیز۔''[3]

مشترکہ تہذیب، ثقافت جس کی ارفع ترین شکل ہوتی ہے، کے بغیر افسانہ کا وجود ممکن ہیں اور وہ اس تصور کا اس حد تک اسیر ہوتا ہے کہ شور زنجیر پا تک کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ یہ اسیری ہوتی ہی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہاجاسکتا ہے کہ افسانہ میں اس کی موجودگی اس طرح ناگزیر ہوتی ہے جس طرح لکھنے کے لیے کاغذ، قلم یا اس طرح کی کوئی دوسری چیز۔

جیسا کہ پہلے ہی عرض کیا جاچکا ہے، 'فکشن کی تنقید چند مباحث' میں نظریاتی مباحث کے علاوہ اہم افسانوں کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے تجزیے میں افسانہ نگاری کی شخصیت ان کے نظریات اور ان کے فن پر پوری روشنی ڈالی ہے۔ کردار، پلاٹ اور وحدت تاثر، تجسس اور زبان و بیان کا انھوں نے پوری غیر جانبداری سے تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ افسانے کا مطالعہ انھوں نے معروضی طریقے سے کیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے فن کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے۔ فکشن کی تنقید چند مباحث میں انھوں نے فکشن کی تنقید کی جو سطح قائم کی تھی اور افسانوں کو پرکھنے اور جانچنے کے جن پیمانوں پر زور دیا تھا، ان افسانوں کے تجزیے میں ان کو پوری طرح برتا گیا ہے۔

'فکشن کی تنقید چند مباحث' میں سات افسانوں کے تجزیوں کے علاوہ عابد سہیل کی کتاب 'افسانیات' جو ان کی وفات کے بعد 2017 میں ان کی اہلیہ نصرت عابد سہیل نے شائع کروائی ہے۔ اس میں بھی افسانے پر تنقیدی مضامین اور تجزیے ہیں جو اس طرح ہیں:

آج کا افسانہ: چند زاویے، نئی حقیقت پسندی اور اردو افسانہ، قمر رئیس اور افسانے کی پرکھ۔ یلدرم سے رتن سنگھ تک، تین افسانے: لاؤ، بالکونی اور منتھن، اقبال متین کے تین افسانے (ایک غیر رسمی مطالعہ)، 'دھمک' ایک مطالعہ، عبدالصمد کے افسانے۔ سیاہ کاغذ کی دھجیاں کی روشنی میں عابد سہیل نے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے کئی ایسے نکات پیش کیے ہیں جو اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک اقتباس دیکھیے:

''افسانے پڑھنے کا صحیح طریقہ تو وہی ہے جو عام قاری اختیار کرتا ہے۔ پڑھنا شروع کیا گرفت میں لیا تو باقی کام چھوڑ چھاڑ کر ختم کر کے ہی دم لیا، پڑھتے نہ بنا تو صفحے پلٹ دیے یا کتاب ہی واپس میز پر رکھ دی۔ دوسرا طریقہ وہ ہے جو نقاد یا مضمون نگار اپناتا ہے، خاص طور سے اس وقت جب اسے مصنف یا افسانے پر کچھ لکھنا ہو، فوری طور پر مستقبل قریب میں کبھی بھی ...زبان و بیان کی ناہمواریوں پر نشان لگائے جارہے ہیں، کوئی واقعہ کوئی کردار یا مکالمہ اہم معلوم ہوا تو اس پر بھی نشان لگا دیا۔''[4]

'افسانیات' میں شامل مضامین پر نگاہ ڈالنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ عابد سہیل اردو تنقید میں بھی مضبوط پکڑ رکھتے تھے۔ آیئے چند مضامین پر نظر ڈالتے ہیں۔

'آج کا افسانہ چند زاویے' میں فکشن میں موضوعات اور ان کی پیش کش میں تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تبدیلیاں دبے پاؤں داخل ہوتی ہیں اور ان کی موجودگی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب چند نہایت ہی عمدہ اور بہت سی مقابلتاً کم عمدہ تحریریں مختصر وقفہ میں سامنے آتی ہیں ظاہر ہے یہ تحریریں ایک دوسرے کے مماثل نہیں ہوتیں لیکن ان میں کچھ نئے اور مماثل پہلو ضرور ہوتے ہیں۔ ہم اسی لمحے کو ان تبدیلیوں کا نقطۂ آغاز تسلیم کر لیتے ہیں۔

ان کا خیال ہے کہ نئے فکری پس منظر سے کسب فیض کرنے والے افسانہ نگاروں نے کوئی ایسا افسانہ نہیں لکھا جس کے مطالعے سے ٹوبہ ٹیک سنگھ، کالو بھنگی، شکر گزار آنکھیں، لاجونتی، اپنے دکھ مجھے دے دو، چوتھی کا جوڑا اور 'پرندہ پکڑنے والی گاڑی' جیسے افسانے یاد آجائیں۔

'قمر رئیس اور افسانے کی پرکھ' میں عابد سہیل نے لکھا ہے کہ ان کا شمار اردو فکشن کے معتبر نقادوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اردو فکشن کی چھان پھٹک میں کم و بیش پچاس سال گزارے۔ ترقی پسند نظریے سے ساری زندگی اپنا رشتہ قائم رکھا۔

قمر رئیس کی ترقی پسندی کے تعلق سے عابد سہیل کا

خیال ہے کہ ان کی ترقی پسندی ایک سمندر ہے جس میں چھوٹی بڑی بہت سی ندیاں اپنی شناخت کھوکر ایک بڑی حقیقت کا حصہ بن جاتی ہیں۔ لکھتے ہیں:

''افسانوی ادب پر قمر رئیس کی نئی تحریروں میں مجادلہ کے بجائے مفاہمت کی راہیں زیادہ واضح ہیں اور اس طرح وہ اردو میں فکشن کے واحد نقاد ہیں جو ترقی پسندی کے بنیادی تصورات سے انحراف کرنے کے باوجود اردو افسانے کی اصلی روایت کو ایک بڑے کل (whole) کی طرح دیکھتے ہیں۔''[5]

'اقبال متین کے تین افسانے' (ایک غیر رسمی سا تنقیدی مطالعہ) میں عابد سہیل نے لکھا ہے کہ اقبال متین نقاد نہیں افسانہ نگار ہیں اس لیے وہ یہ نہیں دیکھتے کہ افسانے کو کیسا ہونا چاہیے۔ انھوں نے نہ تو کردار کا ذکر کیا ہے نہ واقعے کا، نہ واقعات کا تو یہ بتایا کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ اس کی زبان کیسی ہونی چاہیے۔ آغاز اور انجام کیسا ہونا چاہیے لیکن یہ کہہ کر کہ کہانی جب جنم لیتی ہے تو زندگی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔'' انھوں نے بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے اقبال متین کے 'میں بھی افسانہ، تم بھی کہانی' میں پیش کیے گئے ان کے خیالات کو بھی درج کیا ہے:

''میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ کہانی جب جنم لیتی ہے تو زندگی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ اور زندگی اپنی تجسیم کا عمل ایک جسم سے دوسرے جسم اور ایک ثانیے میں جاری و ساری رکھتی ہے۔ کہانی کا رتنفس بھی زندگی کے محزون و مسرور سانسوں کا مرہون منت بھی ہے، جزوی لائف بھی۔ یوں نہیں ہے تو کہانی زندہ نہیں رہے گی اور گر یوں ہے تو کہانی کو کوئی نہیں مار سکتا۔''[6]

عابد سہیل کا خیال ہے کہ اقبال متین نام و نمود سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ ایک طرح کی قلندری ان کے مزاج کا حصہ ہے اور شاید یہی سبب ہے کہ ساٹھ سال کی ادبی زندگی کے دوران بہت سارے اچھے افسانے لکھنے کے باوجود ان کے فن پر نقادوں نے بہت کم توجہ دی ہے۔

عبدالصمد کے ناول 'دھمک' کا تجزیہ کرتے ہوئے عابد سہیل لکھتے ہیں کہ یہ ناول اپنی کمزوریوں، زبان کی طرف کم توجہ دیے جانے اور چند خام کرداروں کے باوجود قابل ذکر اور اہم ناول ہے اور کہیں بہتر کاوشوں کی بشارت دیتا ہے کیونکہ مصنف نے بعض ایسے موضوعات سے جو بڑی حد تک گھسے پٹے قرار دیے جاسکتے ہیں، خود کو آزاد کر لیا ہے اور زندگی کو نت نئے پہلوؤں سے دیکھنا اور تخلیقی حقیقت پسندی کا رویہ اختیار کرنا سیکھ لیا ہے۔

عابد سہیل نے عبدالصمد کے افسانوی مجموعہ 'سیاہ کاغذ کی دھجیاں' کے 13 افسانوں کا تجزیہ 'عبدالصمد کے افسانے' کے عنوان سے کیا ہے۔ ان 13 افسانے کے بارے میں انھوں نے مجموعی طور پر جو رائے قائم کی ہے وہ یہ ہے کہ 'سیاہ کاغذ کی دھجیاں' کے افسانے مجموعی طور پر فصل بہار کا اثبات کرتے ہیں۔ ان کے افسانے کلائمکس یا کسی اچانک موڑ سے پیدا ہونے والے لطف پر انحصار نہیں کرتے۔ اس میں کوئی افسانہ ایسا نہیں ہے جس میں کسی نہ کسی مسئلے پر واقعات، کرداروں اور ان کے درمیان کے عمل اور ردعمل کے حوالے سے متوجہ نہ کیا ہو۔ ان تمام افسانوں میں سے کوئی افسانہ ایسا نہیں جو پورے افسانے پر چھا جائے۔ مصنف آگے لکھتے ہیں کہ عبدالصمد کے ان افسانوں میں منظر نامے تقریباً مفقود ہیں۔ واقعات اور ان تبصروں کی فکری نہج کے سہاری تخلیق آگے بڑھتی ہے۔ افسانے کے حسن میں اضافے کے لیے عبدالصمد شاعرانہ زبان کا سہارا نہیں لیتے۔ وہ کردار کے خدوخال روشن کرنے کے لیے مکالموں کے استعمال کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ زبان کے سلسلے میں وہ غیر محتاط رہتے ہیں جس سے افسانے کا مجموعی تاثر مجروح ہوتا ہے اور خیال کی زنجیر جگہ جگہ ٹوٹنے لگتی ہے۔

عابد سہیل نے اپنے اس مضمون میں عبدالصمد کو فکشن نگار کے ساتھ ساتھ افسانے کی تعلق سے بھی زرخیز اور بارآور ذہن مالک کہا ہے۔

افسانوی فن کے تعلق سے ان کی عملی تنقید اہمیت کی حامل تو ہے ہی لیکن بعد میں انھوں نے عبدالعلیم پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ 'عبدالعلیم : منتخب تحریریں' 2008، 'عبدالعلیم ہندوستانی ادب کے معمار' 2008 'علیم شناسی' مجموعۂ مضامین 2012 اور 'کلیات عبدالعلیم' 2012 یہ ہیں ان کی کتابوں کے نام جن میں پیش لفظ، حرف اولیٰ اور فکر ونظر کے تحت مصنف نے اپنی گراں قدر آرا پیش کی ہیں ایک مضمون ڈاکٹر عبدالعلیم بحیثیت مارکسی نقاد کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے جس سے عابد سہیل کی تنقید نگاری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''عبدالعلیم صاحب کا شمار صف اول کے مارکسی نقادوں میں کیا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے ادب کے مارکسی نقطۂ نظر کی وضاحت جس مدلل اور غیر جذباتی انداز میں کی ہے اس کی کوئی دوسری مثال اردو تنقید میں نظر نہیں آتی۔ ان کی تنقید کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے نظریات کی وضاحت ہمیشہ مدلل اور سلجھے ہوئے انداز میں کی اور عبارت آرائی اور تشبیہوں اور استعاروں کو نفس مضمون پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ ان کے مضامین اور خیالات میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں۔ وہ اپنے طرز بیان پر قادر تھے جس میں بھرتی کے الفاظ نہیں ہوتے۔ انھوں نے کم لکھا لیکن جو کچھ لکھا اس کی حیثیت قدر اول کی ہے۔''[7]

عابد سہیل کی تنقید کی زبان صاف ستھری ہے۔ چونکہ وہ ایک اچھے افسانہ نگار تھے اس لیے زبان و بیان پر ان کی مضبوط پکڑ تھی۔ ان کا انداز تنقید اور اسلوب نگارش شگفتہ، شائستہ اور پرلطف ہوتا ہے جس کی وجہ سے قاری آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، انھیں کسی اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ درج ذیل اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''آج سارا منظر نامہ مختلف ہے۔ ملک کے بیشتر شہروں میں تانگوں کی جگہ موٹر کاروں، ٹراموں، بسوں اور پٹرول یا ڈیزل سے چلنے والی دوسری گاڑیوں نے لے لی ہے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں سیاسی، معاشرتی اور معاشی تبدیلیوں نے منگو کوچوان کو تقریباً حرف غلط بنا دیا ہے۔ اس سب کے باوجود ''نیا قانون'' آج بھی نہایت عمدہ افسانہ تصور کیا جاتا ہے۔ بظاہر اس افسانے میں وہ سارے عیب ہیں جن کے سبب بعض معیاروں کے مطابق اسے نہایت ہی معمولی درجہ کا افسانہ ہونا چاہیے تھا۔''[8]

اس طرح دوسرے اصناف ادب کی طرح عابد سہیل کا تنقیدی شعور بھی بہت بالیدہ تھا۔ انھوں نے جو تنقیدی مضامین وغیرہ لکھے ہیں ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے تنقید نگار تھے۔ تنقید نگاروں کی فہرست میں ان کا نام روشن حروف میں لکھا جائے گا۔

حواشی

1 عابد سہیل کے افسانوں میں عصری حسیت: ڈاکٹر مسرت جہاں، 2019، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص:80
2 عابد سہیل کی خاکہ نگاری، مطیع اصغر، 2017، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص:86
3 فکشن کی تنقید چند مباحث۔ عابد سہیل 2000، پاریکھ آفسیٹ پرنٹنگ پریس، لکھنؤ، ص:10
4 افسانیات، عابد سہیل 2017، ایم آر پبلی کیشنز، دہلی، ص:86
5 ایضاً ص:65
6 ایضاً، ص:88
7 علیم شناسی۔ مرتب عابد سہیل، 2012، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ص:130
8 فکشن کی تنقید۔ چند مباحث، عابد سہیل، 2000، پاریکھ پرنٹنگ پریس، لکھنؤ، ص:160

■

Md. Fahamuddin
Research Scholar
Dept. of Urdu
Delhi University
Delhi-110007
Cell.:8368980594
fahamudin94feb@gmail.com

ناظر حسین خان

جگدیش سہائے سکسینہ کی نظموں میں قومیت کا عکس

سکسینہ صاحب کا نام جگدیش سہائے سکسینہ اور تخلص سکسینہ ہے۔ آپ نے اپنے اس تخلص کا استعمال اپنی پوری شاعری میں صرف ایک جگہ نظم 'شمع' میں اس طرح سے کیا ہے۔

سکسینہ تجھ کو رشک جو آتا ہے شمع پر
افسوس تو ہے اپنی حقیقت سے بے خبر
ورنہ تری ضیا سے منور ہیں بحر و بر
تیرا وجود حسن و محبت ہے سر بسر
نظارہ سوز طور پہ تیرا جمال تھا
موسیٰ کی التجا نہ تھی تیرا سوال تھا

آپ کی ولادت 4 مارچ 1904 کو شاہجہانپور میں ہوئی۔ اس کی تصدیق خود انھیں کے قول سے ہوتی ہے:

''میں شاہجہانپور میں 4 مارچ 1904 کو پیدا ہوا۔''

آپ کا یہ قول آپ کے ایک قلمی نسخے جس کا عنوان 'کچھ اپنے قلم سے' سے لیا گیا ہے، اس قلمی نسخے میں آپ نے اپنے آبائی وطن، آبا و اجداد اپنی ولادت، تعلیم اور شاعرانہ زندگی اور دلچسپی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اپنے آبائی وطن اور آبا واجداد کے حوالے سے اسی مضمون میں فرماتے ہیں:

''مرے آبا و اجداد قصبہ کمپل ضلع فرخ آباد کے ساکن تھے۔ میرے دادا منشی گوکل کنوار بسلسلۂ ملازمت شاہجہانپور چلے آئے۔''

شاہجہانپور میں اپنے والد کی تعلیم اور ملازمت کے حوالے سے سکسینہ صاحب فرماتے ہیں:

''انھوں نے میرے والد بابو ہری ہر سہائے کو انگریزی کی اعلی تعلیم دلوائی اور جب وہ گریجویٹ ہو گئے تو محکمۂ ججی میں ان کو ملازمت دلوا دی جہاں وہ بہت جلد ترقی کر کے منصرم ججی کے عہدے پر فائز ہو گئے۔''

اس قول میں لفظ انھوں نے سے مراد سکسینہ صاحب کے دادا ہیں۔ سکسینہ صاحب اپنی تعلیم کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ آپ اپنی تعلیم کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''بچپن میں گھر پر مولویوں سے اردو فارسی پڑھتا رہا کیوں کہ کائستھوں میں اسی کا رواج تھا۔''

اس کے بعد سکسینہ صاحب اپنے بعد کی تعلیم اور پیشے تک کے سفر کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''بعدۂ انگریزی اسکول میں داخل ہو گیا اور 1922 میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا، پھر الہ آباد چلا گیا۔ کائستھ پاٹھ شالہ سے ایف اے اور الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے اور ایل ایل بی کے امتحانات 28 ,26 ,24 عیسوی میں بالترتیب پاس کیے۔ اور پھر شاہجہانپور میں وکالت شروع کی۔''

عام طور پر دیگر شعرا طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر و شاعری کا آغاز کر دیتے ہیں، مگر سکسینہ صاحب نے تعلیم سے فراغت کے بعد شاعری کی طرف توجہ کی:

''یوں تو شاعری کا مجھے بچپن سے شوق تھا لیکن تحصیل علم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد میں نے باقاعدہ شاعری شروع کی۔''

سکسینہ صاحب نظموں کے شاعر ہیں، حالانکہ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں، مگر ان کے شعری کارخانے میں نظموں کی تعداد زیادہ ہے۔ نظموں کے شوق کے حوالے سے آپ فرماتے ہیں کہ:

''نظم کہنے میں میری طبیعت خوب لڑتی تھی، اس کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے میں نے انیس، سرور جہان آبادی، علامہ اقبال اور چکبست کے کلام کا امعان نظر سے مطالعہ کیا۔''

ان تمام استاد شعرا کے کلام کے اثرات بھی آپ کے کلام میں کہیں کہیں نظر آتے ہیں بالخصوص اقبال کا انداز آپ کی شاعری میں اکثر جگہوں پر دکھائی دیتا ہے، نہ صرف اردو کے شاعروں سے بلکہ آپ نے انگریزی کے شاعروں سے بھی اثر قبول کیا ہے۔ یہ قول ملاحظہ ہو:

''انگریزی کے مشہور شاعروں کا کلام میں بی اے میں ہی پڑھ چکا تھا، اس سے بھی متاثر ہوا۔''

جہاں تک شاعری میں اصلاح کا معاملہ ہے، آپ نے اپنی شاعری میں کسی سے اصلاح نہیں لی، بلکہ اپنے شوق اور استاد شاعروں کے کلام کے مطالعے سے اپنے کلام کو ایک سمت عطا کی۔ اس سلسلے میں سکسینہ صاحب یوں فرماتے ہیں:

''اصلاح میں نے کسی استاد سے نہیں لی بلکہ ذوق سلیم کو اپنا رہبر بنایا۔ اساتذہ کا کلام پڑھنے سے شعر کا ایک خاص معیار میرے ذہن میں قائم ہو گیا تھا جس پر اپنے اشعار کو جانچ لیتا تھا۔''

1928 میں ایل ایل بی کرنے کے بعد جب تعلیم سے فراغت حاصل کر لی، اس کے بعد 1935 سے مشہور میگزین 'زمانہ' سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا:

'' 1935 میں میں نے اپنی نظمیں منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر زمانہ کو بھیجی۔ انھوں نے ازراہ کرم ان کو اوراق زمانہ میں جگہ دیکر میری ہمت افزائی کی، پھر یہ سلسلہ چلتا رہا اور میں زمانہ کے خاص قلمی معاونین میں شامل ہو گیا۔''

آپ نے 78 برس کی عمر پائی۔ آپ کے پوتے ڈاکٹر نرنجن سوروپ (ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ ریاضیات، کرائسٹ چرچ کالج کانپور) کے بقول آپ کی طبیعت خراب ہوئی اور دس سے پندرہ دن کے اندر ستمبر 1982 کو آپ اس دار فانی سے کوچ کر کے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ سکسینہ صاحب کے حوالے سے ڈاکٹر نرنجن صاحب فرماتے ہیں کہ آپ سے ایک بیٹی اور پانچ بیٹے ہوئے۔ بیٹی پانچوں بھائیوں میں سب سے بڑی تھی، ان سے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں اور پانچوں بیٹوں سے کل ملا کر بارہ پوتے اور پانچ پوتیاں ہیں۔ آج یہ سبھی لوگ اپنی خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مزید کہتے ہیں کہ سکسینہ صاحب کو بچوں سے بہت محبت تھی، آپ بچوں کو ہمیشہ عزیز رکھتے تھے۔ جب بھی چھٹیوں میں بچے سکسینہ صاحب کے پاس چھٹی منانے یا کسی اور سلسلے میں آتے تو آپ ان بچوں سے انگریزی نظموں یا ادب کے حوالے سے باتیں کرتے اور ساتھ ہی ان بچوں کے تلفظ پر بہت زور دیتے، اگر کسی بچے سے تلفظ کی کوئی غلطی ہوتی تو اس کو فوراً درست کرتے تھے۔ بچپن میں ہر کسی سے غلطیاں ہوتی ہیں، کبھی کبھی تو کچھ غلطیاں ایسی بھی ہو جاتی ہیں کہ گھر کے بڑے غصے میں آ کر بچوں کو سزا دینے لگتے

ہیں۔ خاص کر بزرگ حضرات کیونکہ ایک عمر گزر جانے کے بعد بزرگ حضرات چڑچڑے پن کا شکار ہوجاتے ہیں اور اس کا خمیازہ بچوں کو بھگتنا پڑتا ہے، مگر سکینہ صاحب اس عمر میں بھی چڑچڑے پن کا شکار نہیں تھے، بچوں سے خواہ کتنی بھی بڑی غلطی ہوجاتی وہ ان کو سزا دینا یا مارنا تو دور، ان کو ڈانٹنے کے بھی مخالف تھے۔ آپ کی غذا قلیل تھی۔ شام کے وقت اپنی غذا لینے کے بعد آپ اپنی اور دوسرے شاعروں کی غزلیں اور نظمیں گنگنایا کرتے تھے۔

سکینہ صاحب کے حالات زندگی قلمی یا ان کے پوتے کی زبانی شکل میں جو بھی ہمارے پاس موجود تھے اس میں سے ضرورت کے مطابق حوالے ہم نے استعمال کر لیے۔ اب آئندہ بحث ان کی شاعری میں نظموں کے حوالے سے نظموں میں موجود قومی عناصر پر ہوگی۔

’آب و رنگ‘ سکینہ صاحب کا پہلا اور آخری شعری مجموعہ ہے، حالانکہ اس کے علاوہ آپ کے شعری سرمایے میں کچھ اور تخلیقات بھی ہیں مگر وہ قلمی شکل میں، کتابی شکل میں نہیں آئی ہیں۔ یہاں پر بحث کا موضوع صرف انھیں تخلیقات کو بنایا گیا ہے جو ’آب و رنگ‘ کی شکل میں شائع ہوکر قارئین کے سامنے آچکی ہیں۔ اس سلسلے میں سکینہ صاحب کے شعری مجموعے کی دوسری نظم ’حسن اور فنا‘ کا یہ بند ملاحظہ فرمائیے۔

حیف! تیری نرم و نازک پتیاں
جن پہ نازاں ہیں عروس نوبہار
شام کو ہو جائیں گی نذرِ خزاں
اے دل بلبل کی رنگیں آرزو

کہتے ہیں کہ اگر کسی بھی شاعر کی شاعری میں قومیت کے عکس کو محسوس کرنا ہو تو اس کی تخلیق میں اس کے ملک کے پھولوں، باغوں، وہاں کے موسم، تیوہاروں، وہاں کے رہن سہن کے ذکر کے علاوہ وہاں کی ندیوں وغیرہ کے ذکر کو تلاش کریں۔ کیونکہ ان تمام چیزوں کا ذکر قومیت کے زمرے میں آتا ہے۔ اسی طرح نظم ’چاندنی رات‘ کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

وہ دل آویز ترانہ جو کنارے جمنا
بانسری لے کے کنھیا نے کبھی گایا تھا
جس کی ہر تان تھی رادھا کے لیے ہوش ربا
ہاں وہی راگ ذرا گا کے مجھے تڑپاؤ

ہندوستانی تاریخ کے صفحوں کو یاد کرتے ہوئے ہمارا شاعر کہتا ہے کہ کبھی گزرے وقتوں میں جس طرح سے چاندنی راتوں میں کنہیا نے رادھا کے لیے جمنا کے کنارے بیٹھ کر بانسری کو بجایا اور گایا تھا اسی چاندنی رات میں آج میں اسی طرح سے اسی ترانے کو سن کر اسی کیفیت کو محسوس کرنا چاہتا ہوں جس کو رادھا نے محسوس کیا تھا۔ اس کے علاوہ اسی مجموعے کی ایک اور نظم ’برج بھومی‘ کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے، جن میں برج کی سرزمین کے ساتھ ساتھ رادھا اور کنھیا جی کا ذکر بھی بہت ہی شاندار انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

سحر ہے جو رادھا کا رخسار روشن
تو شب برج کا گیسوئے عنبریں ہے

اس شعر میں شاعر رادھا کے رخسار کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ شہر برج میں صبح کا جو اجالا دکھائی دے رہا ہے، وہ اصل میں سورج کی وجہ سے نہیں بلکہ رادھا کے روشن رخسار کی وجہ سے ہے، جس نے اپنی چمک کو پورے برج شہر میں بکھیرا ہے۔ جہاں ایک طرف شاعر برج کی صبح کی بات کرتا ہے وہیں دوسری طرف برج کی رات کی بات کرتے ہوئے رادھا کی گھنی اور کالی زلفوں کو وہاں کی کالی اور خوشبودار رات سے کنایہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ لفظ سحر اور شب کے استعمال سے تضاد کی ایک بہترین مثال بھی پیش کی ہے۔ اس کے بعد سکینہ صاحب کنہیا کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ۔

تجلی فگن شام کے آئینے میں
کنھیا کا عکسِ جمال آفریں ہے

شاعر اس شعر کے ذریعے کنہیا کی خوبصورتی کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ شام کے وقت شفق پر یعنی دور زمین و آسمان کے ملنے والی جگہ پر ڈوبتے ہوئے سورج کی دکھائی دینے والی خوبصورت لالی جو آسمان میں چاروں طرف بکھر کر اس کے حسن میں اضافہ کرتی ہے اصل میں سورج کی لالی نہیں بلکہ کنہیا کے چہرے کی لالی کی پرچھائیں ہے۔ سورج نے کنہیا کے چہرے کی لالی کے عکس کی ایک ہلکی سی جھلک کو لے کر اپنے اندر لالی پیدا کی ہے۔

ہماری ہندوستانی تہذیب میں رادھا، کرشن، گوپیاں اور برج بھومی ان چاروں کا رشتہ اٹوٹ مانا جاتا ہے، خواہ وہ شاعری ہو یا نثر جب بھی کوئی شاعر یا نثار اپنی تخلیق میں رادھا یا کرشن جی کا ذکر کرے گا، تو پھر اس کے فن پارے میں گوپیوں اور برج بھومی کے ذکر کا آنا بھی لازمی ہے۔ اسی نظم میں گوپیوں اور برج بھومی کا ذکر کرتے ہوئے چاروں یعنی رادھا، کرشن، گوپیاں اور برج کے ذکر کی اس روایت کو تقویت پہنچاتا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔

جدھر دیکھیے گوپیوں کا ہے جھرمٹ
کوئی سیم تن ہے کوئی مہ جبیں ہے

ہر طرف گوپیوں کا جھرمٹ ہے یعنی آپ ان کے درمیان گھرے ہوئے ہیں اور یہ گوپیاں جنھوں نے کنہیا کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے ان میں کسی کا بدن چاندی کی طرح سفید ہے تو کسی کا چہرہ چاندی کی مانند روشن اور چمکدار ہے۔ اسی نظم میں سرزمین برج کے متعلق یہ اشعار ملاحظہ کریں جس میں شاعر اس سرزمین اور یہاں کے موسم کی تعریف کر رہا ہے۔

مقدس بہت برج کی سرزمیں ہے
ہر اک ذرہ اس کا صنم آفریں ہے

شاعر برج کی سرزمین کو بہت ہی مقدس بتا رہا ہے، وہ اس شہر کے ایک ایک ذرّے کی تعریف کرتا ہے، یہاں کے موسم کی بھی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ۔

یہاں کی بہاریں ہیں جنت سے بڑھ کر
حقیقت میں یہ رشکِ خلدِ بریں ہے

سرزمین برج کی بہاریں جنت کی بہاروں سے بڑھ کر ہیں، یہاں کی بہار کی تعریف میں شاعر مبالغے سے کام لیتے ہوئے کہتا ہے کہ برج کی بہاریں اتنی حسین ہیں کہ ان پر جنت بھی رشک کرتی ہے۔

کوہ ہمالہ کو ہماری اردو شاعری میں علامہ اقبال نے موضوع بنا کر نظم لکھا ہے، وہ اپنی نظم میں ہمالہ کی بلندی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

ہمالہ کو اپنی نظموں کا موضوع سکینہ صاحب نے بھی بنایا ہے۔ آپ نے اپنی نظم ’ہمالہ‘ میں ہمالہ کی بلندی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

اے ہمالہ تو ازل سے ہے نگہبان وطن
سلسلہ تیرا ہے اک حدِّ خیابانِ وطن
رفعتوں سے تیری پیدا شوکت و شانِ وطن
تیری ہستی پر ہیں نازاں نوجوانانِ وطن
آسمانوں سے جو سرگرمِ سخن رہتا ہے تو
داستانِ عظمتِ ہندوستاں کہتا ہے تو

علامہ اقبال کی طرح سکینہ صاحب بھی ہمالہ کی اونچائی کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم اتنے اونچے ہو کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے تم آسمانوں سے گفتگو کر رہے ہو اور تمھاری اس گفتگو میں ہمارے اس ملک کی عظمت، شان و شوکت اور اس کی بڑائی کی ہی باتیں ہوتی ہیں۔ اسی نظم کا ایک اور بہت ہی پیارا سا بند ملاحظہ فرمائیے، جس میں ایک الگ ہی انداز میں ہمالہ کی تعریف کی گئی ہے۔

سلسلے پر پیچ تیرے راہِ الفت کی طرح
جن کی ہستی غیر فانی ہے حقیقت کی طرح
اوج میں اندیشۂ اربابِ ہمت کی طرح
اور درازی میں شبِ تاریکِ فرقت کی طرح
حسنِ عالم سوز کی چینِ جبیں کہیے انھیں
شاہدِ قدرت کی زلفِ عنبریں کہیے انھیں

اس بند میں شاعر نے ہمالہ کی خوبی بیان کی ہے، کہتے ہیں جس طرح محبت کی راہوں میں بہت سی مشکلیں آتی ہیں،

اتار چڑھاؤ آتے ہیں، کتنی مشکلوں سے گزرنے کے بعد عاشق کہیں جا کر عشق کی منزل پر پہنچتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح ہمالہ کی بلندی پر پہنچنے کے لیے بہت ہی مشکل راستوں سے ہو کر جانا پڑتا ہے تب جا کر اس کی بلندی پر پہنچنا لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

اپنے ملک کے موسم کی تعریف میں شاعر کی نظم 'شبنم' بھی قابل ذکر ہے۔ اس نظم میں شاعر نے شبنم کے آنے کا انداز یوں بیان کیا ہے۔

جبکہ آدھی سے سوا رات گزر جاتی ہے
اک پری جانبِ گلزار جہاں آتی ہے

اس شعر میں سردی کے اس موسم کا ذکر ہے جب ہلکی ہلکی سی ٹھنڈ کی آمد ہوتی ہے، ایسے میں کہرا یعنی شبنم کی بوندیں آدھی رات کے بعد آسمان سے زمین کی طرف آتی ہیں۔ اس شعر میں شاعر نے شبنم کی بوند کو پری سے تشبیہ دی ہے اور جس موسم اور جس مہینے کا منظر شاعر پیش کر رہا ہے اس موسم میں شبنم کی بوندیں رات میں ایک وقت گزر جانے کے بعد ہی آتی ہیں اور مشہور ہے کہ پریاں بھی آسمان سے رات میں ایک مخصوص وقت گزر جانے کے بعد ہی زمین پر آتی ہیں۔ دونوں کی مناسبت سے شاعر نے اپنے اس شعر میں تعلیل کی ایک بہترین مثال پیش کی ہے۔

نو بہ نو حسن مناظر کی تمنا اس کو
عرش سے کھینچ کر پستی کی طرف لاتی ہے

زمین کے خوبصورت مناظر کو دیکھنے کی خواہش میں شبنم آسمان سے زمین کی طرف کھنچی چلی آتی ہے۔ شبنم کا اوپر سے زمین کی طرف آنا ایک فطری عمل ہے لیکن شاعر اس کے شاعرانہ سبب کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ شبنم کا آسمان سے زمین کی طرف آنا ایک فطری عمل نہیں ہے بلکہ زمین کی خوبصورتی دیکھنے کے لیے آسمان سے زمین کی طرف آتی ہے، اس لیے اس شعر میں حسن تعلیل پایا جاتا ہے۔

اس میں کمزوریِ اخلاق ہے لیکن مضمر
روزِ روشن میں جو آتے ہوئے شرماتی ہے

شاعر کی ایک اور نظم 'نسیم سحر' سے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں شاعر نے ملک ہندوستان میں صبح میں چلنے والی ہوا کے ساتھ شبنم کا ذکر کیا ہے۔

پہن کر پانو میں شبنم کے گھنگھرو
چمن میں ناچتی پھرتی ہے ہر سو
کبھی سبزے کے اوپر لڑکھڑاتی
کبھی سنبل کے نیچے گنگناتی
کبھی کانٹوں سے دامن کو بچا کر
گلوں کو چوم لیتی مسکرا کر
کبھی رقصاں کنارِ آب جو تھی
کبھی سوسن سے محوِ گفتگو تھی
کبھی غنچوں کو جا کر گدگداتی
کبھی نرگس سے وہ آنکھیں ملاتی
کبھی آغوش میں لے کر شجر کو
جوانی بخشتی ہر برگ و بر کو

سکینہ صاحب نے ہندوستان کی آزادی پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ 'ترانۂ ہندی' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

آزاد ہو گیا ہے اب گلستاں ہمارا
شاخِ کہن ہے ہم ہیں اور آشیاں ہمارا
پہلے بھی دلربا تھی اس کی بہارِ رنگیں
گلشن ہے آج لیکن جنت نشاں ہمارا
ہر پھول اب چمن کا جامِ جہاں نما ہے
کہتا ہے باغباں سے سارا جہاں ہمارا

اس پوری نظم میں شاعر کے ذریعے ہندوستان کے آزاد ہونے پر خوشی کا اظہار کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارا ملک آزاد ہو گیا ہے، اب قدیم ہندوستان جس کا وجود ایک زمانے سے ہے، میں ہم سبھی ہندوستانی اپنے لوگوں کے ساتھ خوشی سے رہ رہے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارا ملک پہلے سے ہی خوبصورت ہے لیکن آج ملک کے آزاد ہونے پر ہمارے ملک کا جو ماحول ہے وہ کسی جنت سے کم نہیں۔ ہمارے ملک کا ہر پھول یعنی ہر بچہ دنیا کے کونے کونے میں جا کر ہمارے ملک کا نام روشن کرتا ہے۔

اسی نظم کے چند اور اشعار ملاحظہ کریں جن میں شاعر نے ہندوستان کی آزادی کی خوشی مناتے ہوئے یہاں کی سرزمین کو رشیوں کی پاک زمین بتایا ہے۔

آزادیِ وطن کا نغمہ ہو یہ مبارک
ہوتا ہے جس کو سن کر دل شاد ماں ہمارا
اے مادرِ وطن اے رشیوں کی پاک بھومی
قدموں پہ تیرے صدقے یہ نقدِ جاں ہمارا

دوسرے شعر میں شاعر اپنے ملک کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے مادر وطن! اے رشیوں کی پاک زمین! ہم تمہارے لیے اپنی جان کو بھی قربان کر دیں گے۔ نظم کے چند اور اشعار ملاحظہ کریں جن میں شاعر ہندوستان کی تاریخی چیزوں کا ذکر بہت شاندار پیرایے میں کرتا ہے۔

ظاہر ہے شان تیری کوہِ ہمالیہ سے
کرتا ہے فخر اس پر ہر نوجواں ہمارا
گنگ و جمن کی موجیں دھوتی ہیں پانو تیرے
امرت سے سینچتی ہیں یہ گلستاں ہمارا
آنکھوں کا نور کہیے دل کا سرور کہیے
پرچم ہے آشتی کا قومی نشاں ہمارا

شاعر کے یہ تینوں اشعار تاریخی نوعیت کے حامل ہیں۔ ہندوستان کی شان ہمالہ سے ظاہر ہوتی ہے یعنی جس طرح ہمالہ تمام پہاڑیوں میں سب سے اونچی پہاڑی ہے ٹھیک اسی طرح ہمارے ملک کی شان اور عظمت بھی تمام ملکوں میں سب سے اونچی ہے۔ اپنے ملک کی اس شان و شوکت پر ملک کا ہر نوجوان فخر کرتا ہے۔ ہمارے یہاں گنگا و جمنا دو ندیاں بہتی ہیں، شاعر نے ان دونوں ندیوں کے بہنے سے ایک خوبصورت شاعرانہ تعلیل اخذ کی ہے۔

'آب و رنگ' میں ایک اور نظم مہاتما گاندھی کے عنوان سے ہے، اس میں شاعر گاندھی جی کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ۔

وطن کے واسطے زنداں میں تو اسیر ہوا
لٹا کے دولتِ ذاتی کو خود فقیر ہوا
غبارِ راہ بدن کے لیے عبیر ہوا
جگر کے داغ سے روشن تیرا ضمیر ہوا
تری حیات حقیقت میں جانِ ایماں تھی
کہ آتشِ غم و ایذا تجھے گلستاں تھی

ہم جانتے ہیں کہ گاندھی جی کی زندگی نہایت ہی سادہ گزری ہے، تقریباً تمام شعرا نے ان کے اس طرز زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ سکینہ صاحب بھی گاندھی جی کی سادہ زندگی کو اپنی شاعری میں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

غذا قلیل تھی تیری لباس تھا سادا
تری گدائی سے رتبہ بڑھا فقیری کا
اسی کو کہتے ہیں اعجازِ ترک و استغنا
کہ دیکھتی تھی ترے منہ کو دولتِ دنیا
امیدوارِ کرم سیم و زر تھے معدن میں
یہ چاہتے تھے کہ آجائیں تیرے دامن میں

اسی طرح پوری دنیا کو یہ معلوم ہے کہ گاندھی جی ہندو مسلم یکجہتی کے علمبردار تھے بلکہ وہ ان دونوں قوموں کے لوگوں کی تکالیف کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، وہ ان دونوں قوموں کو ایک سمجھتے تھے۔ شاعر نے گاندھی جی کی اس خصلت کو نظم کے بند میں یوں پیش کیا ہے۔

تری نگاہ میں نوعِ بشر کی عزت تھی
خدائے پاک کے بندوں سے تجھ کو الفت تھی
اسی کے ذیل میں اہلِ وطن کی خدمت تھی
یہی تھی تیری پرستش یہی عبادت تھی
خدا کے سامنے آنکھیں نہ شرمسار ہوئیں
کہ دشمنوں کی مصیبت پہ اشکبار ہوئیں

■

Nazir Husain Khan
Dept of Urdu, Christ Church College
The Mall, Kanpur- 208001 (UP)
Mob.: 9935276442
Email.: nazirhusainkhan@gmail.com

عتیق اللہ

راشد انور راشد

اداسی ایک خوبصورت احساس کا نام ہے

راشد انور راشد کا شعری مجموعہ 'ایک قطرہ ہی سہی' کے عنوان سے زیر ترتیب تھا جس کے لیے پروفیسر عتیق اللہ نے یہ مضمون لکھا تھا مگر اس مجموعے کی اشاعت سے قبل ہی راشد انور راشد اس جہانِ فانی سے کوچ کرگئے۔ اب بطور تعزیت یہ تحریر قارئین کی نذر ہے۔

راشد انور راشدان جدید معاصر شعرا میں سے ہیں جن کی شاعری کا تاثر میرے ذہن میں اتنا گہرا ہے کہ میں سب سے پہلے ہر اس رسالے میں مشمولات کی فہرست میں ان کا نام ڈھونڈتا ہوں جو مجھے موصول ہوتے ہیں۔ میں غزل اور نظم کے خانوں میں رکھ کر ان کے بارے میں نہیں سوچتا۔ وہ شاعر ہیں اور شاعری کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ بے حد حساس، بے حد جذباتی ہیں اور شاعری کے ساتھ ان کی وابستگی بے لوث ہے، جسے تشہیر اور ڈگڈگی بجا کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ادیب کو تعلق ساز نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی میرا منشا یہ ہے کہ ادیب شہرت پسند نہیں ہوتا۔ تعلق سازی اور شہرت پسندی کو پتلی گلی سے نکلنے کا راستہ بنا کر اور اسی پر قناعت کرنے والے داد و تحسین کے جو تمغے حاصل کرتے ہیں ان تمغوں کی چکاچوند کے بارے میں اربابِ نظر یہ جانتے ہیں کہ اس میں کتنی دیرپائیت ہوتی ہے۔

راشد انور راشد کے کچھ جذباتی اور نجی مسائل ہوں گے جن کے باعث وہ ادبی رسائل میں بہت کم نظر آئے حالانکہ ان کے چوتھے شعری مجموعے بہ عنوان 'ایک قطرہ ہی سہی' کے مسودے کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ انھوں نے جن سِروں کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا وہ اب بھی ان کی گرفت میں ہیں۔ مسودے میں ایک طویل 'اعتراف نامہ' بھی ہے لیکن مجھے تو ان کی شاعری سے مطلب تھا، سو پہلے سرسری طور پر شروع سے آخری صفحے تک تمام غزلیں اور نظمیں پڑھیں، کئی جگہ رکنا بھی پڑا، پل دو پل میں جو نقش ذہن میں قائم ہوا اسے سہارنے Sustain کرنے کی کوشش بھی کرتا رہا، لیکن پہلی قرأت پر میں بہت کم بھروسہ کرتا ہوں۔ اس لیے ہر تاثر کو گذشتنی کا نام دے کر 'اعتراف نامے' کی طرف رجوع ہوگیا۔ اعتراف نامہ کیا ہے کچھ 'آپ بیتی' ہے، کچھ شکایتیں ہیں، کچھ بہت محتاط طریقے سے اپنی بیماری کا ذکر ہے۔ ان کے یہاں اضطراب کی وہ کیفیت ہے جو اس اعتراف نامے کے سنجیدہ قاریوں کو تادیر بے چین رکھ سکتی ہے اور شاید اسے پڑھنے کے بعد وہ راشد کی شاعری کے مطالعے کے لیے فوری طور پر تیار ہی نہ ہوں۔ ویسے راشد نے اپنی تحریر کو 'مقدمے' کا نام بھی نہیں دیا ہے، کچھ باتیں اپنی شاعری اور معاصر شاعری کے بارے میں کہی ضرور ہیں لیکن صرف یہ کہنے سے کوئی خاص مقصد پورا نہیں ہوتا کہ وہ ہنگامی اور لمحاتی شاعری سے کوسوں دور ہیں، جب تک کوئی جذبہ، کوئی خیال انھیں اندر سے بے چین اور مضطرب نہیں کرتا، وہ کبھی بھی قلم کا سہارا نہیں لیتے۔ اس طرح کے خیالات کی گونج ہمیں اکثر سنائی دیتی ہے۔ غالباً وہ یہ کہنا چاہتے ہیں یا یہ کہیے کہ ان کا مدعا یہ ہے کہ وہ شعر کہنے کے لیے ایسے کسی مصنوعی جذبے کو ترجیح نہیں دیتے جو ان کے اندر تحریک کا باعث ہو۔ بہرحال مصنوعی جذبے کی بھی ایک قدر ہے۔ ہمارے پاس ایسا کوئی آلہ نہیں ہے کہ منشائے شاعر کی تہہ تک پہنچ سکیں۔ قیاس کا عمل ضرور ایک دلچسپ مسئلہ ہے۔ راشد صاف ذہن رکھتے ہیں مکر و ریا کو کبھی پاس پھٹکنے نہیں دیتے، انانیت ضرور ان کی شخصیت کا خاصہ ہے جسے وہ مثبت انانیت کہتے ہیں۔ انانیت کے معنی قطعی یہ نہیں ہیں کہ ہم سب کے درمیان ہوکر بھی درمیان میں نہ ہوں۔ راشد کی حاضری اور غیر حاضری میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حساس لوگوں کا یہی مسئلہ ہے کہ وہ بہت جلد اپنی ذات میں غرق ہوکر گم شدگی کی لطافتوں سے سیراب ہونے لگتے ہیں۔ راشد کی شاعری کے توسط سے میں نے ان میں اپنی دنیا آپ خلق کرنے کا سراغ پایا اور یہ بھی محسوس کیا کہ ان کی اپنی اخلاقیات، ان کی شاعری میں جا بجا اپنے لیے گنجائش نکال لیتی ہے، لیکن راشد آہنگ کی سطح کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں ؎

قلندر ہیں، ہمیں تو رسم درباری نہیں آئی
اداکاروں میں رہ کر بھی اداکاری نہیں آئی

پلٹنا جانتا ہوں میں بھی ہر شطرنج کی باری
تری تقدیر اچھی ہے، مری بازی نہیں آئی

غیر کی چھت کا ابھی تک نہ کیا اس نے طواف
اس پرندے کو در و بام سے پہچانا جائے

طے تھا پہلے سے، کوئی شور شرابا نہ ہوا
فیصلہ جو ہوا، چپ چاپ ہوا میرے خلاف

تم اپنے آپ سے ملتے نہیں کیا
کہیں بھی گھر میں آئینہ نہیں ہے

جب بولنے کا وقت تھا، تب چپ سی لگ گئی
رہنا تھا جب خموش تو بولے عجیب لوگ

دل کا سیلاب ہے فوراً نہیں تھمنے والا
اس میں کچھ وقت لگے گا، ذرا مہلت دی جائے

جو بھی زمینیں بنجر تھیں، جب ان کو کیا زرخیز تو پھر
فصلیں آئیں آگ کی زد میں، پھول کھلانا بھول گئے

وہ ہوشیار لٹیرے تھے، جنگ جیت گئے
سبب یہی تھا کہ خانوں میں ہم بٹے ہوئے تھے

راشد کی غزلوں سے یہ چند اشعار نمونے کے طور پر میں نے منتخب کیے ہیں۔ ان میں ذات کے تجربے کا میلان

سب سے حاوی ہے۔ کچھ اس دور کے انسانوں کی بے حسی اور بیگانگی کی اذیت رسانی کا احوال ہے، کچھ اپنی قلندرانہ صفتی اور کچھ اپنی انا گیری کی طرف اشارے ہیں۔ کہیں کہیں اس طرح کی کجی کا شائبہ بھی موجود ہے جو انسانوں کے باطن کی سیاحی اور ان پر باطن کے انکشاف کے بعد کا ممکنہ مرحلہ ہے، انسانوں کی دولختی کے تجربے سے ہم سب گزر رہے ہیں اور راشد بھی ہم سب میں سے ایک ہیں۔ بس یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے تجربے میں شدت اور ناخوشی کی رمق زیادہ ہے۔ ان کے اظہار میں بیان کی صورتوں سے اس لیے بھی سابقہ پڑتا ہے کہ شدت کی رَو کبھی اس قدر غلبہ اختیار کر لیتی ہے کہ بیان پھر بیان ہی نہیں رہتا۔ اس سے ایک علیحدہ قسم کی حیرتوں کا دہانہ کھل جاتا ہے اور بیان کی بیانیہ میں قلبِ ماہیت ہوجاتی ہے۔

پرانی تیغ تھی، لگتی تھی زنگ آلودہ
مرا خیال جو آیا تو صاف اس نے کیا

بدن کی مٹی بھی ہوجائے گی بہت زرخیز
جو زخم دل کا ہے، اس کو ہرا تو ہونے دو

خواہ اس جنگ کا اب کوئی نتیجہ نکلے
تجھ سے اب برسرِ پیکار سرِ عام ہوں میں

خبر سنائی گئی تھی کہ روشنی ہے وہاں
مگر شدید اندھیرا تھا، میں اکیلا تھا

ہم نے بنجاروں کو دیکھا تو یہ احساس ہوا
بے مکانی در و دیوار کی محتاج نہیں

ہوگئے سب کو آڑے ہاتھوں لینے میں معتوب
جرم یہی کیا کم تھا، لہجہ تھا بے باک ہمارا

خیال آیا کہ چہرہ تو صاف ہوجائے
ہمارے ہاتھ مگر دھول میں اَٹے ہوئے تھے

مرے ہی جسم سے باہر نکل رہا تھا کوئی
وہ میرے ہاتھ تھے اور خون میں رنگے ہوئے تھے

ان تمام اشعار میں کئی کہانیاں چھپی ہوئی ہیں۔ کہانی کی منطق ہی عجیب ہوتی ہے۔ کبھی ہونی اور کبھی انہونی لگتی ہے۔ ایک سے زیادہ کردار، ایک سے زیادہ آوازیں اور ان کی گونج ہوتی ہے۔ راشد جانتے ہیں کہ حقیقت کو حقیقت کے طور پر پیش کرنے میں جو طمانیت میسر آتی ہے اس کی لطافت ہی الگ ہوتی ہے لیکن وہ دھوکا بھی ہوتا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ حقیقت فہمی خود ایک مسئلہ ہے اور پھر شعر یا کہانی میں وضاحتوں کی نسبت پرچھائیوں کی زیادہ اہمیت ہے۔ راشد نے اپنی بیشتر نظموں میں اپنے ان تجربوں کو بنیاد بنایا ہے جن کا تعلق ممبئی کے اسپتالی معمولات سے ہے۔

راشد کے جذبوں کے بارے میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ ہر راہ ان کی ذات سے ہو کر جاتی ہے جس طرح ان کی نظموں سے ان کی زندگی کے چند ایسے گوشوں کا ہمیں علم ہوتا ہے جو ان کے سوانح میں پورے ایک باب کی حیثیت رکھ سکتا ہے۔ غزل کے باب میں ہم سب جانتے ہیں کہ پوری آواز میں بات کرنے کے معنی اپنی بات کی قدر کھونے کے ہیں۔ راشد نے غالباً شعوری طور پر دبی ہوئی آواز میں پوری بات کرنے کا تجربہ کیا ہے۔ ان میں وہ ایسے چاک بھی چھوڑ دیتے ہیں جن میں جھانک کر ہم ان کے باطن کی کشاکشوں کا احوال بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ان غزلوں کی ردیفیں نہ صرف خوب ہیں بلکہ ان کے ذریعے راشد کو سمجھنے کی بھی ایک صورت نکلتی ہے۔

مری تباہی کا قصہ یہی پہ ختم کرو
بہت ہوا یہ تماشہ یہیں پہ ختم کرو

مشکلیں ہوتی ہیں آسان، چلو بات کریں
یونہی چپ چپ نہ رہیں جان، چلو بات کریں

غیروں کا احسان نہ لیں گے ہم دونوں
درد کی سرحد پار کریں گے ہم دونوں

تاک میں جو بھی لگے تھے، وہ اٹھے، میرے خلاف
چاہنے والے بھی اب دل سے ہوئے میرے خلاف

جو مجھے آنکھ دکھائے گا وہ پچھتائے گا
جب مرے نرغے میں آئے گا، وہ پچھتائے گا

بستر پر بے جان پڑا ہوں، آج بھی نیند نہیں آئی
کروٹ کروٹ چیخ رہا ہوں، آج بھی نیند نہیں آئی

کیسا ہے بے خودی کا نشہ ہم سے پوچھیے
بارش میں بھیگنے کا مزا، ہم سے پوچھیے

جانے کیوں قابو میں رہتا ہی نہیں ذہن مرا
پوچھتا ہوں تو بتاتا ہی نہیں ذہن مرا

نہ کسی کی بھی اطاعت میں رہا میرا قلم
سرخرو آج بہرحال ہوا، میرا قلم

میں حفاظت سے رکھوں گا، چلی آ میری طرف
تجھ کو ضائع نہ کروں گا، چلی آ میری طرف

کسی بہانے وہ خواب ٹوٹا تو میں نے سوچا
طویل مدت کے بعد جاگا تو میں نے سوچا

اس طرح اکثر غزلوں میں راشد نے لمبی لمبی ردیفوں سے برجستگی کو خوب قائم رکھا ہے۔ غزل میں خارجی اور داخلی سطح فکر و خیال اور فضا کی شکل میں تسلسل کی صورت ضرور نکلتی ہے لیکن یہ نظمیں نہیں ہیں۔ راشد پرگو ہیں۔ قدرت نے انھیں غیر معمولی تخلیقی صلاحیت سے نوازا ہے۔ وہ تجربہ برائے تجربہ اور عصری فیشن کے عصری مگر عارضی تقاضوں کو سمجھنے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں لیکن ان کے اعتماد کے بھی کچھ تقاضے ہیں، جو ان کے نزدیک زیادہ قدر افزا ہیں۔

راشد کی غزل اور نظم دونوں ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ نظم آزادی زیادہ فراہم کرتی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں ان رحم ناک تجربوں اور وارداتوں کو بیانیے کی شکل میں پیش کیا ہے مگر راشد کی جذباتیت خود ترحمی سے عاری ہے۔ شدت اظہار کی وہ کیفیت جو ان کی غزلوں میں ملتی ہے اس میں ضبطِ اظہار کے اسی تجربے سے ہم یہاں بھی دوچار ہوتے ہیں۔ نظمیں اکثر بغیر کسی تکلف کے شروع ہوجاتی ہیں جیسے 'حاجی اسمٰعیل و حاجی علاّنہ سینی ٹوریم' لیکن جوں جوں نظم آگے کا رخ کرتی ہے انسلاکات کا ایک سلسلہ قائم ہوجاتا ہے۔ نظم اندر اور باہر سے پھیلتی چلی جاتی ہے۔ سینی ٹوریم کی پہچان بھی اسی کے ساتھ حاشیہ رسید ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسے Metanarrative کی وہ شکل کہہ سکتے ہیں جو بیانیہ اندر بیانیہ کہلاتی ہے۔ مختلف النوع تجربات و واقعات کا سلسلہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ذمے داری یادوں کی نگرانی، میس مینیجر، جیسی نظموں کے بعد ماں تجھے یاد ہے نا! ماں کے نام ایک خط، آزمائش کا خوف، اچاروں کا ذائقہ، اور اسی طرح کی دوسری نظمیں ان کی معصوم یادوں کے بیانیے ہیں۔ اسپتال کے ماحول اور بیماری کے عالم میں تنہائی ماضی کا دروازہ کھول دیتی ہے اور سب سے پہلے جو تصویر ذہن کے اسکرین پر ابھر سکتی ہے وہ 'ماں' ہے۔ جو کسی نہ کسی موڑ پر رخصت بھی ہوجاتی ہے اور ماں ایک مستقل احساس کا روپ لے لیتی ہے۔ ان نظموں میں بے پایاں کسک اور اپنا پن ہے۔ اس احساس کے اظہار اور اظہار کے لمحوں سے گزرنا بھی کسی آزمائش سے کم نہیں ہوتا۔ راشد شدتِ اظہار کے ساتھ ضبطِ اظہار سے کہیں دامن کش نہیں ہوتے۔ یہ نظمیں اگر قاری کو اداس کرتی ہیں تو اداسی خود ایک خوبصورت احساس کا نام ہے۔

■

Prof. Ateequllah
C-29, Abshar, Johri Farm, Jamia Nagar
New Delhi- 110025
Mob.:9810533212
ateequllahsyed@gmail.com

کوثر مظہری

راشد انور راشد کی یاد میں

تو یہ ہوا کہ ہواؤں کی زد پہ آہی گیا
سنبھلتا کیسے کہ کمزور ہوگیا تھا درخت

—راشد انور راشد

راشد انور راشد میرا دوست، میرا بھائی چلا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خوبصورت، خوب سیرت، خوش گفتار، خوش اطوار، خوش لباس، خوش نوا یعنی اس نوع کی انسانی زندگی اور ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے جو بھی صفاتی سابقہ لگانا چاہیں، آپ راشد انور راشد کے لیے لگا سکتے ہیں۔ کیا بتاؤں کہ کیا کچھ کھوگیا ہے۔ میرے اَن گنت لمحے ہیں اور ان لمحوں میں راشد انور کی یادوں اور ان یادوں سے بنی پرچھائیاں ہیں۔ 1993 سے لے کر 7/اپریل 2024 کی صبح تک آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے بعد جامعہ ملیہ میں ایڈہاک پر استاد ہوگئے تھے۔ 1999 سے 2000 تک کا زمانہ اور پھر کریم سٹی کالج جانے اور وہاں سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں آنے تک، ہمیشہ ہی ان سے ایک رابطہ قائم رہا۔ اتنی یادیں اور اتنی باتیں ہیں کہ سب گڈمڈ سی ہونے لگی ہیں۔ ممکن ہے بعض احباب میری اس بات پر یقین نہ کریں، لیکن دراصل جذبات سے جب عام زندگی میں بھی انسان مغلوب ہوتا ہے تو گفتگو بے ربط سی ہوجاتی ہے اور پھر اگر یہ سلسلہ دراز ہوا تو زندگی میں بھی بے ربطی سی آنے لگتی ہے۔

انسانی زندگی میں احساسات اور جذبات سے زیادہ میں نہیں سمجھتا کہ کسی اور چیز کی اہمیت یا معنویت ہوسکتی ہے۔ کسی کی زندگی سے ان مذکورہ اوصاف کو منہا کر کے دیکھیے کہ وہ شخص کیسا بے بس ہوگا اور اندر سے اس کے اندر خلاؤں کا کیسا پہاڑ کھڑا ہوجائے گا۔ اس لیے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ راشد انور میرے جذبات و احساسات میں مدغم ہیں اور اس ادغام میں ایک لمبے عرصے کا بھی عمل دخل ہے اور ان کی پرخلوص محبتوں کا بھی۔ وہ ہمیشہ مجھے خط لکھتے رہے۔ میں اگر گاؤں میں رہا تو دہلی سے اور جب وہ کریم سٹی کالج جمشید پور چلے گئے تو وہاں سے اور ہمیشہ انھوں نے مجھے اس انداز میں مخاطب کیا: ''پیارے کوثر بھائی، سلام قبول کیجیے!'' میرے سامنے اس وقت ان کے تین پوسٹ کارڈ ہیں، کئی اور ہوں گے، کچھ تو گاؤں پر ہوں گے۔ سامنے رکھے پوسٹ کارڈ کا طرز تخاطب ایک سا ہے۔ لیکن اس 'پیارے کوثر بھائی' کو بدل کر وہ کیا لکھتے۔ اس میں جو پرخلوص محبت کی مٹھاس ہے، وہ کسی اور بھاری بھرکم اور اَدق الفاظ و تراکیب والے فقرے میں نہیں ہوسکتی۔ 15 فروری 2002 کے ایک خط میں جمشید پور سے لکھتے ہیں: ''آپ سے حد درجہ قربت کی بنا پر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں دہلی سے دور رہ کر بھی دہلی میں ہی ہوں۔''

اب تو خط و کتابت کا سلسلہ ہی نہیں رہا، لیکن جس محبت اور یگانگت کا اظہار وہ خطوط میں کرتے رہے، اس حوالے سے میں خود کو خوش نصیب سمجھتا ہوں۔

اس نوع کے ذاتی تعلقات کے ساتھ ساتھ ادب سے ان کی گہری وابستگی کا اندازہ بھی ان خطوط سے لگایا جاسکتا ہے۔ وہ دھنباد سے نکلنے والے رسالے 'رنگ' کی مجلس ادارت سے وابستہ تھے۔ اس حوالے سے ایک خط (29 نومبر 2001) میں لکھتے ہیں ''ادارہ 'رنگ' کو اپنے تاثرات سے ضرور نوازیں اور 'نئی سوچ، نیا ادب' نمبر کے حوالے سے بھی کچھ نہ کچھ لکھنے کا ذہن بنالیں۔ دہلی آکر دو تین مذاکرے بھی کرانے ہیں تاکہ خاص نمبر میں انھیں شامل کیا جاسکے۔''

ایک اور خط (15 فروری 2002) میں لکھتے ہیں Examination Duty لگ جانے کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کی فرصت نہیں مل پارہی ہے۔ شام کی کلاسز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے جس کی بنا پر 'استعارہ' کا مضمون مکمل کرنا دشوار ہوگیا ہے پھر بھی کسی طرح مکمل کر کے کوریئر ڈاک سے روانہ کردوں گا۔''

خط کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''کوثر بھائی! آپ پہلی فرصت میں، نیا ورق، نیا سفر، نئی ادبی دریافت کے پتے اور فون نمبر مجھے لکھ بھیجیں۔ چونکہ سارا اثاثہ

فی الوقت بکھرا پڑا ہے، اس لیے کچھ رسالوں کے پتے دستیاب نہیں ہو پا رہے ہیں۔''

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات سے ان کی ادب دوستی اور شعر و ادب سے ان کی گہری وابستگی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ صلاح الدین پرویز کی ادارت میں سہ ماہی 'استعارہ' شائع ہوا کرتا تھا۔ حقانی القاسمی بھی اس سے وابستہ تھے۔ وہاں استعارہ کے دفتر میں جن شاعروں اور ادیبوں کو آتے جاتے اور بیٹھتے، گفتگو اور مباحثہ کرتے دیکھا، ان میں راشد انور بھی تھے۔ صلاح الدین پرویز ان پر بھروسہ کرتے تھے اور مضمون لکھوایا کرتے تھے۔ راشد صاحب بھی ان کا بے حد احترام کرتے اور ان کی فرمائش کو حکم کا درجہ دیتے ہوئے اس کی تعمیل بھی کرتے۔ ان کی ایک اہم کتاب 'نئے افسانے کا معنوی استعارہ' اسی زمانے کی کاوش ہے جو پہلے تو استعارہ کا فکشن نمبر کے عنوان سے چھپا اور پھر بعد میں راشد انور نے چالیس افسانوں کا تجزیہ مقدمے کی شکل میں تحریر کیا جو کہ مکتبہ 'استعارہ' سے ہی کتابی شکل میں 2001 میں شائع ہوئی۔ اس پر کم لوگوں کی توجہ گئی۔ اس کا سبب یہ رہا کہ راشد انور کی شناخت ایک شاعر کی تقریباً بن گئی تھی۔ 2001 میں میری کتاب 'جواز و انتخاب' شائع ہوئی تھی جس میں راشد انور کی آٹھ منتخب غزلیں شامل تھیں، لیکن زیر بحث کتاب کے مقدمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں فکشن کی تفہیم و تعبیر کا بھی ملکہ تھا۔ یہاں اس کتاب کے مقدمے سے دو تین اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''میں نے کوئی تنقیدی مضمون نہیں لکھا ہے، بلکہ قارئین سے مکالمہ کی گنجائش نکالی ہے۔''

''آج کے افسانوں میں رشتوں کی ڈور کو سنبھالنے کی کوشش ایک بار پھر دکھائی دینے لگتی ہے کیونکہ یہ ڈور اگر ٹوٹ گئی تو پھر کہانیوں میں کچھ بھی ایسا باقی نہیں رہے گا جس سے محسوسات کی دنیا میں ہلچل پیدا ہو سکے۔''

''آگے بہت کچھ چلے جانے کے طویل وقفے کے بعد پیچھے چھوٹے ہوئے مقامات ہمیں بہت تڑپاتے ہیں اور پھر ہاتھ ملنے کے علاوہ کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا، کیونکہ وقت ریت کی طرح مٹھیوں سے سرکتا چلا جاتا ہے۔''

ان اقتباسات کو پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ ادب کا ایک سچا قاری ہے جو افسانوی متون کی چھان پھٹک کرتے ہوئے ان میں زندگی کے اصل حقائق کی جستجو بھی کرتا جاتا ہے اور وقت کی رفتار اور زمانے کی نبض پر بھی اس کی گہری نظر ہے۔ اس کتاب کا حوالہ میں نے اس لیے بھی دیا ہے کہ راشد انور کو دنیا اور آنے والی ادبی نسل کہیں محض شاعری کی آہنی دیوار میں قید نہ کر دے۔ اس کے علاوہ بھی ان کی نثری کاوشوں میں مضامین کے کئی مجموعے ہیں۔ ادب کے تعلق سے، پرورش لوح و قلم، شعور نقد، مجروح سلطانپوری، لفظ آثار، منتخب نظموں کا تجزیاتی مطالعہ وغیرہ۔

2008 میں مضامین کا مجموعہ 'پرورش لوح و قلم' شائع ہوا۔ مجھے بھی یہ کتاب 24 اگست 2008 کو بطور تحفہ کے دیتے ہوئے راشد انور نے لکھا ''پیارے کوثر بھائی کے لیے!'' میرے حوالے سے 'پیارے کوثر بھائی!' والا فقرہ ایسا لگتا ہے ان کے دل کے صفحے پر نقش ہو گیا تھا۔ ایسا میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جو بھی خطوط انھوں نے لکھے یا مجھے اپنی کتابیں دیں، سب میں تخاطب کا اسلوب یہی رہا۔ کہرے میں ابھرتی پرچھائیں (عشقیہ نظمیں) پر البتہ یہ فقرہ درج ہے: ''بڑے بھائی کوثر مظہری کے لیے'' یہ کتاب 2012 میں شائع ہوئی تھی۔

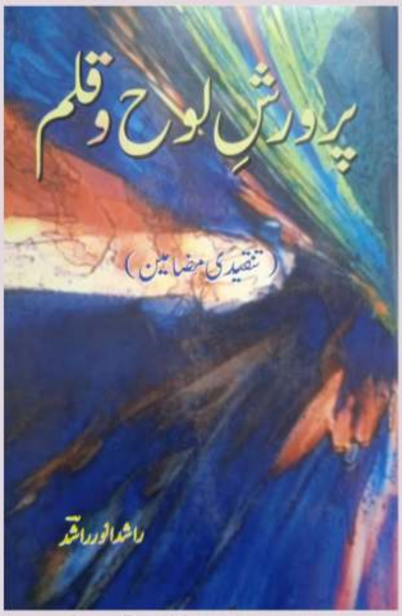

بہر حال، بات راشد انور کی نثری تحریروں کی ہو رہی تھی۔ 'پرورش لوح و قلم' میں 24 مضامین ہیں۔ کتاب کا انتساب ہے: ''علی گڑھ کی خوشگوار ادبی فضا کے نام'' علی گڑھ واقعتاً ہمیشہ سے اردو ادب کو قیمتی لعل و گہر دیے ہیں۔ راشد انور کا بھی خواب تھا کہ وہ علی گڑھ جیسی معتبر ادبی فضا سے اپنی ذہنی و فکری ہم آہنگی قائم کر سکیں۔ انھوں نے وہاں آکر بہت کچھ سوچا اور لکھا۔ مضامین لکھے، شاعری کی، سمیناروں میں پرچے پڑھے، اپنی ایک پروقار شناخت بنائی۔ ادب پڑھنے کی غرض و غایت پر سوچتے رہے اور پھر ایک مضمون تحریر کیا، مجھ سے کوئی پوچھے کہ ادب کیوں پڑھتا ہوں تو شاید اس کا جواب ایک دو جملوں سے زیادہ کا نہیں ہوگا، لیکن انھوں نے 'ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں؟' کے عنوان سے سات صفحات پر مشتمل ایک مبسوط مضمون لکھا ہے۔ اندازہ ہوا کہ وہ 'ادب' کو کس طرح دیکھتے ہیں۔ یہاں بھی دو تین اقتباسات ملاحظہ کر لیجیے:

''میں ادب کا مطالعہ اپنے آپ کو از سر نو دریافت کرنے کے لیے کرتا ہوں۔'' (ص 12)

''جہاں تک ترجیحات کا معاملہ ہے پڑھنے پڑھانے کے ماحول سے متعلق ہونے کے باوجود مطالعۂ ادب کی حیثیت ہمارے نزدیک ثانوی ہوتی ہے۔'' (ص 12)

''ادب کے بہترین نمونوں کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے تطہیر نفس کے مرحلے سے گزرنے کی بار ہا سعادت نصیب ہوئی ہے۔ ادب نے میرے سوئے ہوئے ضمیر کو ہمیشہ ہی جھنجھوڑا ہے۔'' (ص 13)

''ادب کا مطالعہ مجھے اخلاقی سطح پر بلند ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ مادہ پرستی کے دور میں اخلاقی قدروں کا زوال جس تیزی سے ہو رہا ہے۔ اس سے ہم سب اچھی طرح واقف ہیں۔'' (ص 14)

اس کتاب میں اور بھی کئی اہم مضامین ہیں جن کے حوالے سے گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن چونکہ یہ ایک تعارفی اور شخصی نوعیت کا مضمون ہے، اس لیے یہاں سب کچھ کا احاطہ ممکن بھی نہیں ہے۔ پاپولر لٹریچر، معاصر تنقید، نثری نظم، معاصر اردو غزل میں عشق کا تصور، علی گڑھ کے ترقی پسند نظم گو شعرا، آل احمد سرور کی تنقیدی بصیرت، پروفیسر مختار الدین احمد بحیثیت انشا پرداز، شہریار کی شاعری، منیب الرحمن کی نظمیں، قرۃ العین حیدر کا پہلا افسانہ، انتظار حسین کا تخلیقی سفر وغیرہ اہم مضامین ہیں۔ اسی طرح مضامین، انٹرویوز یادیں اور تراجم پر مشتمل ان کی کتاب آثار لفظ 2014 میں شائع ہوئی۔ 453 صفحات پر مشتمل یہ کتاب بھی ان کی طبیعت اور ادبی میلان کے مختلف النوع پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے۔ غزل پر، خورشید الاسلام، مجاز، جذبی، جاں نثار اختر، فیض، قمر رئیس، وغیرہ پر مضامین ہیں، ساتھ ہی انھوں نے 'ہندوستانی ثقافت کا آئینہ' کے عنوان سے بھی ایک طویل مضمون لکھا ہے۔ واضح ہو کہ ان کی ایک کتاب 'فنون لطیفہ' (2000) کے عنوان سے بھی چھپی تھی جس میں رقص، موسیقی اور مصوری وغیرہ کے حوالے سے مضامین تھے۔ ان میں سے بیشتر مضامین انگریزی مضامین سے اکتساب کردہ تھے اور تواتر کے ساتھ رسالہ آجکل میں چھپا کرتے تھے۔ حالانکہ یہ ان کا میدان عمل نہیں تھا، لیکن مدیر رسالہ کی فرمائش پر انھوں نے یہ سارے مضامین لکھے تھے۔ 'لفظ آثار' میں بھی دو تین

مضامین مصوری اور ثقافت پر ہیں جو کہ تراجم کے باب میں ہیں۔ اسی کتاب میں سات انٹرویوز شامل ہیں۔ جذبی، قاضی عبدالستار، شمس الرحمٰن فاروقی، مظہر امام، الیاس احمد گدی، مخمور سعیدی، ظہیر انور کے انٹرویوز ہیں۔ فاروقی صاحب سے کیا گیا انٹرویو سب سے طویل ہے جو 30 صفحات پر مشتمل ہے۔ انٹرویوز کے بارے میں بھی تیرہ صفحات کا تمہیدی مضمون ہے۔ فنون لطیفہ والی کتاب میں محبوب الرحمٰن فاروقی اور زبیر رضوی کی تحریریں بھی پیش لفظ کے طور پر شامل کی گئی ہیں۔ انتساب ہے: ''آجکل، ذہن جدید، شب خون اور جامعہ کے نام جن کی بدولت مجھے فنون لطیفہ کو سمجھنے کا موقع ملا'' آپ نے غور کیا ہوگا کہ راشد انور راشد کے ادبی وتہذیبی مطالعے کا دائرہ کیسا توانا اور وسیع ہے۔ کیسا زرخیز اور پرجوش ذہن اور جذبہ تھا۔ آج جب ان کے ادبی کارناموں کو دیکھتا ہوں اور یہ سوچتا ہوں کہ اب راشد انور ہمارے درمیان نہیں تو ایک دم سے دھچکا سا لگتا ہے اور ان کی پرچھائیں آس پاس دائرہ در دائرہ گردش کرنے لگتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی ہوا سی چلنے لگی ہے جس میں ایک طرح کی نغمگی بھی ہے۔ یہ نغمگی راشد انور کی خوبصورت شخصیت کے سبب پیدا ہوگئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ یہ کہیں کہرے میں ابھرتی پرچھائیں تو نہیں! یعنی انسان چلا جاتا ہے لیکن شاید اس کی پرچھائیں یادوں کی شکل میں آس پاس گھومتی پھرتی رہتی ہے۔ کہیں یہ پرچھائیں مجسم نہ ہوجائے، لیکن میرا تو کیا، ہم سب کا ایمان ہے، بقول راشد انور ؎

جو گیا لوٹ کے آیا ہی نہیں سرحد سے
اب کسے دشت میں آواز لگاتی ہے ہوا

جی چاہتا ہے کہ راشد انور نے اپنے یک موضوعی شعری مجموعے 'گیت سناتی ہے ہوا' کے پیش لفظ بعنوان 'اعتراف' میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے چند سطریں پیش کردوں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ انھوں نے اپنی تخلیقی حسیت کو فطرت کی کاریگری سے کس طرح ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ آسمان اور زمین کے درمیان جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کی قدرت کاملہ پر دال ہے۔ ہوا کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''کرۂ ارض کے گوشے گوشے میں ہوا اپنی موجودگی سے زندگی کی رمق بکھیرنے میں مصروف رہتی ہے۔ ہوا کا سرگم قدرتی مظاہر کو مخصوص رقص کے لیے مجبور کردیتا ہے۔ جب ہوا گیت سناتی ہے تو پھر ہر شے اس نغمے کو سننے میں محو ہوجاتی ہے کہ اس کا حیرت انگیز سُر ہمیں اپنے ہی باطن سے پھوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔'' (گیت سنناتی ہے ہوا، 2015، ص 26)

راشد انور راشد کا ذہن مرتب اور منضبط تھا۔ وہ شاعری بھی یک موضوعی کرنے پر قادر تھے۔ 'گیت سناتی ہے ہوا' کی نظمیں اور غزلیں دونوں، فطرت کی جلوہ سامانیوں کو ایک مرقع کی شکل میں پیش کرتی ہیں۔ اسی طرح 'کہرے میں ابھرتی پرچھائیاں' (2012) بھی عشقیہ مضامین کو محیط نظموں پر مشتمل ہے۔ اسے زبیر رضوی نے ایک عشقیہ اوپیرا سے موسوم کیا تھا۔ آج جب کہ شعری افق پر نثری نظموں جیسی اَدھ کچری شاعری کو بے جا طور پر چمکانے کی کوشش کی جارہی ہے، راشد انور کی پوری کتاب 'کہرے میں ابھرتی پرچھائیں' معرا کی ہیئت میں ہے، اس کا مطلب ہے کہ راشد انور ایک موزوں طبع ادیب تھے۔ 'شام ہوتے ہی' ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ تھا۔ 'گیت سناتی ہے ہوا' میں غزلیں بھی ہیں اور آزاد نظمیں بھی ہیں۔ جب وہ ممبئی ہاسپٹل میں تھے تو اکثر دوران گفتگو اس بات کا اعادہ کرتے کہ ایک مجموعہ کلام تیار ہوگیا ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد علی گڑھ میں اجرا کراؤں گا، آپ کو تشریف لانا ہوگا!'' میرا جواب ہوتا ''اللہ کرے آپ جلد صحت یاب ہوجائیں، کتاب چھپے گی اور اجرا بھی ہوگا اور میں ضرور آؤں گا، نہیں آنے کا کیا سوال ہے۔'' یہ بھی کہا کہ وارڈ نمبر 6 کے نام سے ایک فکشن ڈائری بھی لکھ رہا ہوں، اسے بھی چھپواؤں گا، وہ بہت پرجوش تھے اور شعر وادب کے تئیں ایسا Commitment کہ شاید و باید۔ وہ درس و تدریس کے پیشے میں لکھتے پڑھتے رہنے کو عبادت کا درجہ دیتے تھے جس کا ذکر انھوں نے پرورش لوح وقلم کے اعتراف میں کیا ہے۔ شعبۂ اردو علی گڑھ کے کئی احباب نے بتایا کہ وہ کلاس میں پڑھائے جانے والے موضوعات کی تیاری کرتے اور کوشش کرتے تھے کہ کوئی کتاب بھی اس حوالے سے آجائے۔ 'منتخب نظموں کا تجزیاتی مطالعہ' (2008) بھی ان کی ایسی ہی کتاب ہے۔ 'پرورش لوح وقلم' اور 'آثار لفظ' میں بھی طلبہ کے کام آنے والے بہت سے مضامین ہیں۔

آخر میں راشد انور کی ایک اور کتاب کا ذکر ضروری ہے جو کہ کچھ لوگوں کی نظر میں متنازعہ بھی رہی ہے۔ وہ ہے 'قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار' یہ کتاب قاضی صاحب سے کئی نشستوں میں کیے گئے انٹرویوز پر مبنی ہے۔ یہ ایک طرح کی سوانح عمری ہے۔ 2014 میں یہ کتاب جب تیار ہوگئی تو انھوں نے مجھے فون کیا کہ کوثر بھائی اس نوعیت کی ایک کتاب ہے، اس کا نام تجویز کیجیے۔ میں نے ایک گھنٹے کے بعد انھیں واٹس ایپ پر بتایا تو فون کرکے اپنی خوشی کا اظہار کیا کہ یہ تو مقفیٰ ہوگیا۔ قاضی صاحب کو بھی یہ نام پسند آیا، لیکن اس کتاب کی اشاعت کے بعد قاضی صاحب کی صاف گوئی اور بے باکی کی سزا راشد انور کو بھی ملی، جن لوگوں کے بارے میں قاضی صاحب نے کچھ ایسی باتیں کہی تھیں، جو ان کے خلاف تھیں تو اس کی زد میں راشد بھی آئے، علی گڑھ میں ایک ایسا حلقہ بھی تھا جو راشد انور سے اس کتاب کی اشاعت کے بعد قدرے دوری بنالی تھی، یعنی انھوں نے اپنی کتاب پرورش لوح و قلم (2008) میں انتساب کے طور پر لکھا تھا ''علی گڑھ کی خوشگوار ادبی فضا کے نام'' اب وہ خوشگوار فضا ان کے لیے قدرے تکدر آمیز ہونے لگی تھی، لیکن راشد انور اپنی دھن کے پکے فنکار اور تخلیق کار تھے، سفر جاری رکھا اور تقریباً 25 کتابیں منظر عام پر آئیں اور ان کا لکھنے پڑھنے کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ البتہ جب ان کا پروموشن پروفیسر شپ کے لیے نہیں ہوا تو کچھ دنوں پریشان رہے۔ میں نے انھیں کافی سمجھایا کہ پروفیسر ہوجانے سے شناخت نہیں بنتی، لکھنے پڑھنے سے ہی بنتی ہے اور آپ ماشاء اللہ اپنی شناخت کے محتاج نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنا یہ شعر پڑھا تھا:

یہ واقعہ ہے مگر میں بیان کیسے کروں
مرے ہی سائے نے مجھ پر اٹھا لیا پتھر

خیر، اب تو راشد انور کیا گئے، ایسا لگتا ہے، علی گڑھ شعبۂ اردو کا ایک باب بند ہوگیا۔ کیسی اداسی ہوگی ان کے شعبۂ اردو والے کمرے میں، سوچیے تو سہی۔ حالانکہ وہ کمرہ کافی دنوں سے منتظر رہا ہوگا کہ ممبئی سے میرا رفیق، میرا مکین آئے گا اور پھر یہاں شعر و ادب اور طلبہ سے رونق پیدا ہوگی۔ تو کیا، اس کمرے کو کسی نے بتادیا ہوگا کہ اب تمھارا دوست، تمھارا مکین لوٹ کر کے آنے والا نہیں؟ مجھے تو لگتا ہے جیسے ہی ممبئی میں راشد انور کی سانسوں کی ڈور ٹوٹی ہوگی، وہاں سے ایک ہوا کا جھونکا بے چینی کے عالم میں آناً فاناً علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں 7/اپریل کی صبح ساڑھے سات بجے ہی آکر اس کمرے کے پاس اداس کھڑا ہوگیا ہوگا۔ دروازے نے پوچھا بھی نہیں ہوگا، بلکہ ان مجرد اشیا میں کبھی کبھی احساسات کی شدت ہم انسانوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ یوں بھی 'گیت سناتی ہے ہوا' سے بھی لگتا ہے کہ راشد نے اپنا قاصد پہلے ہی ڈھونڈ کے رکھ لیا تھا۔ کیسا حساس تھا راشد انور! کہہ گیا ہے:

سبھی کو آنا ہے اک دن تری پناہوں میں
کسی بھی لمحے نہ آیا خیال اے مٹی

■

Prof. Kausar Mazhari
Dept of Urdu,
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.:9818718524
kausmaz@gmail.com

انتخاب کلام

راشد انور راشد

گلشن میں ہوا کیا کہ ہیں سہمے ہوئے پتے
ہر سمت ملے قدموں سے روندے ہوئے پتے
آتی ہے خزاں جب تو بدل جاتا ہے موسم
اب کے تو بہاروں میں ہی پیلے ہوئے پتے
جنگل کی ہوا ساتھ اڑا لے گئی ورنہ
جاتے بھی کہاں شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے
ہیں خوف زدہ ایسے کہ سرگوشی ہوا کی
سنتے ہی لرز اٹھتے ہیں سوکھے ہوئے پتے

✪

اگرچہ میرے سفینے سے تھا خفا دریا
مگر ڈبونے میں ناکام ہی رہا دریا
وہ خوف ناک سی موجیں تو بدگمان رہیں
مگر بڑھاتا رہا میرا حوصلہ دریا
میں بوند بوند کا پیاسا تھا اس نے دیکھ لیا
مرے قدم جو بڑھے ساتھ چل پڑا دریا
سبھی نے اپنے ارادوں میں نظر ثانی کی
نظر کے سامنے حائل تھا آگ کا دریا
عصا نے اب کے کرشمہ عجیب دکھلایا
ذرا سی ضرب سے صحرا بھی بن گیا دریا
مقابلے میں تو بپھرا ہوا سمندر تھا
جو فتح یاب ہوا وہ تھا عشق کا دریا
جو متصل تھے علاقے وہ کیوں ہیں سوکھے ہوئے
اس اک سوال سے ناراض ہوگیا دریا

✪

رنگ اب ہر پل بدلتا جا رہا ہے آسماں
اے زمیں والو سنبھل جاؤ خفا ہے آسماں
پاؤں کے نیچے سرکتی جا رہی ہے کوئی شے
سر کے اوپر دفعتاً کھونے لگا ہے آسماں
میری ہر کاوش پہ حیراں ہے نہ جانے کس لیے
ہر گھڑی پہلو بدل کر دیکھتا ہے آسماں
ریزہ ریزہ میں بکھرتا جا رہا ہوں ہر طرف
درد میرا دیکھ کر رونے لگا ہے آسماں
کون ہے زد میں کہ مصروفِ عبادت ہے زمیں
گڑگڑا کر کیوں دعائیں کر رہا ہے آسماں
چاندنی راتوں میں اس کا قرب حاصل تھا مگر
کوندتی ہیں بجلیاں اب چیختا ہے آسماں
یہ زمیں انجان ہے مجھ سے تو کوئی غم نہیں
مطمئن ہوں میں کہ مجھ کو جانتا ہے آسماں

شام کی اڑان

شام کے سرمئی اندھیرے میں
اک پرندہ اڑان بھرتا ہے
چاہتا ہے کسی کا ساتھ ملے
رات کی بے قراریوں کا عذاب
یاد کرکے وہ کانپ اٹھتا ہے
اس لیے شام کے دھندلکے میں
گھونسلے کو وہ چھوڑ دیتا ہے
اور مسلسل سفر میں رہتا ہے
لیکن اس کا سفر سدا کی طرح
تشنگی کا عذاب سہتا ہے

زمیں کی فریاد

جہاں پہ سبز چادر کی حکومت تھی
جہاں پہ لہلہاتی، جھومتی گاتی ہوئی
فصلوں کی رعنائی
نگاہوں میں عجب سا نور بھرتی تھی
وہاں اب دور تک پسرا پڑا ہے
ایک ہیبت ناک سناٹا
زمیں کے لب، بہت سوکھے ہوئے ہیں
جا بجا اب چاک ہوتا جا رہا ہے
خوب صورت سی زمیں کا پیرہن
اب پیاس بڑھتی جا رہی ہے
اس زمیں کی پیاس اب
ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے
آسماں خاموش ہے
لیکن زمیں فریاد کرتی ہے
پرانے موسموں کی ہر عنایت کو
بہت حسرت سے دل میں یاد کرتی ہے

✪

نظر سے دور رہے مجھ کو آزمائے بھی
اگر وہ وقت نہیں ہے تو لوٹ آئے بھی
ہے آبشار تو احساس کو کرے سیراب
وہ پیاس ہے تو مری تشنگی بڑھائے بھی
وہ موج ہے تو مجھے غرق بھی ضرور کرے
ہے ناخدا تو بھنور سے نکال لائے بھی
وہ خواب ہے تو کرے بس قیام آنکھوں میں
اگر ہے خوف تو نیندیں مری اڑائے بھی
وہ مسئلہ ہے تو میری جبیں پہ روشن ہو
وہ کوئی حل ہے تو دل کو قرار آئے بھی
اگر وہ اور کوئی ہے تو کوئی بات نہیں
ہے زندگی تو اندھیروں میں گنگنائے بھی

✪

بس ایک بار ترا عکس جھلملایا تھا
پھر اس کے بعد مرا جسم تھا نہ سایہ تھا
شدید نیند کا غلبہ تھا کچھ پتہ نہ چلا
کہ اتنی رات گئے کون ملنے آیا تھا
خیال آتے ہی اک ٹیس سی ابھرتی ہے
ملال آج بھی ہے تیرا دل دکھایا تھا
مجھے پتہ تھا دریچے سے رات جھانکے گی
اسی خیال سے میں چاند لے کے آیا تھا
بدل گئے تھے مناظر پلک جھپکتے ہی
مرا جنون بس اک بار رنگ لایا تھا
تم آ گئے ہو تو لگتا ہے آج سے پہلے
مری حیات پہ اک بد دعا کا سایہ تھا

■

خان محمد رضوان

راشد انور راشد کا شعری ارتکاز

بحیثیت تخلیق کار راشد انور راشد کی شخصیت متنوع پہلو سے مملو ہے۔ وہ بیک وقت شاعر، نقاد اور مترجم کی حیثیت سے اپنی شناخت مستحکم کر چکے ہیں، باوجود اس کے ان کی اصل پہچان بطور شاعر ہی ہے۔ جب کہ عموماً تخلیق کار تخلیقیت کی تکثیریت میں گم ہو کر اپنی پہنچان نہیں بنا پاتے ہیں مگر راشد انور راشد کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ادب میں کمیت و کیفیت کا مسئلہ بہت زیادہ اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ اصل مسئلہ تخلیق کار کے جبلی اور ادراکی پہلو کا ہوتا ہے۔ شعری اصول وضوابط کے دائرے میں بطور شاعر محاکمہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی غزلیہ شاعری کا رنگ نظمیہ شاعری کے بالمقابل جدا ہے۔ نظموں کے مقابلے میں ان کی غزلوں کی تاثیر، رویہ، آہنگ اور اسلوب زیادہ پر اثر ہے۔ اس لیے میں انھیں جدید غزل گو شعرا میں اپنی نوعیت کا عمدہ اور منفرد شاعر تسلیم گردانتا ہوں۔ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ تخلیق کار کو ہمہ جہت ہونا چاہے۔ میرا ماننا ہے کہ تخلیق کار کی ذات علمی اور فکری لحاظ سے پہلودار ہونی چاہیے۔ مگر ہمہ پہلو شخصیت ہوتے ہوئے یک صنفی ہونا بہتر ہے کیونکہ اس طور پر اس کی تخلیق اور شخصیت دونوں کا اعتراف بہتر صورت میں ممکن ہو سکے گا۔ اس امر کی روشنی میں جب ہم راشد انور راشد کی غزلوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی ان کہی کہانی کے طور پر صنف غزل گوئی میں ندرت حاصل کی اور بیشتر مقامات پر ندرت اسلوب اور پر شکوہ بیانیہ کے ذریعے اپنے آپ کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کیوں کہ غزل کم لفظوں میں اپنے اظہار کی فصاحت وبلاغت کا خوبصورت ذریعہ ہے اور نظم اپنے متعینہ موضوع کا احاطہ ہے۔ اس کے سہارے احساسات و جذبات کے غیر مختتم سیلاب اور لامتناہی احساسات کو پرونا آسان ہوتا ہے۔ اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر بطور نمونہ چند شعر پیش کرتا ہوں۔

ہم کو پتھر کے پگھلنے کا عمل دیکھنا ہے
ڈوبتے ڈوبتے آواز لگائیں گے تمھیں

وہ مسئلہ ہے تو میری جبیں پہ روشن ہو
وہ کوئی حل ہے تو دل کو قرار آئے بھی

پرندے آشیانوں سے پناہیں مانگا کرتے ہیں
بدلنے لگتا ہے آنکھوں کا منظر شام ہوتے ہی

بس ایک بار ترا عکس جھلملایا تھا
پھر اس کے بعد مرا جسم تھا نہ سایہ تھا

بڑے ہی شوق سے اک آشیاں بنایا تھا
میں کیسے دیکھوں اسے ٹوٹتے بکھرتے ہوئے

خواہشیں چاک پہ رکھی ہیں کہ صورت ابھرے
گرد کے ساتھ ملی ہے مرے ارمان میں خاک

کبھی تو شاخِ تعلق میں پھول آئیں گے
کبھی تو سرد بدن کو لہو پکارے گا

آہ و زاری چھوڑ اپنی ذات سے باہر نکل
قہقہے کی گونج بن کر آسمان پر پھیل جا

پاؤں کے نیچے سرکتی جا رہی ہے کوئی شے
سر کے اوپر دفعتاً گرنے لگا ہے آسماں

متذکرہ بالا اشعار کی روشنی میں بخوبی یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ راشد انور راشد کا شعری کینوس زندگی کے مسائل اور واقعات وحوادث پر محیط ہے۔ ان کا اظہار یہ انداز حقیقت پسندانہ ہے، وہ اپنے باطن کے نہاں خانے میں ڈوب کر کربِ جاں کا انکشاف عارفانہ لہجے میں کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی بیشتر غزلوں کی قرآت کے وقت نظموں جیسی مانوس خوشبو، خیالات کا تسلسل اور موضوع کی تہہ داری کا ادراک بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ان کا سبک لہجہ اور لفظوں کا برتاؤ باطن کی پیچیدگیوں اور روح کی اذیت ناکیوں سے عبارت ہے۔

راشد انور راشد کا حسّی ادراک بلا کا ہے۔ یہ ادراک کا ملکہ انہیں حقیقت پسندی اور حق شناسی کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ ان کی غزلوں میں خود پسندی، خدا پسندی اور مناظر فطرت و قدرت کے کئی عکس نمودار ہوتے ہیں۔ جب کہ ان کے بیشتر ہم عصروں میں اس کا واضح اظہار نظموں میں بہتر صورت میں ہوا ہے، مگر راشد انور راشد کی غزلوں میں اس کا برتاؤ بڑی خوبصورتی، دلکشی، دلربائی اور خوبی کے ساتھ ہوا ہے۔ جسے ہم جدید شاعری کا عملی تجربہ کہہ سکتے ہیں۔ ان کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ ان کے یہاں خیالات کا ایک انبوہ دست بستہ بیعت کیے ہوئے نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی شاعر کی زمین خشک نہ ہو، اس کا لہجہ ناہموار نہ ہو، خیالات میں تنوع پایا جاتا ہو افکار کی دنیا وسیع ہو اور اسلوب کی نیرنگی اس کی غلام ہو تب جا کر اس کا بیانیہ سبک روی کے ساتھ آگے بڑھتا جاتا ہے اور اپنے اظہار کی قوت سے نیرنگِ اسلوب کے ساتھ اشعار گل بوٹے کی مانند نوک قلم سے نکلتے جاتے ہیں۔ راشد انور راشد کی پوری شاعری پڑھ جائیے آپ کو کہیں بھی یہ احساس نہیں ہو گا کہ ان کے تخلیقی عمل اور ان کے افکار و خیالات میں کسی بھی قسم کا تنافر در آیا ہے۔ جب کہ ایسا بہت ہی کم شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ جب کہ اکثر نئے شعرا کے یہاں خیالات کی دولختی اور فکری تنافر کثرت سے دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ مگر راشد انور راشد کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے یہاں لفظوں کا برتاؤ خیالات کے

مطابق من وعن خوبصورتی کے ساتھ ہوا ہے۔ یہ خوبی جب کسی شاعر کے اندر پیدا ہو جاتی ہے تو یہ سمجھا جانا چاہیے کہ وہ مکمل شاعر ہونے کے امکانی مدارج کو پہنچ چکا ہے۔ لفظوں کا ٹریٹمنٹ ہی شعر کو شعر بناتا ہے اور اسے جمالیاتی کیفیت سے مہمیز بھی کرتا ہے۔

اب کبھی لوٹ کے شاید وہ نہیں آئے گا
تھک گئی آنکھ مری دیکھ کے اس کا رستہ

سارے اداس چہروں پہ آنے لگا نکھار
جو بھی غبارِ درد تھا سب دھوگئی ہے شام

شاداب ہم لہو سے کریں گے اسے مگر
اپنے تمام وعدوں کو بھولی ہوئی ہے ریت

سبھی نے فتح کیا باہری سمندر کو
کوئی تو پار نہ کرپایا اندروں کی ندی

رقص جاری ہے امنگوں کا دیارِ دل میں
اب بھی محفوظ ہیں خوش رنگ خیالوں کے گلاب

راشد انور راشد جس عہد سے تعلق رکھتے ہیں اس میں اچھے شعرا کی کمی نہیں ہے۔ ایک سے ایک بوتے کے شاعر موجود ہیں، بلکہ بیشتر ایسے باصلاحیت شعرا ہیں جن کے اندر نمو پذیری کی کیفیت اس قدر بڑھی ہوئی ہے جس کی وجہ سے یہ طے کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان میں سے کون سب سے اچھا شاعر ہے، لامحالہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ سبھی اچھے اور باکمال شاعر ہیں۔ اس عہد کے شعرا کا فکری، فنی، تخلیقی اور تخیلاتی دائرہ بے حد وسیع ہے، ان کے لہجے کی انفرادیت ہی ان کا اپنا شناخت نامہ ہے، خیالات کی ندرت ان کا امتیاز ہے، ان کی متخیلہ زمین سرسبز و شاداب ہے، ان کے یہاں موضوعات کا تنوع اس قدر بلیغ طور ہوا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اور ان کا شعری منطقہ سورج کے گرد سرمئی ہالے کی مانند ابھرا ہوا ہے جو اپنے وجود کے ساتھ افق آسمان کو بھی منور کر رہا ہوتا ہے۔ انہی جدت پسند شعرا کے وسیلے سے نئے عہد کے مضمرات کو مسخر کرنا دورِ نو کے تخلیق کار کے لیے آسان ہوگیا ہے۔ جدید عہد کے جدید تصورات و نظریات کی تہیں اس طرح وا ہوتی جارہی ہیں جیسے معجزاتی یا کشف و کراماتی عمل کا دخل ہو۔ اس لیے ہم کسی طور پر راشد انور راشد کے ہمعصروں کی صفات اور خصوصیاتِ جمیلہ سے روگردانی نہیں کر سکتے ہیں، کیوں کہ اس عہد کے شعرا نے اپنا محاسبہ اپنے ماقبل اور مابعد کے فکری و نظریاتی اساسی پہلوؤں کے تناظر میں کرتے ہوئے عہد جدید اور مابعد جدید عہد کے تعبیراتی جہان کا ایسا گوشوارہ تیار کیا ہے جس کی نظیر بمشکل ہی پیش کی جاسکتی ہے۔ ہمارے عہد کی نسل جس ہیجان اور ذہنی و فکری نارسائی میں مبتلا ہے وہ راشد کے ہمعصروں کے یہاں نہیں ہے، بلکہ انھوں نے تو ہیجان کی دنیا سے باہر لاکر استعجاب کی دنیا کی سیر کرائی۔ کم و بیش یہی صورت حال ان کی نظمیہ شاعری کی بھی ہے۔ ان کی نظموں میں بھی غزلوں کی ہی طرح جذب و انجذاب کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ عصری حسیت اور داخلی کرب کا اظہار دونوں جگہوں پر ہوا ہے۔ غزلوں کی ہی طرح ان کی نظموں میں خود سپردگی اور فنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ بے خودی، محویت اور استغراق وجودیت کی سرشاری کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہاں ایک خالص کیفیت والی نظم پیش کرتا ہوں دیکھیے شاعر نے کس خوبی کے ساتھ ایک کیفیت کو برتنے کی کوشش کی ہے ملاحظہ کریں۔

رات کی دستک سنتے ہی/اک خوف و ہراس / گھر کے در و دیوار سے / ظاہر ہوتا ہے /جب سے اس کی کوٹھی میں / خوابوں کی نیلامی جاری ہے / گہرے سناٹے /سرگوشی کرتے ہیں/ خوابوں کے اندیشے پلتے ہیں

راشد انور راشد کے یہاں جا بجا طور پر عقدہ لانیحل کی جانب جست لگانے کی حوصلہ افزا سعی کا پتا ملتا ہے۔ اس طرح کا انفعالی سراغ انہی شاعروں کے یہاں ملتا ہے جن کے اندر اعتراف ذات و کائنات کی شعوری اور لاشعوری کیفیت دونوں جگہوں پر پائی جاتی ہے۔ اس کا احساس ہمیں ان کی نظموں کے منفرد عنوانات اور پر کیف کیفیت سے بھی ہوتا ہے۔ کیوں کہ فطرت کا اعتراف اور احساس جتنا مشکل ہے اس کا اظہار بھی ناممکنات میں سے ہے، مگر انھوں نے بے حد آسانی اور خوبی کے ساتھ اس معرکے کو بھی سر کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ راشد انور راشد کی نظموں میں مناظر قدرت کا اظہار اعتراف سے کہیں زیادہ پر اثر انداز میں ہوا ہے، ان کے یہاں نظموں کا حسی پہلو قابل دید ہے۔ وجہ یہ کہ ان کی نظموں میں حسی سیاق نہ صرف منفرد بلکہ ندرت خیال اور کیفیت جمال سے مملو ہو کر ہوا ہے۔ اس پہلو سے وہ اپنے ہمعصروں سے کہیں آگے ہیں۔ کیوں کہ تغیر و تبدل کی حسیات کا مطالعہ جمالیاتی پہلوؤں کو مد نظر رکھ کر کیا جائے تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کا ادراک غیر محصوری ہے۔ اور یہ صفت ایک جینوئن فنکار کی ہوتی ہے۔

یہاں میں ایک مختصر نظم نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں ملاحظہ کریں۔

بجلیوں کے شور سے / ذہنوں میں دہشت کی لکیریں/ یوں ابھرتی ہیں/ کہ جیسے ایک لمحے میں وہی دل دوز منظر / سب کی آنکھوں میں سمائے گا/ مسلسل بارشوں کا قہر جاری ہے /یوں لگتا ہے /وہی پچھلے برس کا واقعہ / اس سال بھی ویران آنکھوں کو مسلسل خون کے آنسو رلائے گا

راشد انور راشد کے یہاں نظم اور غزل دونوں طرح کی شاعری میں جذبے اور احساس کا بڑا دخل ہے۔ ان کی شاعری اجتماعی حافظے یا عمومی حسیات کا میزان نہیں معلوم ہوتی ہے بلکہ احساس کے ایک ایسے دھارے سے جڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے جس کا ادراک کم ہی لوگوں کو ہو پاتا ہے۔ ان کی پوری شاعری میں ایک خاص نوع کی کیفیت کا اظہار ہوا ہے۔ جس کو سمجھنے کے لیے صرف انسان ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ حساس اور زود حس انسان ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ ان کے یہاں جذبہ و احساس کا اظہار جس برملا انداز میں ہوا ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ شاعری عقل کی کم جذبے کی اونچ زیادہ ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ ان کی ذاتی زندگی کا برتاؤ اور سلوک بھی یہی تھا، وہ جب کسی سے ملتے تو ہنستے، مسکراتے اور پرجوش انداز سے پیش رفت کرتے، جب ہم ان کی زندگی اور ان کے تخلیقی سرمائے کا تطابق کرتے ہیں تو یہ احساس جاگزیں ہوتا ہے کہ ان کی زندگی اور تخلیقی سفر ایک دوسرے کے حریف نہیں ہیں، بلکہ مطابق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پوری شاعری میں حیات انسانیت کی حقیقتوں کا عکس نیرنگ انداز سے بکھرا پڑا ہے اور قدرت کی لازوال حقیقتوں کا اظہار مناظر فطرت کی مختلف النوع رنگوں کو بروئے کار لاکر کیا گیا ہے۔

راشد انور راشد جیسا بانکا شاعر آج ہمارے درمیان نہیں، قدرت نے اس شاعر کو گرچہ بہت کم مہلت عطا کی لیکن ادب میں اس کی بہتر سی مثالیں ملتی ہیں کہ پچیس تیس سال کی فنی ریاضت کے بعد درجنوں فنکار ادبیات عالم میں ایسے ملتے ہیں جنھوں نے اپنا ایسا نقش چھوڑا کہ آج بھی دھندلا نہیں ہو پایا، نام لینے کی ضرورت نہیں محض انگریزی، اردو اور ہندی میں درجن بھر سے زیادہ فنکاروں کی بات کی جاسکتی ہے، جنھوں نے اپنی قلیل عمر میں اپنے فن پاروں کے ذریعے لازمی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ راشد انور راشد کو بھی ہم بلا تردد اسی زمرے کی ایک کڑی کے طور پر لے سکتے ہیں۔ آج راشد انور جسمانی طور پر روپوش ہو چکے ہیں، لیکن ان کی تخلیقات ابھی بھی روشن، تابندہ اور زندہ ہیں، اور آنے والے وقتوں میں بھی زندہ جاوید رہیں گی۔

■

Dr khan Mohd Rizwan
D-307, M.M.I.P
Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar
New Delhi-110025
Mob: 9810862283
khanrizwan1990@gmail.com

نفسیاتِ جنوں

عبیدہ زمان

دماغی خلل کی تاریخ
(The History of Mental Disarders)

غیر معتدل دماغی مظاہر کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس کا ذکر مشرق اور مغرب کی انتہائی قدیم کتابوں میں بھی موجود ہے۔ عہد نامہ قدیم میں سوال (Saul) پر ارواح خبیثہ کے تسلط کے دوران متواتر افسردگی کے دورے پڑنے کا ذکر ہے، نیز بخت نصر کے ان ہذیانی دوروں کا ذکر بھی ملتا ہے جن میں وہ یہ یقین کر لیتا تھا کہ وہ جانور ہوگیا ہے، وہ بیل کی طرح گھاس کھاتا ہے، اس کا جسم جنت کی شبنم سے بھیگ گیا ہے یہاں تک کہ اس کے بال بڑھتے بڑھتے فرشتوں کے پروں کی طرح اور ناخون چڑیوں کے پنجوں کی طرح ہوگئے ہیں۔ مغرب کو دیکھیے تو ہومر (Homar) کے یہاں پاگل پن کا ذکر اکثر و بیشتر ملتا ہے مثلاً اجاکس (Ajax) کا ذکر ہے جس کو انتقام کی دیویوں نے اتنی اذیت دی کہ وہ اپنی ہی تلوار پر گر پڑا۔ یا یولیسس (Ulysses) کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جس نے ٹروجن (Trojan) کی جنگ میں اپنی عدم شرکت کو حق بجانب قرار دینے کے لیے بناوٹی جنون اختیار کرلیا تھا۔ اسی طرح ہاتف کی مشہور پیشین گوئیوں کو سراسر دھوکہ قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ کسی حد تک ان کی تشریح ہسٹیر یا کی ان علامات کے طور پر کی جاسکتی ہے جو عہد حاضر میں بھی معمول میں دیکھنے میں آتی ہیں۔

بنیادی طور پر انسانی ذہن تشریح و توجیہ کا متقاضی واقع ہوا ہے اسی لیے غیر معتدل مظاہر کے ساتھ ساتھ ہمیں ان کی تشریح کی کوشش بھی برابر ملتی ہے۔ جنون کی تاریخ میں ہر عہد کے معلومات و تصورات کے مطابق ان کوششوں کے تقاضے برابر محسوس کیے گئے ہیں۔ دیوانگی کے سلسلے میں اس قسم کی مختلف کوششوں کو ہم جنون سے متعلق نظریات کے نام سے موسوم کریں گے اور موجودہ باب کا مقصد بھی یہی ہے کہ ان نظریات کے تاریخی ارتقا کا سراغ لگاتے ہوئے ہم دیوانگی کے متعلق اس موجودہ نظریے تک رسائی حاصل کرلیں جو اس کتاب کا مجموعی طور پر مدعا ہے۔

دیوانگی کے سلسلے میں زمانہ قدیم کی یادداشتوں میں پائے جانے والے متذکرہ بالا نظریات کو 'عفریتی' نظریہ (Demonological) کہہ سکتے ہیں۔ اس کے مطابق اس قسم کے مظاہر کسی روحانی وجود کے زیر اثر خواہ وہ دیوتا ہو یا شیطان وقوع پذیر ہوتے تھے جو کبھی تو انسان کے جسم میں سکونت ہی اختیار کرلیتا ہے اور کبھی باہر رہ کر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر یہ مظاہر اپنے زمانے کے مذہبی خیالات کے مطابق ہوتے ہیں تو یہ طے پاتا ہے کہ قابض روح نیک و شریف ہے اور پھر ایسے شخص کو بہت مقدس تصور کیا جاتا لیکن اگر ایسے شخص کے اطوار مروجہ اخلاقی اصولوں کے منافی ہوئے تو اس کو کسی خبیث عفریت کا شکار سمجھا جاتا ہے۔ جب تک اس نظریہ کو قبول عام حاصل رہا اس وقت تک فطرتاً مذہبی رسومات اور منتر جنتر کا رواج واحد ذریعہ علاج کے طور پر باقی رہا۔

بہر کیف ہپوکریٹس (Hippocrates) کی آمد کے ساتھ ہی یعنی تقریباً 460 قبل مسیح کے آس پاس یونان میں دیوانگی کے نظریہ میں بنیادی تبدیلی واقع ہوئی۔ بانیِ طب (Hippocrates) ہپوکریٹس نے یہ اصول پیش کیا کہ بھیجا دماغ کا آلہ ہے اور اسی عضو میں پیدا ہونے والی کسی خرابی کی وجہ سے پاگل پن پیدا ہوجاتا ہے۔ اس نے اپنے مریضوں کو (Aesculapius) اسکولپیس مندر سے باہر نکالا اور ان کا علاج عام طبی اصول کے مطابق کرنا شروع کیا۔

اس نظریہ کو جس نے پہلی بار سائنسی طریقوں کی مدد سے دیوانگی کو دفع کرنے کی کوشش کی، اپنے زمانہ میں بارآور ہونا نصیب نہ ہوا بلکہ 'ایام جاہلیت' (Darkeages) کے ذہنی جمود میں تو سرے سے اس کا وجود ہی باقی نہ رہا۔

زمانۂ وسطیٰ کے یورپ میں فکر، ادب اور فن سب ایک طاقت ور کلیسا کے خدمت گزار ہوگئے تھے۔ وجہ یہ ہوئی کہ فلسفہ کی جگہ مسلک کلامی کو (Scholashicism) اور سائنس کی جگہ تصوف کو دے دی گئی تھی۔

دیوانگی کی ماہیت اور اسباب سے متعلق مروجہ نظریات قدرتی طور پر پلٹا کھا کر ایک بار پھر قدیم عفریتی نظریہ کی طرف لوٹ گئے اور یہ نظریہ کہ غیر متوازن ذہنی علامات کسی نیک یا بد مافوق الفطرت ذریعہ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، دوبارہ سر اٹھانے لگا بلکہ ازمنہ وسطیٰ میں تو یہ خیال اپنی ترقی کی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔

اس زمانے میں پھلنے پھولنے والے درویشوں اور مجذوبوں کے یہاں نظر آنے والی وہ علامتیں جو بے خودی یا وجدانی کیفیتوں کے نام سے موسوم تھیں، آج کے ذہنی مریضوں میں لگاتار دیکھنے میں آتی ہیں حالانکہ ازمنہ وسطیٰ کے مروجہ عقائد کے ماتحت ان کو براہ راست دیوتا سے اتصال کا نتیجہ کہا جاتا تھا اور ایسے لوگوں کی بڑی تعظیم و تکریم ہوتی تھی۔

دماغی خلل کی مختلف صورتوں کی طبقہ بندی کالے جادو کے نام سے کردی گئی تھی۔ وسطی زمانے میں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی، کالے جادو کا عہد تاریخ انسانی کا انتہائی دلچسپ باب ہے اور آج بھی حل طلب مسائل سے بھرا پڑا ہے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ کالے جادو، سبت (Sabath) اور بھوت پریت سے متعلق تقریبات اور رسم و رواج، یورپ کے ماقبل تاریخ والے مذہب یعنی اساطیری جرمن مذہب کی پس ماندہ یادگاریں ہیں جنھوں نے ایک مسلک کی شکل اختیار کرلیا اور اصل مذہب کے متوازی چلتے رہے۔ اس طرح کے مسلک اب بھی خصوصیت کے ساتھ دماغی طور پر کمزور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیتے ہیں، جادوگروں کے اس گروہ میں سے بہتیرے اگر آج پاگل اور خبطی قرار دیے جائیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہ ہوگی، کچھ مخصوص علامات جن کو آج ڈاکٹر ہسٹیر یا کی علامتیں مانتے ہیں۔ پہلے جادوگروں کی نشانیاں سمجھی جاتی تھیں اور ایسی کسی عورت یا مرد کے جادوگر ہونے میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی تھی جس میں یہ علامتیں موجود ہوتی تھیں۔ ان نشانیوں میں سے ایک 'شیطانی پنجہ' کے نام سے موسوم تھی۔ اس میں

آسیبی شخص کے جسم کا کوئی حصہ بے حس ہوجاتا تھا۔ آج اس کو جدید ہسپتالوں میں 'ہسٹیریا کی بے حسی' کے نام سے جانا جاتا ہے، کسی جادوگر کی روبکاری کے لیے طریقہ کار کا تعین اس بے حس حصہ کے وجود اور چند مزید نرالے تجربات کی مدد سے ہوجاتا تھا۔ ان خوفناک اداروں کو یورپ میں بڑا فروغ اور استحکام حاصل ہوا، ان کا وجود اٹھارویں صدی تک قائم رہا۔ اس کی شدت کا اندازہ ہم کو اس حقیقت سے ہوسکتا ہے کہ صرف ٹریوز (Treves) کے علاقہ میں چھ ہزار پانچ سولوگوں کو کالے جادو کے الزام میں پھانسی پر چڑھایا گیا۔

دماغی خلل کی کچھ ایسی صورتوں کو جنھیں کالے جادو یا مقدس روحانی اثرات کی طرف منسوب کرنا ممکن نہیں ہوتا تھا، شیطانی آسیب قرار دے لیا جاتا تھا اور ایسے بدنصیب لوگوں پر بھوت پریت اتارنے کے تمام طریقے آزمائے جاتے اور اگر یہ طریقے کارگر نہ ہوتے تو ان کو قید خانہ میں ڈال دیا جاتا یا سوسائٹی سے خارج کردیا جاتا تھا۔

اس پریشان کن صورت حال کی اصطلاح سائنس اور انسان دوستی جیسے فلاحی خیالات کی ترقی کی وجہ سے ممکن ہوسکی۔ سائنس جس نے انسان کے علم و دانش میں انقلاب برپا کردیا تھا۔ ابتدا میں صرف مادی دنیا کی تحقیق میں لگی تھی، لیکن اس کے رائج کردہ معروضی طریقہ کار سے دور رس نتائج بھی متوقع تھے۔ مسلک کلامی (Scholasticism) کے زوال کے ساتھ ہی پاگل پن کے سلسلے میں 'عفریتی نظریہ' کا بھی خاتمہ ہوگیا اور بالآخر ماڈرن یورپ اس مقام تک پہنچ سکا جہاں ہپوکریٹس ہزار سال سے بھی پہلے پہنچ چکا تھا۔ مختلف ذہنی کیفیات کا سبب ان اعمال کو بتایا گیا جو بھیجے میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں اور یہ اصول مقرر کیا گیا کہ دیوانگی اس طرح کی ایک دماغی بیماری ہے، جیسے کہ نمونیا پھیپھڑوں کی بیماری مانی جاتی ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل ہی میں دماغی خلل کے سلسلہ میں عضویاتی اسباب کا تصور پختگی سے قدم جماتا نظر آنے لگا تھا۔

اس کے بعد جو عبوری دور آیا اس کو ہم سیاسی دور کہہ سکتے ہیں۔ اس میں باوجودیکہ دماغی امراض کے مریضوں کو شیطان کی ملکیت نہیں سمجھا جاتا تھا پھر بھی ان کی سماجی حیثیت صفر کے برابر تھی۔ سوسائٹی کا صرف اتنا فرض سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایسے افراد کی ایذا سے سماج کے اور لوگوں کو محفوظ رکھے، یہ زمانہ قید و بند اور ہتھکڑیوں کا زمانہ تھا، لوگ گندگی میں ڈوبے ہوئے ایسے تنگ و تاریک خوفناک سنگی قید خانوں میں خس و خاشاک کے بستروں پر جن کو شاید ہی کبھی تبدیل کیا جاتا تھا اور جن کی وجہ سے چھوت کی بیماریوں کا خطرہ ہر وقت لاحق رہتا ڈال دیے جاتے تھے، جہاں جنگلی جانوروں کو رکھنے میں بھی تامل ہوتا، اور وہ ان عادی مجرموں کے رحم و کرم پر ہوتے تھے جن کے ذمہ ان کی دیکھ بھال ہوتی تھی اور یہ بدبخت مریض غلاموں کی طرح زنجیروں سے جکڑ دیے جاتے تھے۔''

اس عہد کے خیرات خانوں کی دردناک تصویر کشی جس طرح ہوگرتھ نے کی تھی، قلم اس کے بیان سے قاصر ہے۔

دیوانگی کے سلسلے میں انسانی ہمدردی کا سب سے پہلا قدم اٹھانے کا شرف انگلستان کو حاصل ہوا جب کہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں سینٹ لیوک کی اصطلاحات لندن میں نافذ ہوئیں اور یورک میں پناہ گاہ کا قیام عمل میں آیا، یہ وہ سنجیدہ کوششیں ہیں جن کے ذریعہ پاگلوں کے مادی ماحول کو بہتر بنانے کی حقیقی جدوجہد کی گئی۔ ہنیول (Hanwell) کے ڈاکٹر کونیلی (Dr. Conally) نے زنجیروں کا طریقہ ختم کروایا جو اب تک پاگل خانوں کے لوازم میں شامل تھا۔ اسی قسم کی اصلاحات فرانس میں پینل اور اسکورل کی قیادت میں کیے گئے اور اس وقت سے انسانی ہمدردی کی یہ مہم روزافزوں ترقی کرتی گئی۔ اب تمام دنیا اس کو تسلیم کرتی ہے کہ انسانی سلوک پاگلوں کا بھی حق ہے۔ آج کے پاگل خانوں کی صورت حال بدل چکی ہے اور وہ راحت رسانی اور حسن انتظام کا نمونہ ہیں۔ نظم و نسق اور برتاؤ کی اس تبدیلی میں ہر ہر قدم پر سائنس نے ساتھ دیا ہے۔ سائنٹفک طریقوں سے کام لینے سے بہت سے عملی میدانوں میں جو خاطر خواہ معلومات حاصل ہورہی تھیں ان کی افادیت کو دیکھتے ہوئے اٹھارویں صدی میں یہ خیال زور پکڑنے لگا کہ جنون کا بھی سائنسی بنیادوں پر مطالعہ کیا جائے۔ اسی سلسلے میں سائنس کی ایک شاخ نے جس کو معالجات نفسی (سائیکیٹری) کہا جاتا ہے گزشتہ سو سال میں نمایاں ترقی کی ہے اور معلومات کا قابل لحاظ ذخیرہ اکٹھا ہوا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی کے شروع میں عضویاتی نظریہ کو ساری دنیا میں تسلیم کیا جانے لگا تھا اور تحقیقات میں بھیجے کی بناوٹ اور اس کی تشریح کو مرکزی اہمیت حاصل ہوچکی تھی، اس سلسلے میں معلومات میں غیر معمولی سرعت سے اضافہ ہوا۔ خوردبین کی مدد سے بھیجے کی ساخت کی وضاحت مع جزئیات کے کی گئی۔ دماغ کی عضویاتی تشریح میں تجرباتی طریقوں کے استعمال سے اور بھی اچھی پیش رفت ہوئی۔ اس ضمن میں قابل ذکر وہ دریافت ہے جس کے مطابق دماغ کے مختلف حصے بتائے گئے ہیں اور یہ کہ ہر حصے پر کسی خاص جسمانی فعل کا دارو مدار ہے۔ مثلاً سر اور جسم کی تمام حرکات و سکنات بھیجے کے اس حصے کے تابع ہیں جو حرکی خطہ (Mortar Area) کہلاتا ہے، اگر اس کا کچھ حصہ بیکار ہوجائے تو متعلقہ جسمانی حصہ فوری طور پر مفلوج ہوجاتا ہے۔

ان معلومات نے بڑا جوش و خروش پیدا کردیا۔ یہ خیال کیا جانے لگا کہ دماغی بدنظمی کی ماہیت اور اسباب کو جلد ہی منظر عام پر پیش کیا جاسکے گا، لیکن یہ امیدیں پوری نہ ہوسکیں تو رفتہ رفتہ یہ رائے قائم ہونے لگی کہ عضویاتی نظریہ اپنی اہمیت کے باوجود تمام مسائل کو حل کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا ہے اور مسئلہ کو حل کرنے کے لیے کسی اور طریقہ کار کی گنجائش موجود ہے۔ بالآخر نفسیاتی نظریہ کی ترقی نے ایک طریقہ کار فراہم کردیا۔

نفسیاتی طرزِ فکر کی بنیاد اس نظریہ پر رکھی گئی کہ دماغی افعال کا بالواسطہ مطالعہ کیا جاسکتا ہے اور اس سلسلے میں بھیجے میں پیدا ہونے والی متعلقہ تبدیلیوں کا حوالہ دینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ جنون کو خالص نفسیاتی نقطہ نظر سے بھی بہت اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

ابتدا ہی میں اس نظریہ کی ترویج کے دوران (Metaphysics) علم مابعدالطبیعیات، دینیات اور اخلاقیات کو نفسیات کے ساتھ خلط ملط کرنے سے بڑا نقصان پہنچا۔ مثال کے طور پر ہین روتھ (Heinroth) کے مطابق پاگل پن کا سبب گناہ ہے اور اس کے تدارک کے لیے مذہب پر اعتقاد حاصل ہونا لازمی ہے۔ لیکن بالآخر نفسیات خود کو تمام اجنبی ساتھیوں سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہوئی اور اس طرح پاگل پن کا اپنے طور پر مطالعہ کرنے کے لیے اس کا راستہ صاف ہوگیا تھا۔ اس سلسلے کا سب سے بڑا قدم انیسویں صدی کے نصف آخر میں فرانسیسی ماہرین نفسیات نے اٹھایا جس کا انجام (Janet) کے مستند تحقیقات پر ہوا۔ حالیہ برسوں میں ترقی کی رفتار بڑی تیز رہی ہے۔ کرپلن (Kraepelin)، فرائڈ (Freud) اور ینگ (Jung) کی تحقیقات نے جنون کے متعلق نفسیاتی نظریہ کو حقیقت کا روپ دے دیا۔

اس طرح آج دو اہم نظریے موجود ہیں ایک عضویاتی اور دوسرا نفسیاتی۔ جہاں تک موضوع کو برتنے کا سوال ہے ان دونوں نظریات کی راہیں ضرور جدا جدا ہیں لیکن دونوں کی مشترکہ بنیاد سائنسی طریقہ کے استعمال پر ہے۔

■

ماخذ: نفسیاتِ جنوں، **مصنف:** برنارڈ ہارٹ، **مترجم:** عبیدہ زمان، **دوسرا ایڈیشن** :1999، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

ہندوستان میں سماجیات اور تاریخ کے جدید رجحانات

عائشہ بیگم

سماجیات

ہندوستان کے ذیلی براعظم میں سماجیات کی تاریخ بہت ہی مختصر ہے۔ سب سے پہلے 1919 میں بمبئ یونیورسٹی میں سر پیٹرک گڈس کا تقرر بحیثیت سماجیات کے پروفیسر کے عمل میں آیا اور اس کے بعد دو ہی سال میں لکھنؤ یونیورسٹی میں پروفیسر رادھا کمل مکرجی 1921 میں سماجیات کے پروفیسر بنے۔ اس اعتبار سے سماجیات کو اس ملک میں آئے ہوئے ابھی ساٹھ برس بھی نہیں ہوئے لیکن یہ صحیح ہے کہ گذشتہ جنگ عظیم کے بعد سے سماجیات کو ہندوستانی جامعات میں بہت تیزی سے فروغ حاصل ہورہا ہے۔ ملک کی آزادی سے پہلے سماجیات سے عدم دلچسپی کا سب سے بڑا سبب برطانوی سامراج کی حکومت تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ خود برطانیہ میں سماجیات کو وہ عام مقبولیت حاصل نہیں ہے جو امریکہ اور دوسرے ممالک میں اس مضمون کو حاصل رہی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں بھی سماجیات سے اپنی عدم دلچسپی کو برقرار رکھا اور اس مضمون کو یہاں ترقی کرنے کا خاطر خواہ موقع نہیں ملا۔ جب ابتدا میں بمبئ اور لکھنؤ میں سماجیات کے پروفیسروں کا تقرر عمل میں آیا تو اس وقت بمبئ میں سماجیات کو شہریت کے ساتھ رکھا گیا اور لکھنؤ میں میں سماجیات، معاشیات کے نصاب کے ساتھ منسلک رہی۔ لیکن بہر حال ان ہی دونوں جامعات سے ابتدائی روشنی پھیلی۔ بمبئ یونیورسٹی میں سر پیٹرک گڈس کے بعد پروفیسر جی ایس گھورئے سماجیات کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی اور پروفیسر گھورئے صرف سماجیات کے سب سے پہلے پروفیسر ہی نہیں ہیں بلکہ حسن اتفاق سے یہ دونوں ایسی عظیم شخصیتیں تھیں جنھوں نے سماجیات کے میدان میں واضح اور بنیادی نقاط نظر کی داغ بیل ڈالی اور آج بھی ہندوستان کے مختلف گوشوں میں سینئر اساتذہ کا جو گروہ پایا جاتا ہے وہ ان دونوں عظیم شخصیتوں سے کسی نہ کسی طرح راست یا بالواسطہ طور سے مستفید ہوتا رہا ہے۔ پروفیسر گھورئے نے ہندوستان کی تاریخ کی قدامت اور اس کی روایات کو ہندوستانی سماجیات کے لیے سب سے اہم سرچشمہ قرار دیا اور پروفیسر مکرجی نے سماجی اقدار کی اہمیت اور اس کے بدلتے ہوئے رجحانات کو سماجیات کا اہم موضوع قرار دیا کیونکہ ڈاکٹر مکرجی کا یہ خیال تھا کہ مغربی اندازِ فکر اور مغربی تعلیم کے نتیجہ کے طور پر ہندوستانی اقدار میں بھی نئے رجحانات پیدا ہورہے ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ پرانے اقدار کی اہمیت بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ اس لیے ان کی رائے میں ہندوستانی سماج کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اقدار کے ڈھانچے اور سماجی اعمال میں اس کی فعالی کا بغور مطالعہ کیا جائے جس کے بغیر مغربی اندازِ فکر ہندوستانی پس منظر کو سمجھنے کے لیے قطعی ناکافی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ نئی تحقیقات اور جدید رجحانات کی روشنی میں کچھ لوگوں کو ان ابتدائی نقاطِ نظر سے اتفاق نہ ہو، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان ہی سماجیات دانوں نے اس ملک میں سماجیات کی راہ ہموار کی۔

سماجیات کے مختلف زاویہ ہائے نگاہ جو خود مغربی ممالک میں موجود رہے ہیں مثلاً بعض مفکرین اس بات سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں کہ سماجی برتاؤ کے وہ بنیادی اصول دریافت کیے جائیں جن کو طبعی علوم کے نظریات کی جیسی مقبولیت حاصل ہو۔ دوسرا گروہ ایسے سماجیات دانوں کا پایا جاتا ہے جو سماج کے مخصوص اور مرکوز مسائل کے خورد بینی اور تجزیاتی مطالعہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ تیسرا گروہ ایسے سماجیات دانوں کا ہوتا ہے جو کسی سماج کی مختلف قوتوں اور طریق کے باہمی ربط اور اثرات کے مطالعہ کو اپنی تحقیقات کا مقصد قرار دیتے ہیں۔ یہ مختلف نقاط نظر انگلستان، فرانس، جرمنی، اٹلی، امریکہ غرض کہ ہر اس ملک میں نظر آتے ہیں جہاں سماجیات کو ترقی کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں بھی سماجیات کے مطالعہ اور تحقیق کے یہی مختلف رخ قرار دے جائیں لیکن ساٹھ سے کم کے مختصر عرصہ میں یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اعلیٰ پائے کے اتنے سماجیات داں پیدا ہوسکیں جو اس ملک کے وسیع مسائل اور تمدنی پیچیدگیوں کا اطمینان بخش تجزیہ کرسکیں، لیکن اس کے باوجود گذشتہ تیس برسوں میں جو تحقیقاتی کام ہورہے ہیں وہ انتہائی اہم اور نتیجہ خیز ہیں۔

دشواری یہ ہے کہ سماجیات ایک ایسا علم ہے جس کے تصورات کا تعلق سماجی حقیقتوں سے ہوتا ہے اور سماجی حقیقتیں ہر جگہ مختلف ہوتی ہیں۔ ہر جگہ کے حالات وہاں کا ماحول اور انسانی تعلقات ایسی کیفیت پیدا کرتے ہیں جو بالکلیہ اس شکل میں دوسری جگہ نہیں پائے جاتے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی خاص خطے یا علاقے کے نظریات یا نتائج کو اسی شکل میں دوسرے علاقہ کے سماج پر منطبق نہیں کیا جاسکتا۔ دو مختلف سماجوں کے سیاسی اشکال میں مشابہت دریافت کرنا آسان ہے، مذہبی برتاؤ میں مماثلت تلاش کرنا ممکن ہے لیکن مجموعی سماجی برتاؤ میں اس قسم کی جامع مماثلت بہت مشکل ہے اس لیے جو بھی سماجیاتی تصورات دوسرے سماجوں میں اختراع کیے گئے ہیں یا دریافت ہوئے ہیں ان کا ہو بہو اطلاق ہندوستانی سماج پر کرنا انتہائی خطرناک ہے کیونکہ درآمد کردہ یہ تصورات مقامی سماجی زندگی کی صحیح توضیح کرنے سے قاصر ہوں گے۔ دراصل یہی مسئلہ سماجیات کا سب سے پیچیدہ مسئلہ ہے۔ سب سے بڑی دشواری ہندوستانی سماجیات دانوں کو یہی درپیش ہے کہ ہمارے پاس اپنے تحقیق کردہ تصورات موجود نہیں ہیں اور مستعار تصورات کو مقامی مسائل کی توضیح وتشریح کے لیے اگر استعمال کیا جائے تو ان کا تعلق اپنے مقامی حالات سے اتنا صحیح نہیں ہوتا۔ گویا ہندوستانی سماج کے تعلق سے سماجیات نقطہ نظر کے سہارے نئے تصورات کی دریافت ضروری ہے تاکہ ہندوستانی تمدنی پس منظر میں سماجی حقائق کی بہتر اور صحیح ترجمانی کی جاسکے، لیکن یہ کام اتنا صبر آزما اور کٹھن ہے کہ ابھی تک اکثر سماجیات داں مغربی تصورات ہی کو معمولی ردو بدل کے ساتھ استعمال کرنے پر مجبور ہیں، لیکن ہماری سماجی تحقیقات اس وقت تک بلند اور معیاری نہیں ہوسکتیں جب

تک کہ ہم اپنے تمدنی پس منظر کی روشنی میں سماجی برتاؤ کے اصول اور نظریات دریافت نہ کریں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں پروفیسر لوئی دیومان اور پروفیسر ڈی ایف پوکک نے ہندوستان میں سماجیات کی ترقی کے لیے سب سے پہلی شرط یہ رکھی کہ قدیم ہندیات کے ماخوذات سے استفادہ کیا جائے کیونکہ ان کی رائے میں ہندوستان کے مختلف سماج اور تمدن مخصوص اداروں، رسوم و رواج اور سماجی برتاؤ کے مظہر رہے ہیں جن کے مطالعہ سے سماجی برتاؤ کی نئی نئی اشکال دریافت ہوسکتی ہیں اور جب تک ہندوی تمدنی پس منظر سے خاطر خواہ واقفیت نہ ہو اس وقت تک سماجیاتی تحقیقات بامقصد خطوط پر آگے نہیں بڑھائی جاسکتی۔ ہم جانتے ہیں کہ امریکہ میں مشہور سماجیات دانوں مثلاً سوروکن، پارسنس اور مرٹن نے سماجی مطالعہ کے اہم پہلوؤں کو واضح کیا۔ سوروکن نے سماجی تمدنی عمل کے مرکزی خیال کو اہمیت دی۔ پارسنس نے سماجی عمل کا نظریہ پیش کیا جس کو مرٹن نے نئی جہتیں عطا کیں، لیکن ان تمام مفکرین کے نظریات مغربی ممالک کے سماج کی توضیح وتشریح کے لیے مفید ہونے کے باوجود، ہندوستانی سماج کی توضیح وتشریح کے لیے ناکافی ثابت ہوں گے۔ کیوں امریکہ کے برعکس ہندوستانی سماج کا ایک زائد رخ اس کا قدیم تمدنی اور روایاتی ڈھانچہ ہے۔ ہندوستانی سماجی برتاؤ کی جڑیں اس ڈھانچے اور ان روایات میں بہت گہری پیوست ہیں۔ اس لیے محض سماجی عمل اور ظاہری سماجی برتاؤ یا موجود اقدار کا مطالعہ ہندوستانی سماج کے تجزیہ کے لیے بہت سطحی اور ناکافی ہوگا۔ اس اعتبار سے ہندوستان میں سماجیات اور تمدنیات کو بالکلیہٗ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ اگرچہ کہ سماجیات کی انفرادیت کو کسی دوسرے علم میں ضم کرنا مقصود نہیں ہے۔ سب سے بڑی دشواری اور سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستانی سماج کی روایاتی انفرادیت کے باوجود ہندوستانی سماجیات کو عالمی سماجیات سے علیحدہ نہیں رکھا جاسکتا۔ یہی استدلال ڈاکٹر بیلی کا بھی رہا ہے۔ ڈاکٹر بیلی کا کہنا ہے کہ ہندوستانی سماجیات کو عالمی سماجیات ہی کا ایک حصہ رہنا چاہیے۔ البتہ ایسے مقامی تصورات کی دریافت سے اس کو بھی اعتراض نہیں ہے جو ہندوستانی سماجیاتی وحدت کی بہتر توضیح وتشریح کرسکیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہندوستانی سماج کی بہت سی خصوصیات مثلاً مذہبی اور تمدنی رواداری، ذات پات کا نظام، مشترک خاندان اور مکمل دیہی خودکار سماجی زندگی کی وحدتیں ایسی حقیقتیں ہیں جو بیسویں صدی میں ہندوستانی سماج اور تمدن کو انفرادیت عطا کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ان سماجی حقیقتوں کا بغور مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے تو ایسی بے شمار باتیں دریافت ہوں گی جو دوسرے سماجی ماحول میں نہیں پائی جاتیں۔ لیکن اس قسم کی تمام تحقیقات اور تجزیے اس وقت تک علمی اہمیت کے حامل نہیں ہوسکتے۔ جب تک کہ اس ملک کے سماجیات داں تصور سازی کا فن نہ سیکھ لیں۔ مغربی اور ہندوستانی سماجیات دانوں میں بنیادی فرق یہی ہے۔ مغربی سماجیات داں بڑی آسانی کے ساتھ تصوراتی تشکیل کرسکتے ہیں — ہندوستانی سماجیات داں ان تصوراتی تشکیلوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، لیکن خود ابھی علمی ادراک ہی اس منزل پر نہیں پہنچے جہاں تصوراتی تشکیل ممکن ہوسکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب سماجیات داں کو طریقہ ہائے تحقیق پر کامل عبور حاصل ہوجائے نیز وہ اپنے اس فن تحقیق سے استفادہ کی عملی صلاحیت بھی رکھتا ہو اور ساتھ ہی ساتھ اسے اپنے موضوع تحقیق کا صحیح ادراک ہوجائے تو اس کے بعد تصورات اور اصطلاحات کا وضع کرنا دشوار نہیں رہتا۔ ہندوستان میں سماجیات دانوں کو ابھی علمی اعتبار سے اتنی تربیت نہیں ملی ہے اور اتنا تجربہ نہیں ہوا ہے کہ وہ ہندوستانی سماج کے اصول اور تصورات وضع کرسکیں۔ دراصل اس نکتہ کا مقصد سماجیات دانوں پر کسی قسم کی حرف نمائی نہیں ہے لیکن یہ دراصل سماجیاتی تجزیہ کی ابتدائی منازل کا نتیجہ اور اس کا اعتراف ہے۔

یہ بات اوپر کہی جاچکی ہے کہ ہندوستان میں سماجیات کی ابتدا بہت دیر سے ہوئی جس کا ایک سبب تو یہ تھا خود انگلستان میں اس علم کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دی گئی جتنی کہ دی جانی چاہیے تھی، اس لیے ہندوستان جو برطانوی سامراج کے زیر اثر تھا وہاں بھی سماجیات کو ترقی کرنے کا موقع آزادی سے پہلے بہت کم رہا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ برطانوی سامراج کی نوآبادیاتی پالیسی کی وجہ سے ہندوستانی مفکرین اور اساتذہ نیز عوام کو آزادانہ فکر اور علمی شعور کی وہ سہولتیں نہیں ملیں جو کسی علم کی ترویج اور ترقی کے لیے ضروری ہوتی ہیں، لیکن جیسے جیسے آزادی کی تحریک مضبوط ہوتی گئی سیاسی اور سماجی شعور بھی بیدار ہوتا گیا اور جب آزادی مل گئی تو اس کے بعد اس ملک کے سماجیات دانوں کو مسائل کا تجزیہ کرنے اور اس پر غور کرنے کے پورے مواقع ملے، چنانچہ فکر ونظر کے جو نئے طریق اختیار کیے گئے ان میں سے حسب ذیل پانچ کو خاص اہمیت حاصل رہی:

1. ذات پات، آبادی، عقائد اور روایات کو سماجیاتی زاویہ نگاہ سے بحث وتحقیق کا موضوع بنایا گیا۔
2. ہندوستان کے سماجی اداروں اور دیہی کمیونٹی کا سماجیاتی مطالعہ کیا جانے لگا۔
3. دیہی سماج، رسوم ورواج اور اداروں کے تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ کی ابتدا ہوئی۔
4. علاقائی معاشی مسائل نیز سماجی مسائل کا اعداد وشمار کی روشنی میں مطالعہ کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔
5. سماجیات دانوں نے ہندوستانی تمدن کی ان روایات کے تجزیہ پر توجہ دی جو مغربی اور صنعتی سماج کے اثرات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

1947 تک سماجیات کا دائرہ بحث وتحقیق بہت محدود رہا۔ آزادی سے پہلے نہ تو شہری سماج کا بغور مطالعہ کیا گیا اور نہ ہی دیہی سماج کا۔ اسی طرح سماجی مسائل مثلاً جرائم کی چھان بین، اس کے اسباب کی تلاش اور اسی طرح سماج کے بے شمار امراض کی تحقیق وتفتیش پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی، لیکن آزادی کے فوراً بعد جامعات اور تحقیقی اداروں میں سماجیات کو بڑی تیزی سے اس کا مقام ملنے لگا کیونکہ ہندوستانی مفکرین اور اساتذہ کو اس بات کا پوری طرح احساس ہوچکا تھا کہ سماجی تبدیلی یا سماجی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ان سماجی قوتوں اور طاقتوں کا مطالعہ نہ کیا جائے جو سماجی حرکیات کے اہم عناصر ہوتے ہیں۔ جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ سماجی رجحانات میں کس قسم کے مثبت اور منفی طریق کار ہیں، نیز سماج میں وہ کون سی کمزوریاں ہیں جو مثبت تبدیلی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں اس وقت تک سماجی تبدیلی یا بحیثیت مجموعی قومی معاشی ترقی کا کوئی منصوبہ نتیجہ خیز اور کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس احساس کے ساتھ ہی ہندوستان کی بے شمار جامعات میں سماجیات کے شعبے قائم ہونے لگے اور ملک کے مختلف حصوں میں ایسے تحقیقی ادارے قائم کیے گئے جو اس ملک کے پیچیدہ سماج کے بے شمار مسائل کا تحقیقی تجزیہ کرسکیں۔ اس مقصد کے لیے سماجیات دانوں نے حسب ذیل طریقے اختیار کیے:

1. سماجی حالات کا تاریخی اور تقابلی مطالعہ۔
2. فلسفیانہ اور سماجیاتی تجزیہ۔
3. منطقی استدلال اور استنباط سے استفادہ۔
4. سماجی ڈھانچہ اور سماجی ساخت کے عوامل اور ان کی کارکردگی کا جائزہ۔
5. اعداد وشمار، مشاہدے اور حقیقی واقعات کے سروے سے سماجیاتی نتائج کا حصول۔

■

ماخذ: تاریخ اور سماجیات، **مصنفہ:** عائشہ بیگم، **دوسرا ایڈیشن:** 2003، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

اردو زبان و ادب

ہندوستانی تہذیب وثقافت کی آئینہ دار ہے

نجم بٹ

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

ج: بنی نوع انسان اپنی بات دوسروں تک صرف زبان کا سہارا لے کر ہی پہنچا سکتا ہے۔ اپنے خیالات، جذبات اور احساسات کو دوسروں تک پہنچانے یا پھر ان کی بات سننے اور سمجھنے کے لیے زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے، اسی لیے زبان کو انسانی خیالات و احساسات کا مجموعہ کہا گیا ہے۔ زبانیں کسی بھی فرد یا افراد کی وراثت نہیں ہوتی بلکہ زبان صرف بولنے والوں کی ہوتی ہے اس لیے اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے ہم پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ ہم اِسے تقریری اور تحریری دونوں صورتوں میں لائیں تاکہ اردو ہمیشہ کے لیے زندہ رہے۔

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے؟

ج: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کوئی ایک طریقۂ کار نہیں اختیار کیا جا سکتا۔ زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اس زبان کی رسائی محدود حلقے تک ہی نہ رہے بلکہ عام آدمی تک اس کی رسائی ہو۔ ورنہ اس زبان کے ساتھ بھی وہی ہوگا جو ماضی میں کئی زبانوں کے ساتھ ہوا۔ ضروری ہے کہ کسی بھی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اسے روزگار کے ساتھ جوڑنا از حد ضروری ہے۔ آج کے دور میں سب سے بڑا مسئلہ روزی روٹی کا ہے۔ اِسے روزگار کے ساتھ جوڑنا ہوگا۔ زبان کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ ہم آپس میں گفتگو کریں تو اردو زبان میں ہی کریں تاکہ ہماری اردو زبان زندہ رہے۔

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟

ج: اردو زبان وادب ہندوستانی تہذیب وثقافت کی آئینہ دار ہے۔ ثقافت کے لغوی معنی: تہذیب، کسی قوم یا انسانی گروہ کی تہذیب کے اعلیٰ مظاہر جو اس کے مذہب، علم و ادب، نظام اخلاق اور فنون میں نظر آتے ہیں۔ اردو ادب میں ثقافت کا لفظ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ لفظ عربی سے اردو میں منتقل ہوا۔ ثقافت ایک معاشرتی ورثہ ہے۔ اردو صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ یہ ہماری تہذیب بھی ہے۔ اردو زبان ہماری تہذیب اور ثقافت کی ضامن ہے۔

اردو ہندوستان کی دلکش اور گنگا، جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ اردو زبان کا تہذیب اور ثقافت سے گہرا رشتہ ہے اور یہ زبان ہماری تہذیب کی عکاسی کرتی ہے۔ ہر زبان کے پس پشت ایک کلچر ہوتا ہے جس کی وراثت صدیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہمارے شعرا و ادبا حضرات نے اپنی شاعری اور نثر دونوں میں اپنے کلچر کو پیش کیا ہے۔ نظیر، غالب، چکبست، آزاد، قلی قطب شاہ، منشی پریم چند اس کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

ج: زبان سے تہذیب وثقافت کی نشو ونما اور تشکیل ہوتی ہے۔ دراصل زبان اور تہذیب آپس میں لازم وملزوم ہیں یہ آپس میں اس طرح جڑی ہوئی ہیں جس طرح روح اور جسم ہیں۔ کوئی بھی زبان ہو، اس کی اپنی ایک تہذیبی شناخت یا پہچان ہوتی ہے، اب رہی بات اردو کی، اس کا تو نام آتے ہی اس کی نفاست، نزاکت، لطافت، شائستگی، جاذبیت اور چاشنی وغیرہ دل و دماغ پر نقش ہوجاتی ہے۔ کسی بھی قوم یا انسانی گروہ کی پہچان صرف اس کی زبان سے ہوتی ہے، چونکہ اس کی زبان میں ہی تقریری یا تحریری شکل میں اس قوم یا انسانی گروہ کی وراثت موجود ہوتی ہے۔ اس صورت میں اگر اس کی زبان کی موت ہوجائے تو اس کی وراثت کی موت ہوجائے گی، اگر ہم انسانی وراثت کا تحفظ چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے زبان کا تحفظ کرنا ہوگا۔

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے اس زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

ج: ہم اکیسویں صدی میں رہ رہے ہیں اور یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی صدی ہے۔ اکیسویں صدی نے پوری دنیا کو بہت تیزی سے بدل ڈالا ہے۔ زندگی کا کوئی بھی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس میں مثبت یا منفی انقلاب برپا نہ ہوا ہو۔ آج کے دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی ہی ترقی کی ضامن ہے۔ بلاشبہ، سماج مختلف علوم وفنون اور زبانوں کا آئینہ دار ہوتا ہے، کسی بھی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے اس زبان پر کسی نہ کسی طرح منفی اثرات پڑتے ہیں۔ ماہرِ نفسیات ہوں یا ماہرِ تعلیم، اس بات پر متفق ہیں کہ دوسری زبانوں کے مقابلے میں بچہ اپنی مادری زبان میں پڑھائے جانے والے سبق کو آسانی سے ذہن نشین کرسکتا ہے اور اس پر اسے قدرت بھی حاصل

اردو زبان وادب ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار ہے۔ ثقافت کے لغوی معنی: تہذیب، کسی قوم یا انسانی گروہ کی تہذیب کے اعلیٰ مظاہر جو اس کے مذہب، علم وادب، نظام اخلاق اور فنون میں نظر آتے ہیں۔ اردو ادب میں ثقافت کا لفظ زیادہ پرانا نہیں ہے۔

اردو گنگا، جمنی تہذیب کی ایک بہترین مثال ہے، یہ ہندوستان کی پیداوار ہے۔ جیسے جیسے اس زبان کا دامن وسیع ہوتا گیا، ویسے ویسے اس نے دوسرے ممالک میں اپنے قدم جمانے شروع کیے اور آج دنیا کے بیشتر ممالک میں اردو بولنے، سننے، سمجھنے، پڑھنے اور لکھنے والے موجود ہیں گویا اردو ایک عالمگیر زبان بن چکی ہے۔

ہوجاتی ہے۔ سرسیّد نے بھی سائنسی علوم کو اپنی مادری زبان میں منتقل کرنے کی وکالت کی ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ نصاب میں جدید اور سائنسی علوم وفنون کو شامل کیا جائے۔

س: موجودہ دور میں اردو زبان کو خطرہ کس طرح لاحق ہے؟

ج: اردو پڑھنے والوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ عام آدمی بھی اپنے بچوں کو پرائیویٹ اسکولوں میں داخلہ دلوارہا ہے لیکن وہاں پر اردو اساتذہ کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوتا اور دوسری بات یہ کہ گورنمنٹ اسکولوں میں بھی اردو اساتذہ کی کمی ہے، جس کی وجہ سے اردو پڑھنے والے کم ہوتے جارہے ہیں، اس طرح سے اردو کا حلقہ محدود ہوتا چلا جارہا ہے اور نئی پود اردو سے نابلد ہوتی جارہی ہے۔ اس کے ساتھ میں دو باتوں کا اضافہ کرنا چاہوں گا۔ پہلی بات یہ کہ اردو زبان کو نئی ٹیکنالوجی اور روزگار سے جوڑنے کی ازحد ضرورت ہے اور دوسرے یہ کہ موجودہ دور میں اردو زبان خود اردو والوں کی بے توجہی کا شکار ہے۔

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

ج: اردو گنگا، جمنی تہذیب کی ایک بہترین مثال ہے، یہ ہندوستان کی پیداوار ہے۔ جیسے جیسے اس زبان کا دامن وسیع ہوتا گیا، ویسے ویسے اس نے دوسرے ممالک میں اپنے قدم جمانے شروع کیے اور آج دنیا کے بیشتر ممالک میں اردو بولنے، سننے، سمجھنے، پڑھنے اور لکھنے والے موجود ہیں گویا اردو ایک عالمگیر زبان بن چکی ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سے علاقوں سے اردو ختم ہورہی ہے۔ جموں وکشمیر جس کی سرکاری زبان 2019 تک اردو تھی، آج اس کی یہ حالت ہے کہ یہاں کے بیشتر کالجوں سے اردو کو ختم کردیا گیا ہے۔ اس یونین ٹریٹری میں 139 سرکاری کالج ہیں لیکن چند کالجوں میں ہی اردو مضمون کو باقی رکھا اور بیشتر کالجوں سے اردو کو ختم کردیا۔

س: کیا اردو کی تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہی ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

ج: اس سوال کے اندر ہی اس کا جواب چھپا ہوا ہے۔ اگر اردو کی تنظیموں اور اداروں کی بات کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زبان سے زیادہ توجہ ادب پر دی جارہی ہے۔ مشاعروں، سمیناروں، کانفرنسوں وغیرہ کے اہتمام میں ادارے اور تنظیمیں سرگرم رہتی ہیں۔ اس کے برعکس زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت میں کچھ کمی سی آرہی ہے جب کہ ادب کے ساتھ زبان پر بھی توجہ کی ازحد ضرورت ہے۔ اس مادی دور میں لوگ اجتماعی مفاد کے بجائے ذاتی فائدہ ڈھونڈتے ہیں جو اردو زبان کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہورہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

ج: زبان کی سطح پر بلاشبہ بگاڑ پیدا ہوتا جارہا ہے اس بگاڑ کو روکنے کے لیے کئی ترکیبیں عمل میں لائی جاسکتی ہیں۔ زبانیں صرف بولنے والوں کی ہوتی ہیں۔ فراٹے سے انگریزی بولنے والوں کو آج ذہین سمجھا جارہا ہے، حالانکہ ذہانت کو ناپنے کا آلہ انگریزی بولنا ہرگز نہیں۔ کسی بھی زبان میں گفتگو کرکے آپ ذہانت کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ ہمارے اردو کے شعرا وادبا کیا کسی سے کم ہیں۔ میر، غالب، ولی، قلی قطب شاہ، اقبال، حسرت، حالی، پریم چند وغیرہ کا کوئی ثانی نہیں۔ ابتدائی درجے سے لے کر اعلیٰ سطح تک اردو میں معیاری کتابیں (سائنس اینڈ ٹیکنالوجی) تیار کرکے انہیں نصاب میں شامل کرائے جانے سے زبان کی سطح پر پیدا ہونے والے بگاڑ کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنے رسم الخط کا خاص خیال رکھنا ہم سب کی ذمے داری ہے، اردو الفاظ یا اشعار کو اپنے ہی رسم الخط میں لکھا جائے۔ تیسرے یہ کہ اردو کتابوں کو خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالیں۔ چوتھے یہ کہ ہم اردو کا اخبار خرید کر پڑھیں۔ ان چند باتوں پر عمل کرنے سے کسی حدتک اس بگاڑ پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

ج: کسی نہ کسی حدتک اردو میں کلاسیکیت اور جدیدیت پر گفتگو سے اردو زبان وادب کو فائدہ ہوسکتا ہے۔ زبان کو زندہ رکھنے میں کلاسیکیت بھی معاونِ ثابت ہوسکتی ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

ج: ہمارے علاقے میں اردو میڈیم کا کوئی بھی اسکول نہیں ہے۔ گورنمنٹ اسکولوں میں اردو کو ایک مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا ہے جب کہ پرائیویٹ اسکولوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ لیکن یہ سبھی انگریزی میڈیم کے اسکول ہیں بہرحال ان پرائیویٹ اسکولوں میں اردو ایک مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔

زبان کی سطح پر بِلاشبہ بگاڑ پیدا ہوتا جارہا ہے اس بگاڑ کو روکنے کے لیے کئی ترکیبیں عمل میں لائی جاسکتی ہیں۔ زبانیں صرف بولنے والوں کی ہوتی ہیں۔ فراٹے سے انگریزی بولنے والوں کو آج ذہین سمجھا جارہا ہے، حالانکہ ذہانت کو ناپنے کا آلہ انگریزی بولنا ہرگز نہیں۔ کسی بھی زبان میں گفتگو کرکے آپ ذہانت کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ ہمارے اردو کے شعرا و ادبا کیا کسی سے کم ہیں۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

ج: ہمارے علاقے میں ایک ڈسٹرکٹ لائبریری ہے جس میں پرانی کتابوں کا ذخیرہ دستیاب ہے۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ ڈگری کالج پونچھ میں بھی ایک بڑی لائبریری ہے جس میں ہزاروں کی تعداد میں پرانی اور نئی کتابیں ہیں۔ اس لائبریری میں اردو کی کتابوں کی تعداد دو ہزار چھ ہے۔ میں نے خود 2018 میں اردو کی کتابوں کی

فہرست تیار کی تھی۔ گورنمنٹ ڈگری کالج سرنکوٹ، گورنمنٹ ڈگری کالج مینڈھر اور مقدس ڈگری کالج مینڈھر میں بھی ان کالجوں کی اپنی لائبریریاں ہیں جن میں اردو کتابوں کی تعداد کافی ہے۔ اردو کے اخبارات میں اڑان، کشمیر عظمیٰ، لازوال، تسکین اور ہند سماچار یہاں متواتر آتے ہیں۔ رسائل میں ماہنامہ اردو دنیا، تہذیب الاخلاق اور آج کل یہاں ہر مہینے آتے ہیں۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

ج: ہمارے علاقے میں 'تحریک بقائے اردو' کے نام سے ایک فعال تنظیم ہے جو اردو زبان و ادب کے لیے تن من سے خدمت کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ 'انجمن کاروانِ ادب' کے نام سے ایک انجمن بھی ہے جو مشاعرہ وغیرہ کراتی ہے۔

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوشش کر رہے ہیں؟

ج: کافی عرصہ سے میرا تعلق درس و تدریس سے ہے۔ آج کل میں گورنمنٹ شری پرتاپ کالج (کلسٹر یونیورسٹی) سرینگر میں اردو پڑھا رہا ہوں۔ میں نے جموں وکشمیر اور لداخ کے سولہ کالجوں (چار یونیورسٹیوں) میں اردو معلم کی حیثیت سے درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ ہزاروں کی تعداد میں میرے شاگرد ہیں، ان میں سے بہت سارے اسکول ٹیچر اور لیکچرر تعینات ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اسسٹنٹ پروفیسر ہوگئے اور کچھ ریاستی سطح کا اعلیٰ مسابقاتی امتحان 'جموں وکشمیر ایڈمنسٹریٹیو سروس' پاس کر کے اچھے عہدوں پر فائز ہیں اور مجھے اس پر فخر ہے۔ میں نے حال ہی میں اپنے کالج میں ایک مشاعرہ کرایا جو کالج کا پہلا مشاعرہ تھا چونکہ یہ سائنس کالج ہے یہاں مشاعرہ کرانے کا کوئی جواز نہیں تھا لیکن نئی تعلیمی پالیسی 2020 کے تحت پہلی بار اس کالج میں سائنس والے طلبا و طالبات کو گریجویشن کی سطح پر کم از کم ایک میقات میں اردو پڑھنا ضروری قرار دیا گیا، اس لیے یہاں اردو پڑھانے کا پہلی بار اہتمام کیا گیا۔ اس قسم کے مشاعرے کرانے کا میں مصمم ارادہ رکھتا ہوں جو اردو کے فروغ میں کارگر ثابت ہوں گے۔

س: آپ کے ذہن میں فروغِ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

ج: آج کے دور میں سب سے بڑا مسئلہ روزی روٹی کا ہے اس مسئلے کو ہم کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کر سکتے۔

> اردو رسم الخط کی بقا کے لیے ہم اردو داں طبقے پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہم اپنے ہی رسم الخط کا استعمال کریں، اپنے بچوں اور احباب کو اس رسم الخط پر عمل کرنے کی تلقین کریں۔

میرے ذہن میں اردو کے فروغ کے لیے چند تجاویز اور مشورے ہیں: (1) اردو کو روزگار کے ساتھ جوڑا جائے (2) دوسرے علوم کی کتابوں کے اردو میں تراجم کیے جائیں (3) یونیورسٹیوں کو چاہیے کہ وہ اردو کا شعبہ قائم کریں (4) اردو داں طبقے کو اردو کے تئیں ہمیشہ متحرک رہنا چاہیے۔

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جا سکتی ہیں؟

ج: رسم الخط اور زبان کا آپس میں ایک گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ رسم الخط کو کسی بھی زبان کی روح کہا جاتا ہے۔ لہٰذا رسم الخط کو بچانا زباں کو بچانا ہے۔ اردو رسم الخط کی بقا کے لیے ہم اردو داں طبقے پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہم اپنے ہی رسم الخط کا استعمال کریں، اپنے بچوں اور احباب کو اس رسم الخط پر عمل کرنے کی تلقین کریں۔

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟

ج: ہمارے ملک کے ہر صوبے یا علاقے کی اپنی اپنی زبان ہے جو اس علاقے کی پہچان ہوتی ہے۔ مثلاً مہاراشٹر میں مراٹھی، گجرات میں گجراتی، پنجاب میں پنجابی، لداخ میں لداخی، کشمیر میں کشمیری، جموں میں ڈوگری، پہاڑی، گوجری وغیرہ بولی جاتی ہیں۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ یہاں رابطے کی کون سی زبان ہو سکتی ہے تو بلا جھجک ہمیں یہ کہنا ہوگا کہ یہاں رابطے کی زبان ہندی یا پھر اردو ہی ہے جن کے ذریعے ہم ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں یا ایک دوسرے کی بات کو سمجھ سکتے ہیں۔ لہٰذا اردو داں طبقے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اردو کو مشاعروں، ڈراموں، گیتوں، اخباروں وغیرہ کے ذریعے دوسرے علاقوں تک پہنچائے تاکہ ان علاقوں اور ان کی علاقائی زبانوں تک اردو کی رسائی ہو جو اردو کے فروغ کی ضامن بنے۔

س: کیا آپ کے اہلِ خانہ اردو زبان لکھنا، پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

ج: جی ہاں! میری والدہ اردو بول لیتی ہیں اور ان کے علاوہ میرے سبھی اہلِ خانہ اردو بولنے کے ساتھ ساتھ اردو لکھتے اور پڑھتے بھی ہیں۔

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

ج: جی ہاں! میرے بعد میرے اہلِ خانہ اردو کو زندہ رکھنے کی پوری کوشش کریں گے۔

س: غیر اردو حلقے میں فروغِ اردو کے لیے کیا حکمتِ عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

ج: میں یہاں صرف ایک بات کی طرف آپ کی توجہ مرکوز کرانا چاہوں گا وہ یہ کہ ہر کس و ناکس شعر و شاعری سننا پسند کرتا ہے۔ شاعری سننے سے ہمارے کان حظ محسوس کرتے ہیں۔ میں لڑکپن سے ہی شاعری کا دلدادہ رہا ہوں اس لیے مجھے شاعری سننا اور سنانا بے حد پسند ہے۔ میرے شاگرد ہمیشہ مجھے اشعار سنانے کی ضد کرتے ہیں اور میں ان کی یہ ضد پوری کرتا ہوں۔ یہ حکمتِ عملی بھی اردو کے فروغ میں ایک اہم کردار نبھاتی ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز اور یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

ج: ہمارے ضلع میں تین گورنمنٹ کالج اور دو پرائیویٹ کالج ہیں (ایک ڈگری کالج اور ایک بی ایڈ کالج) ان سبھی کالجوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے یہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہوتی ہے چونکہ یہ اردو کی بیلٹ ہے۔ اب رہی بات یونیورسٹیز کی، جموں وکشمیر میں کل گیارہ یونیورسٹیز ہیں، ان میں دو سینٹرل یونیورسٹیز اور نو اسٹیٹ یونیورسٹیز ہیں۔ گیارہ میں سے چھ یونیورسٹیز میں اردو کے شعبے قائم کیے گئے ہیں اور ان میں اردو پڑھائی جاتی ہے اور یہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟

ج: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے رابطہ کر کے انہیں اردو کے شیریں پن اور مٹھاس کا احساس دلانا ہے جب ان تنظیموں کو اس چیز کا احساس ہو جائے گا تب وہ خود اس کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں ہر جائز مدد کرنے کو ترجیح دیں گی۔

■

Dr. Najam Bhat
Bafliaz Tehsil Surankote
District POONCH (J&K)
Cell.: 9419171639/7006374257
drnajambhat@gmail.com

نظیر احمد گنائی

ماہرِ دکنیات
پروفیسر محمد علی اثر

پروفیسر محمد علی اثر کا شمار اردو ادب کے مشہور و معروف ماہرینِ دکنیات میں ہوتا ہے۔ وہ دکنی ادب کے سرکردہ محقق اور نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں، وہ بیک وقت محقق، نقاد، ادیب، شاعر، استاد، مقرر اور درج اول کے مخطوطہ شناس اور ماہر دکنیات ہیں۔ انھوں نے چار دہائیوں سے زیادہ دکنیات میں تحقیق وتنقید، تدوین متن اور دکنی ادب کی تفہیم وتقدیم میں اپنے فرائض احسن طریقے سے انجام دیے ہیں۔

نام محمد علی اور تخلص اثر 22 دسمبر 1949 میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حکیم شیخ محبوب تھا، محمد علی اثر نے ابتدائی تعلیم حیدرآباد کی قدیم درس گاہوں مدرسہ تحتانیہ شاہ گنج، مدرسہ وسطانیہ وفوقانیہ اُردو شریف میں حاصل کی۔ پھر انھوں نے دسویں جماعت کا امتحان اُردو شریف ہائی اسکول سے 1965 میں دوسری پوزیشن حاصل کر کے پاس کیا۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے انوارالعلوم کالج کا رُخ کیا اسی کالج سے گیارویں جماعت سے لے کر بی۔ اے کی ڈگری 1971 میں حاصل کی۔ اس کے بعد عثمانیہ یونی ورسٹی کے آرٹس کالج میں داخلہ لیا اور وہاں سے 1974 میں ایم اے اردو میں نہ صرف کالج سے بلکہ پوری یونی ورسٹی سے پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ ان کے تحقیقی مقالے 'غواصی شخصیت اور فن' شائع ہونے کے بعد انھیں براہِ راست جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اُردو میں پی ایچ۔ ڈی کے لیے داخلہ مل گیا۔ انھوں نے پروفیسر غلام عمر خاں کی زیرنگرانی 'دکنی غزل کی نشوونما' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر جامعہ عثمانیہ سے ہی پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1975 میں ان کا عارضی تقرر جامعہ عثمانیہ میں ہوا۔ 1982 میں مستقل لکچر بنائے گئے، 1987 میں ریڈر پھر 1998 میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 30 سالوں سے زیادہ عرصے تک وہ جامعہ عثمانیہ میں طالب علموں کو پڑھاتے رہے۔ دسمبر 2009 میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

پروفیسر محمد علی اثر کا شمار اردو ادب کے مشہور ومعروف ماہرینِ دکنیات میں ہوتا ہے۔ وہ دکنی ادب کے سرکردہ محقق اور نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں، وہ بیک وقت محقق، نقاد، ادیب، شاعر، استاد، مقرر اور درج اول کے مخطوطہ شناس اور ماہر دکنیات ہیں۔

دکنی ادب کے شہ پاروں کی تحقیق، تدوین اور تنقید سے محمد علی اثر کا گہرا شغف اور والہانہ لگاؤ تھا۔ نامور ماہر دکنیات کے طور پر وہ اتنے معتبر ومستند ہیں کہ دنیائے اردو ادب میں جتنے بھی اسکالرز دکنی ادب پر کام کر رہے ہیں وہ ان کی تحریروں سے استفادہ کرتے ہیں۔ دکنی ادب کی نثر عام قاری کے لیے دقیق معلوم ہوتی ہے۔ لیکن پروفیسر محمد علی اثر کا انداز نگارش وطرز ترسیل اتنا مانپا ہوا ہے کہ مشکل سے مشکل بات بھی کس طرح قارئین کے ذہن تک آسانی سے پہنچاتے ہیں۔ یہ ان کی باریک بینی ہے کہ وہ اردو داں طبقے کے لیے مشکل کو آسان بنا کر عام فہم زبان میں پیش کرتے ہیں۔ اب تک ان کی تصانیف وتالیفات اور شعری مجموعے جو منظرِ عام پر آچکے ہیں، ان کی تعداد پچاس سے زائد ہے، تحقیق وتدوین سے متعلق پروفیسر محمد علی اثر کی کتابیں ہندوستان کی مختلف جامعات کے نصاب میں شامل کی گئی ہیں۔ ان کی مشہور تصانیف وتالیفات کی فہرست یوں ہے:

غواصی شخصیت اور فن (تحقیق) 1977، مقالات (شعری مجموعہ) 1980، شمع جلتی رہی (رپورتاژ) 1980، دبستان گولکنڈہ ادب اور کلچر (مرتب) 1980، دکنی اور دکنیات (وضاحتی کتابیات) 1982، دکنی غزل کی نشوونما 1986، دکن کی تین مثنویاں 1987، دکنی شاعری تحقیق و تنقید (مضامین) 1988، کلیات ایمان (تحقیق وتدوین) 1988، دکنی غزلوں کا انتخاب 1991، حرف نم دیدہ (شاعری) 1992، تحقیقی نقوش 1993، نوادرات تحقیق (تحقیق وتنقید) 1996، ڈاکٹر محی الدین قادری زور خصوصی مطالعہ 1999، مقالات اثر 2000، مثنوی اشتیاق نامہ (تدوین) 2000، دیوان عبداللہ قطب شاہ 2000، نعت رسولؐ خدا (نعتیہ شاعری) 2000، انوار خطِ روشن (نعتیہ شاعری) 2003، نگارشات اثر (تبصرے ومقدمے) 2004، تحقیقات اثر (تحقیق) 2005، خرابے میں روشنی (شاعری) 2006، لفظوں کی مہک (مرتب) 2007، 'اللہ جل جلالہٗ (مجموعہ حمد نعت) 2007، تحقیقات وتاثرات (تحقیق وتنقید) 2008، غواصی کا نایاب کلام (تدوین) 2009، مثنوی پند دل بند (تحقیق وتدوین) 2009، مثنوی

نجات نامہ 2009، انکشافات (تحقیق وتنقید اور تدوین) 2009، رنگ، خوشبو، روشنی (مرتب) 2010، قدیم اردو غزل (تنقید و انتخاب) 2001، انتخاب داؤد اورنگ آبادی 2012، بصارت سے بصیرت تک (تحقیقی وتنقیدی مقالات) 2012، دکنی ادب کی تحقیق 2012 مکاتیب مشاہیر 2013، انبساط فکر 2014 اشراق ادبیات دکن 2015، قطب شاہی دور میں اردو غزل 2015، روشن فلک 2015 وغیرہ

محمد علی اثر نے جب لکھنا شروع کیا تو ان کی غزلیں اور مضامین 1975 سے باضابطہ طور پر ہندو پاک کے معروف رسائل وجرائد میں شائع ہونے لگے۔ پھر ان کے قلم میں ایسی روانی آئی کہ انھوں نے اردو ادب کے لیے بڑا سرمایہ تیار کیا، کئی درجن کتابیں، مخطوطے اور اپنی شاعری کے کئی مجموعے منظر عام پر لائے۔ انھوں نے حمد اور نعتیہ کلام بھی لکھا اور اپنی غزلوں میں حسن وعشق کے تذکرے بھی کیے۔

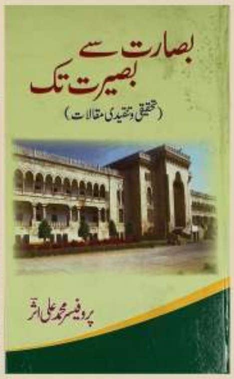

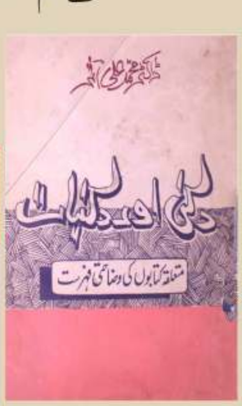

پروفیسر محمد علی اثر نے 1982 میں نظامس اُردو ٹرسٹ اور ادارہ ادبیات اردو کی چھٹی جلد مرتب کی۔ اس کے بعد تذکرۂ مخطوطات کی پہلی، دوسری اور تیسری جلد پر ترمیم واضافے بھی کیے۔ 2007 میں نصیر الدین ہاشمی کی مرتب کتاب 'کتب خانہ سالار جنگ کے اردو مخطوطات' (جلد اول) کو نظر ثانی اور ترمیم کے ساتھ مرتب کیا۔ پرفیسر محمد علی اثر صاحب کو جن اداروں، تنظیموں اور اکادمیوں نے ان کی تصنیفات وتالیفات اور کارناموں کو انعامات واکرامات سے نوازا وہ یوں ہیں: اتر پردیش اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی، مغربی بنگال اردو اکادمی، راجستھان اردو اکادمی، آندھرا پردیش اردو اکادمی وغیرہ۔ مجموعی ادبی خدمات پر آل انڈیا میرا کیڈیمی نے 1993، میں 'میر ایوارڈ' سے نوازا اور آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی نے ڈاکٹر زور ایوارڈ برائے تحقیق 'کارنامہ حیات ایوارڈ' 2004 میں سرفراز کیا۔

اپنے فن، ادبی سفر اور کارناموں کے تعلق سے پروفیسر محمد علی اثر اپنی تصنیف 'بصارت سے بصیرت تک' میں لکھتے ہیں کہ:

''ربِ کریم کے فضل وعطا اور حبیب کبریاؐ کے صدقے میں اپنے چار دہوں پر مشتمل ادبی سفر کے دوران، صرف تحقیق وتدقیق اور تدوین وترتیب سے ہی سروکار نہیں رکھا بلکہ شعروسخن کی مختلف اصناف، حمد و مناجات، نعت ومنقبت، غزل، نظم، رباعی، قطعہ، نثری نظم، ثلاثی، ماہیا، ہائیکو وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ نیز مخطوطات اور مطبوعات کی توضیحی فہرستیں مرتب کی ہیں۔ بعض فہرستوں اور کتابوں پر نظر ثانی اور ترمیم واضافے بھی کیے ہیں۔ اس طرح اب تک خاکسار کی پچپن کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان میں میری شخصیت اور فن پر لکھی جانے والی کتابیں شامل نہیں۔''

(بصارت سے بصیرت تک، تحقیقی وتنقیدی مقالات، پروفیسر محمد علی اثر، فروری 2012، دہلی، ص7)

پروفیسر محمد علی پر جو کتابیں لکھی گئیں یا مرتب کی گئیں ان میں سے چند کا تذکرہ یہاں ضروری ہے جیسے: 'محمد علی اثر: ایک مطالعہ' ڈاکٹر محمد عطاء اللہ خاں، 'محمد علی اثر: شخص شاعر اور محقق' ڈاکٹر عتیق اقبال، 'محمد علی اثر کی حمدیہ ونعتیہ شاعری' ڈاکٹر راحت سلطانہ، 'صاحب فکر ونظر محمد علی اثر' ڈاکٹر امۃ الرحیم وغیرہ، اس کے علاوہ ان پر مختلف رسائل کے خصوصی گوشے شائع ہوئے۔ جن میں ماہنامہ شاعر، ماہنامہ رنگ و بو، سہ ماہی ادبی محاذ، سہ ماہی شمس وقمر، ماہنامہ لفظ لفظ وغیرہ۔ جامعاتی سطح پر محمد علی اثر کی ادبی خدمات اور ان کے کارناموں پر اسکالروں نے ڈگریاں حاصل کیں، اس ضمن میں ان پر کئی تحقیقی مقالے لکھے گئے جیسے: بہار یونی ورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ 'محمد علی اثر کی ادبی خدمات' از سید بشارت علی، حیدرآباد یونی ورسٹی سے ایم فل کا مقالہ 'محمد علی اثر... شخصیت شاعر' از شفیق سلطانہ، عثمانیہ یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کا مقالہ محمد علی اثر کے فن پر حمیرہ فاطمہ نے تحریر کیا۔ مرہٹواڑہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کا مقالہ 'محمد علی اثر... حیات اور ادبی خدمات' از ارفاق فاطمہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر محمد علی اثر نے اردو ادب کی متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ چاہے شعری ہو یا نثری لیکن ان کا اصل میدان تحقیق وتنقید رہا ہے۔ تحقیق میں بے شمار چیزیں دلائل کے ساتھ انھوں نے پیش کی ہیں۔ تنقید میں انھوں نے بیباکی سے کام لیا ہے اور فن پاروں پر تنقیدی آرا پیش کی ہیں اور مصنف کی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہوئے خامیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ دکن کے مشہور ومعروف شاعر محمد قلی قطب شاہ کی شاعرانہ عظمت، کمالات، مشاہدات اور فنی تجربات پر محمد علی اثر نے کئی مضامین لکھے ہیں۔ ان پر اپنی تنقیدی آرا بھی پیش کی ہیں اپنے ایک مضمون بعنوان 'محمد قلی کی شاعری' میں لکھتے ہیں:

''دکنی ادب کے بعض نقادوں نے محمد قلی کی شاعری کو الہامی قرار دیا ہے۔ لیکن محمد قلی کے ہاں نہ تو مضامین غیب سے آتے ہیں اور نہ ہی اس نے عرش سے ادھر کی باتیں کی ہیں وہ تو اسی عالم رنگ وبو کا ایک مغنی ہے۔ اس نے اپنے مشاہدات اور محسوسات کو سادگی اور حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہی اس کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے۔''

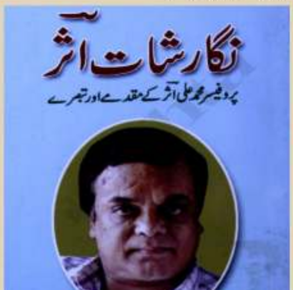

(دکنی شاعری، تحقیق وتنقید، محمد علی اثر، جنوری 1988، چھتہ بازار حیدر آباد، ص72)

دکنی شاعری کا وسیع مطالعہ کرتے ہوئے محمد علی اثر نے غواصی کے کلام پر اپنی ناقدانہ رائے پیش کی ہے مضمون 'مثنوی سیف الملوک وبدیع الجمال اور اس کا مصنف' میں یوں رقم طراز ہیں:

''غواصی کی دیگر مثنویوں کی طرح 'سیف الملوک وبدیع الجمال' بھی فارسی تصنیف سے اخذ وترجے کی

حیثیت رکھتی ہے لیکن اس مثنوی کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ شاعر نے اصل قصے کا من وعن ترجمہ نہیں کیا بلکہ صرف قصے کا ڈھانچہ مستعار لیا ہے۔ جزئیات وواقعات کی پیشکشی میں نہ صرف ترمیم واضافے اور تغیر و تصرف سے کام لیا ہے بلکہ قصے کی دلچسپی، دلکشی اور اس کے آب ورنگ میں اضافہ کرنے کے لیے جگہ جگہ اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو بڑی آزادی کے ساتھ بروئے کار لایا ہے اور اس قصے کو بڑی حد تک طبع زاد اور اُپچی بنادیا ہے۔''

(بصارت سے بصیرت تک، تحقیقی وتنقیدی مقالات، پروفیسر محمد علی اثر، فروری 2012، دہلی، ص 79)

پروفیسر محمد علی اثر نے نہ صرف دکن کے قلم کاروں کا مطالعہ کیا ہے بلکہ شمالی ہند کے ادیبوں پر بھی قلم اٹھایا ہے اور بہترین تحقیقی وتنقیدی مضامین قلم بند کیے ہیں۔نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے مضمون بعنوان 'نظیر اکبر آبادی کے واقعات حیات' میں اثر صاحب لکھتے ہیں:

''غزل اور مثنوی جیسی مروّجہ اصناف سخن سے ہٹ کر نظیر نے نظم کی مختلف ہیئتوں کو اپنے شعری اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ انھوں نے اردو نظم کو ایک ایسے دور میں ذریعۂ اظہار بنایا جب کہ تمام اصناف سخن پر غزل کی حکمرانی تھی۔ حالی اور آزاد سے بہت پہلے تن تنہا انھوں نے اردو نظم کی روایت کا آغاز کیا تھا۔نظیر کے کلام میں زندگی کی رنگارنگی اور حرارتِ شاعری کے روپ میں سمائی ہوئی ملتی ہے۔اردو شاعری کی تاریخ میں نظیر اپنے وجود سے خود ایک دبستان اور ایک عہد تھے جو انھیں سے شروع ہوکر انھیں پر ختم ہوتا ہے۔''

(بصارت سے بصیرت تک، تحقیقی وتنقیدی مقالات، پروفیسر محمد علی اثر، فروری 2012، دہلی، ص 360)

پروفیسر محمد علی اثر نے تحقیق وتنقید کے تقریباً ہر گوشے کو موضوع بحث بنایا ہے۔ جہاں وہ کسی فن پارے کے ماخذ کو سامنے لاتے ہیں وہیں وہ کسی فن پارے کے اصل مصنف کی تلاش بھی کرتے ہیں۔ جہاں وہ کسی فن پارے پر تنقیدی رائے قائم کرتے ہیں وہیں وہ تنقید کے اصولوں اور تنقید کی شاخوں پر بھی بات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تقاریظ اور تذکروں میں تنقید کے ابتدائی نقوش جو ملتے ہیں اس حوالے سے انھوں نے اپنا تحقیقی نقطۂ نظر بھی پیش کیا ہے۔جیسا کہ 'اُردو کی پہلی تقریظ اور اس کا خالق' مضمون میں وہ اردو تنقید کی ابتدائی شکل اور تنقیص کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اُردو میں نقد وتنقید کے ابتدائی نمونے تقاریظ، تذکروں اور مشاعروں میں ملتے ہیں۔ جہاں تک تقریظ

> غزل اور مثنوی جیسی مروّجہ اصناف سخن سے ہٹ کر نظیر نے نظم کی مختلف ہیئتوں کو اپنے شعری اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ انھوں نے اردو نظم کو ایک ایسے دور میں ذریعۂ اظہار بنایا جب کہ تمام اصناف سخن پر غزل کی حکمرانی تھی۔ حالی اور آزاد سے بہت پہلے تن تنہا انھوں نے اردو نظم کی روایت کا آغاز کیا تھا۔ نظیر کے کلام میں زندگی کی رنگارنگی اور حرارتِ شاعری کے روپ میں سمائی ہوئی ملتی ہے۔اردو شاعری کی تاریخ میں نظیر اپنے وجود سے خود ایک دبستان اور ایک عہد تھے جو انھیں سے شروع ہوکر انھیں پر ختم ہوتا ہے۔

کی روایت اور اس کے مفہوم کا تعلق ہے۔ایسی عبارت یا مضمون کو تقریظ کہا جاتا ہے جس میں کسی مصنف یا تصنیف کے زیادہ سے زیادہ محاسن اور خوبیوں کو اُبھارا جائے۔اس کے برعکس اگر کسی فن پارے کے صرف معائب اور نقائص پر روشنی ڈالی گئی ہو اور اس کے محاسن اور خوبیوں کو نظر انداز کیا گیا ہو تو اُسے تنقیص کہیں گے۔''

(بصارت سے بصیرت تک، تحقیقی وتنقیدی مقالات، پروفیسر محمد علی اثر، فروری 2012، دہلی، ص 23)

پہلے پہل فارسی میں ہی اردو تصانیف یا شعری مجموعوں پر تقریظیں لکھی گئی ہیں۔غالب نے ہی اس روایت کو بدل ڈالا، انھوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں تقاریظ لکھی ہیں۔غالب کی زبانِ ندرت اور انداز بیان میں تقریظ کا لطف ہی کچھ اور ہے۔پروفیسر محمد علی اثر کا ماننا ہے کہ مرزا غالب کو تقریظ لکھنے کا انوکھا انداز آج بھی تسلیم اور اپنی مسلم اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ غالب وہ واحد ادیب ہیں جنھوں نے فارسی اور اردو میں بھی تقاریظ لکھے ہیں۔

پروفیسر محمد علی اثر کی فنکارانہ صلاحیتوں کو اردو ادب کی کئی سر کردہ شخصیتوں نے سراہا ہے اور ان پر اظہار خیال بھی پیش کیا ہے۔ چونکہ مقالے کی تنگ دامنی کو دیکھ کر یہاں وہ سب آرا پیش نہیں کی جاسکتی ہیں۔

اردو کے نامور ادیب جمیل جالبی ان سے کافی متاثر ہوئے، وہ لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر محمد علی اثر کی تحقیق میں گہرائی بھی ہے اور تنقیدی شعور بھی اور ایک اچھے مصنف کی طرح اپنی تحقیق کو اچھے اسلوب میں پیش کرنے کا سلیقہ بھی۔''

(ڈاکٹر محمد علی اثر، مکاتیب مشاہیر 2013، تاثرات مشاہیر اردو)

آخر میں پروفیسر حشمت فاتحہ خوانی کے وہ الفاظ جو انھوں نے 'دکنی ادب کا ناقابل تلافی نقصان' کے عنوان سے پروفیسر محمد علی اثر کے سانحہ پر قلم بند کیے ہیں پیش خدمت ہیں:

''ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے بعد دکنی ادب میں آپ کا کوئی ثانی نہیں۔انھوں نے ڈاکٹر زور کے بعد دکنی ادب کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچادیا۔اثر صاحب کا شمار نابغۂ روزگار شخصیات میں ہوتا ہے۔سیکڑوں ڈاکٹرس، پروفیسرس، اساتذہ، ریسرچ اسکالرس، طلبا وطالبات نے استفادہ کیا۔باوجود ناسازی طبیعت کے وہ اس طرح رہنمائی کرتے، احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ صاحب فراش ہیں، بلا کے ذہین وفطین حافظہ، اتنا قوی کہ دکنی مخطوطات کے بارے میں بھی ایسا اظہارِ خیال کرتے گویا کل کی بات ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی بھی آپ کے مرنجان مرنج شخصیت اور خدمات کے معترف تھے۔''

(پروفیسر حشمت فاتحہ خوانی، ماہنامہ ہندوستان گیزٹ اردو، 25 اپریل 2024)

المختصر دنیائے اُردو ادب کا یہ درخشندہ ستارہ جس نے وسیع ذخیرہ سرمایہ ادب تیار کیا ہے۔اردو والوں کے دلوں میں ہمیشہ رہے گا۔ راقم دورانِ تحقیق (16 نومبر 2020) حیدرآباد میں اثر صاحب کے گھر جاکر ان سے ملاقات کی۔اثر صاحب پچھلے تین چار سالوں سے وین ٹیلیٹر اور آکسیجن کی مدد سے جی رہے تھے۔زندگی کے آخری سال کافی سخت علالت میں گزرے ہیں۔ڈاکٹر الحاج محمد علی اثر (سابق پروفیسر وصدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونی ورسٹی) ولد حکیم شیخ محبوب کا 74 سال کی عمر میں 24 اپریل 2024 دوران نصف شب انتقال ہوا۔

■

Dr. Nazir Ahmad Ganai S/o Gh Hassan Ganai
R/O: Frisal Kulgam- 192232 (J&K)
Mob.: 7889779687
ghaliburdu2@gmail.com

اقبال مہدی

بنیادی الیکٹرونک سامان اوران کے کمپونٹس (Components)

.1 کنڈکٹر (Conductor): یہ وہ مادہ ہے جس میں برقی رو کی مزاحمت کم سے کم ہوتی ہے۔ یہ اس مادہ کا بنا ہوتا ہے، جو بجلی کے کرنٹ کی کم سے کم مزاحمت (رزسٹنس) رکھتا ہے۔

.2 رزسٹر (Resistor): یہ ایک چھوٹا سا (آلہ/ چیز) مادہ ہوتا ہے جو بجلی کی رو کی پوری طرح سے مزاحمت کرتا ہے۔اس کی میزان،اوہمس Ohm's (اکائی) ہے۔

تبدیل پذیر (ویریئبل) رزسٹر (Variable Resistor) وہ ہوتا ہے جس کی قدر (Value) بدلی جاسکتی ہے/ گھٹائی بڑھائی جاسکتی ہے۔(شکل نمبر 1.1)

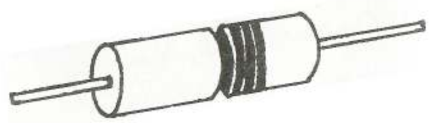

.3 آن آف بٹن (On- Off- Switch):
ایک سادہ آن آف بٹن ایک ایسا پرزہ/ آلہ ہے جب یہ آن ہوتا ہے بجلی کی رو (Current) تب ہی یہ ہوسکتی ہے (شکل نمبر 1.2) اور آف(Off) ہونے کی حالت میں (Circuit) سرکٹ میں کرنٹ نہیں بہتا۔

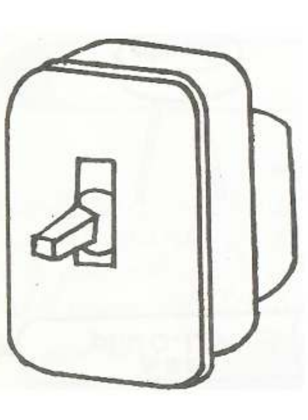

.4 کنڈنسریا کیپسٹر (Condenser or Capacitor) : یہ ایک ترتیب ہے جس میں دو یا زیادہ کنڈکٹنگ پلیٹیں (Conducting Plates) یا سطحیں ہوا سے یا کسی دوسری حاجز (ماحول سے الگ کرنے والی Insulting چیز سے علیحدہ کردیا گیا ہوتا کہ چھوٹی سی جگہ میں زیادہ کپیسٹی (Capacity) (استعداد) حاصل کرسکے۔(شکل نمبر 1.4)

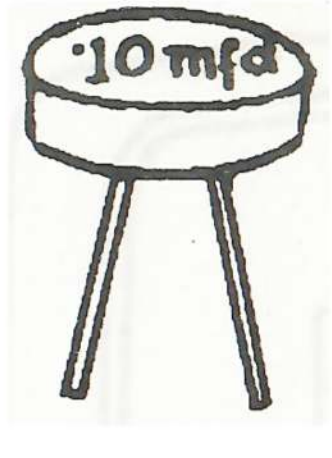

.5 تبدیلی پذیر ویریبل (Variable) کنڈنسر یا گینگ کنڈنسر (Gang Condencer) ان کا لفظی مطلب ہے وہ آلات جن کا سلسلہ ایک دوسرے سے ملا ہوا اور وہ ساتھ کام کرتے ہوں۔ یہ متوازی پلیٹوں کا ایک سیٹ ہوتا ہے جو ایک تکلی/ چرخی سے جڑا ہوتا ہے، اس طرح کہ آدھی پلیٹیں گھومتی ہیں اور آدھی اپنی جگہ پر نصب رہتی ہیں۔ یہ تمام پلیٹیں ایک باریک فلم (Film) سے پرت اسولیٹیڈ (Insulated) رہتی ہیں۔ اس میں ایک نوب (Knaob) تکلی پر لگی ہوتی ہے، جو ہاتھ سے گھمائی جاسکتی ہے۔(شکل نمبر 1.5)

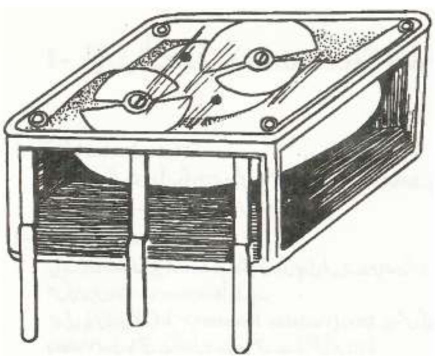

.6 کوائل (لچھا): یہ ایک لچھے کی طرح ہوتا ہے جس پر برقی تار لچھے دار شکل میں لپٹا ہوتا ہے۔ (شکل نمبر 1.6)

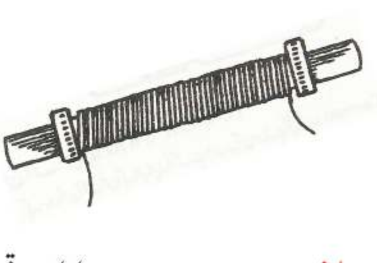

.7 ٹرانسفارمر (Transformer): اس کا کام برقی طاقت کو ایک سرکٹ سے دوسرے سرکٹ میں تبدیل کرنے کا ہوتا ہے۔ دو طرح کے ٹرانسفارمر ہوتے ہیں (1) اسٹیپ اَپ (Step up) (2) اسٹپ ڈاوئن (Step Down) (شکل نمبر 1.6)

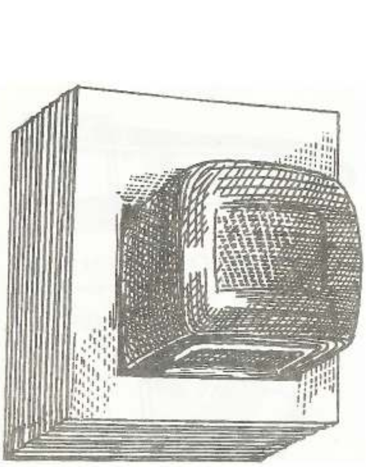

8. ڈائیوڈ (Diode): یہ ایک الیکٹرونک آلہ ہے جس میں صرف دو الیکٹروڈس (Electrodes) ہوتے ہیں۔ (برقی مورچہ) ڈائیوڈس عام طور پر اصلاح کے لیے (Rectifier) کی طرح استعمال ہوتے ہیں (شکل نمبر 1.8)

9. ٹرانزسٹر (Transistor): دو طرح کے ٹرانزسٹرس ہوتے ہیں۔ این۔ پی۔ این اور پی۔ این۔ پی۔ ہر ایک ٹرانزسٹر میں تین ٹانگیں ہوتی ہیں۔ اس میں ایک طرف ایک رنگین نقطہ ہوتا ہے جو ٹانگ (Lead) (لیڈ) نقطے کے قریب ہوتی ہے اسے کلکٹر (Collector) کہتے ہیں۔ درمیانی ٹانگ کو بیس (Base) اور تیسری لیڈ (ٹانگ) کوامیٹر (Ammeter) کہتے ہیں۔ (شکل نمبر 1.9)

10. پرنٹڈ سرکٹ بورڈ (Printed Circuit Board): اس کے دو رخ (Sides) ہوتے ہیں۔ ایک سادی یا نشان لگی ہوئی اور دوسری تانبے کی پرت جس پر چاندی کی گئی ہوتی ہے۔ سارے ترکیبی جزویات (کمپونٹس) سادی طرف پرنٹڈ ہوتے ہیں اور ان پر ٹانکا لگا ہوتا ہے۔ تانبے کی طرف ان ترکیبی جزویات کی ٹانگیں نکلی ہوتی ہیں۔ (شکل نمبر 1.10)

11. ایئرفون (Ear Phone): یہ ایک چھوٹا سا لاؤڈ اسپیکر (Loud Speaker) ہوتا ہے جس کا ڈیزائن ایسا ہوتا ہے جو کان میں لگایا جاتا ہے۔ دو ایئرفون اگر ساتھ میں استعمال ہوں تو یہی ہیڈ فون (Head Phone) بن جاتا ہے۔ (شکل نمبر 1.11)

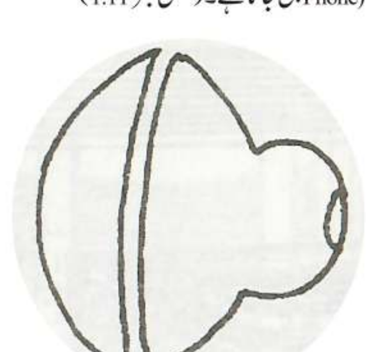

12. کروکوڈائل کلپ اور ساکٹ (Crocodile Clip Socket): یہ جلد اور آسانی سے جوڑنے میں کام آتا ہے۔ (شکل نمبر 1.12)

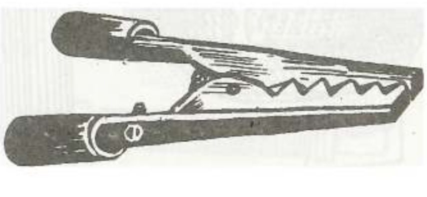

13. مائیکروفون (Microphone): یہ وہ آلہ ہے جو آواز کی طاقت کو بجلی کی طاقت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ (شکل نمبر 1.13)

14. لاؤڈ اسپیکر (Loud Speaker): یہ وہ آلہ ہے جو بجلی کی طاقت کو آواز کی طاقت میں بدل دیتا ہے۔ (شکل نمبر 1.14)

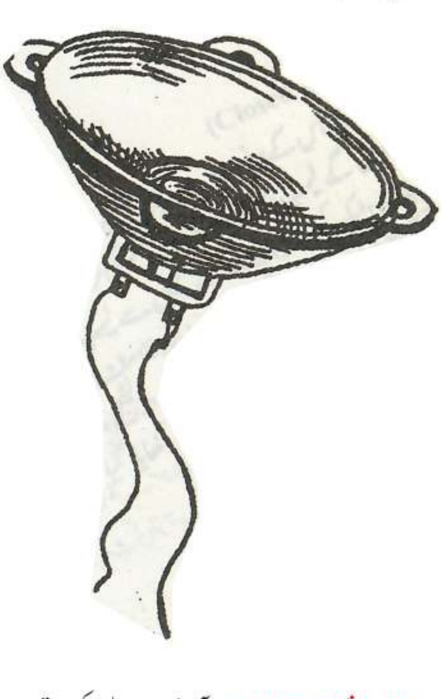

15. اینٹنا (Antenna): یہ آلہ خلا سے ریڈیو کی طاقت لے کر اور اسے اینٹنا کے ذریعے رسیور (Receiver) تک پہنچا دیتا ہے۔

■

ماخذ: الیکٹرونکس ٹیکنالوجی، **پروجیکٹ کوآرڈی نیٹر**: این پی بھٹاچاریہ، **مترجم**: اقبال مہدی، **سنہ اشاعت**: جنوری، مارچ 2005، **ناشر**: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

تراجم

محمد قطب الدین

دستِ شفقت

یوسف ادریس (1927-1991) نہ صرف مصر بلکہ عالم عرب کے مشہور افسانہ نگاروں، ڈرامہ نویسوں اور ناول نگاروں میں سے ایک ہیں، ان کی پیدائش 'البیروم' شرقیہ گورنریٹ، مصر میں 1927 کو ہوئی، ان کی وفات لندن میں یکم اگست 1991 کو 64 سال کی عمر میں ہوگئی۔ موصوف نے 1947 میں بیچلر آف میڈیسن کی ڈگری حاصل کی اور 1951 میں نفسیات میں مہارت حاصل کی۔

قاہرہ یونیورسٹی، مصر میں طب کی اعلی تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی وہ اپنی تحریریں شائع کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ چنانچہ انہی دنوں ان کی کہانیاں 'المصری' اور 'روز الیوسف' نامی جریدوں میں شائع ہونی شروع ہوگئیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'أرخص لیالی' (سستی راتیں) 1954 میں شائع ہوا۔ انھوں نے چند سالوں تک نفسیات کی مشق کی، اور چھوڑ دیا، پھر طب کا پیشہ 1960 تک جاری رکھا، جب اس میں بھی ان کا دل نہیں لگا تو اس سے دستبردار ہوکر کل وقتی ادیب و صحافی بن گئے اور 'الجمهورية' اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

یوسف ادریس عالم عرب کے ایک بے باک و جری افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، ناول نگار اور قلمکار و صحافی کے نام سے جانے جاتے ہیں، وہ اپنی تحریروں میں سماجی و سیاسی مسائل کو اجاگر کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتے۔ عربی ادب میں ان کا اپنا ایک اسلوب ہے جس کی اتباع بعد کے نوجوان ادبا نے بھی کی ہے۔ یوسف ادریس کے مشہور افسانوں میں 'أرخص لیالی' (سستی راتیں)، 'البطل' (ہیرو)، 'بیت من لحم' (گوشت کا گھر) اور 'لیلة صیف' (گرمی کی رات) وغیرہ مشہور ہیں۔ پیشِ نظر کہانی (الید الکبیرة) کا اردو ترجمہ (دستِ شفقت) یوسف ادریس کی مشہور کہانیوں میں سے ایک ہے۔

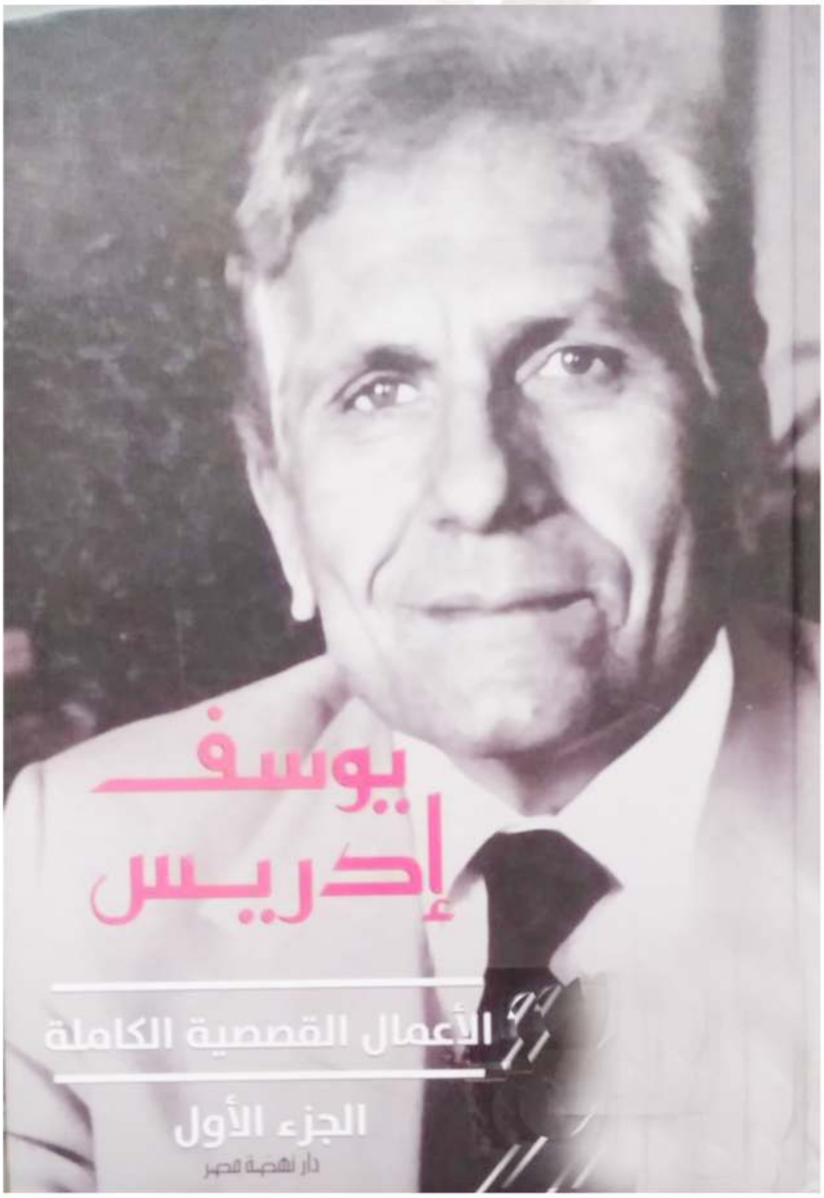

میں ٹرین سے عصر کے وقت اترا، ہمیشہ میں اسی وقت اپنے شہر پہنچتا تھا۔ اسٹیشن ریلوے لائن کے ایک کنارے پر تھا جب کہ میرا شہر دوسرے کنارہ پر۔ سورج پیلا ہو چکا تھا، اس کی زردی میں اطمینان وسکون تھا اور کمزوری بھی۔ ہمارا شہر بھی زرد پڑ چکا تھا، جہاں مٹی کے گھر تھے، وہاں کے درخت یہاں تک کہ کھجور کی چوٹیوں پر بھی زردی چھائی ہوئی تھی۔

اسٹیشن کی کرسیوں پر ہمیشہ بیٹھنے والے لوگوں کے ایک گروپ نے میری طرف دیکھا، کیونکہ خالی بیٹھنے کے لیے یہ جگہ اچھی تھی۔ بیٹھے ہوئے شخص کو نہ تو کوئی بھگاتا اور نہ ہی اس کی کوئی فیس مانگتا۔ اس گروپ نے مجھے ایک ایسی نظر سے دیکھا جو یقیناً ماتم سے بھری تھی۔ میں وہاں سے چل پڑا جبکہ ٹرین ابھی بھی اپنے بدصورت سیاہ سر کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کی آواز سخت اور بھونڈی تھی جو کبھی رکتی نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں چوڑی، گول اور سرخ تھیں جو وقتاً فوقتاً اس کے اندر کھلتی تھیں اور سرخ آگ کی سانس لیتی تھی۔ بچپن میں سب سے زیادہ جس خوفناک سر سے ہم ڈرتے تھے وہ چڑیل کا سر ہوتا تھا۔ اس بار میں نے اس کے سامنے لگے ہوئے لوہے کی سلاخوں کو بغیر کسی چیز کی پروا کیے ہوئے پار کرلیا، مجھے موت کا بھی ڈر نہیں ہوا۔

جس وقت شہر اور میرے گھر کو جانے والے تنگ راستے سے میں گذر رہا تھا اس وقت میرے اندر ایک عجیب وغریب احساس پیدا ہوا کہ آخر کار میں اپنے وطن لوٹ گیا۔ ہمیشہ راستے میں اپنے شہر کے تین یا چار ایسے لوگوں سے ملاقات ہوجاتی تھی جو اسی علاقے میں گھوم رہے ہوتے تھے اور میں انھیں سلام کرتا۔ وہ لوگ میرے سلام کا جواب دیتے اور مجھے دیکھتے ہوئے میرا استقبال کرتے، وہ ان تبدیلیوں کو دیکھتے جو برسوں نے میرے اندر پیدا کردی تھی اور میں بھی ان تبدیلیوں کو دیکھتا جو برسوں نے ان کے اندر پیدا کردیا تھا۔ میں نے انھیں اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ اور جب وہ جوان تھے اس وقت انھوں نے مجھے دیکھا تھا۔ آج نہ تو میں بچہ رہا اور نہ وہ جوان رہے۔

وقت! غدار اور غیر محفوظ وقت جو آگے بڑھتے ہوئے کبھی رکتا نہیں، ہم بھی بڑھنے سے کبھی نہیں رکتے اور اختتام کے قریب جانے سے کبھی نہیں باز آتے۔ ہمیں وقت کا احساس نہیں ہوتا جب تک کہ ہم خود اسے نہ دیکھ لیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وقت نے دوسروں میں کیا کیا تبدیلیاں کی ہیں، چنانچہ ہم امید کرتے ہیں کہ ہم بھی ان کی طرح بوڑھے ہوجائیں گے۔

ہمارے گاؤں کی فضا ہمیشہ پرسکون ہوتی تھی۔ کوئی شور وہنگامہ نہیں، کوئی چیخ وپکار نہیں اور نہ کبھی کوئی جھگڑا فساد۔ ہوا چھتوں کے اوپر رکھی ہوئی لکڑیوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتی، بطخوں کی ٹولی خاموش تھی اور قیں قیں کی آواز نہیں آرہی تھی۔ ہر چیز مٹی کی ہوتی، زمین کے اوپر مٹی ہوتی اور آسمان میں چولہے کا دھواں۔ لوگ خاموشی اور بغیر کسی جوش وخروش کے ساتھ چلتے پھرتے، جیسے کہ انھیں معلوم ہو کہ جلدی کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں اور نقل وحرکت کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لوگ خاموش ہوتے گویا وہ قیامت کے دن کا انتظار کررہے ہیں تا کہ وہ اسی دن بولیں یا موت کے منتظر ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ جیسے ہی میں اس تنگ راستے پر اپنا قدم رکھتا، گھروں کی دہلیز پر خواتین نظر آتیں، مجھے بچپن سے ہی عادت ہوگئی تھی کہ جب میں وہاں سے گذروں تو آنکھیں نیچی کرلوں، خواتین میرے وہاں سے گذرنے کے بعد سرگوشیاں کرنے کی عادی ہوچکی تھیں، جب میں آرہا ہوتا تو مجھے گھور کر دیکھتیں اور پھر سرگوشی کرنے لگتیں۔

مختصر پتلون میں پرائمری تک اس راستے پر میں دسیوں ہزار بار چلا، وہیں میں نے سائیکل چلانا سیکھا، امتحان میں اپنی کامیابی پر خوشی سے بھاگا اور برسات کے موسم میں اسکیٹنگ کی۔ اسی تنگ راستے پر لڑکوں کے ساتھ رات میں کھیلا کرتا۔ اس راستے کے آخری سرے پر میرا گھر ہوا کرتا تھا جس کا دروازہ اور چہاردیواری لوہے کی تھی، اس کے سامنے ہی میری پڑوسن 'بدیعہ' کے گھر کا دروازہ کھلتا تھا، وہ ہمیشہ دروازے کے سامنے کھڑی رہتی اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے اس کے اردگرد ہوتے، اور جب بچے بڑے ہوگئے تو عورتیں اس کے اردگرد رہنے لگیں، وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتی رہتی، کبھی تانبے کے برتن کو رگڑ رگڑ کر صاف کرتی، کبھی اناج سُکھاتی تو کبھی گم شدہ مرغی ڈھونڈتی رہتی۔ جیسے ہی وہ مجھے آتے ہوئے دور سے دیکھتی تو نظر چرا کر دیکھنے لگتی اور خوش ہوتی، پھر وہ اپنے کام میں مشغول ہوجاتی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں ان کے لیے سلامتی کی دعا کروں، جی ہاں! یہ ان کا حق بھی تھا، کیونکہ بچپن میں جب مجھے کھیل کود اور دوڑنے بھاگنے کی وجہ سے پیاس لگتی تو پانی پینے کے لیے میں انھیں کے پاس جاتا کیونکہ اگر گھر جاتا تو مجھے پریشان دیکھ کر ماں کی پٹائی پڑتی، میری خالہ بدیعہ مجھے پانی پلاتی، مجھے بچاتی اور اپنے پاس مجھے چھپا لیتی جب میری ماں میرے اوپر غصہ کرتی، اور جب مار پڑتی تو وہ میرا بچاؤ کرتی، مگر اب میں بڑا ہوچکا تھا، پڑھا لکھا اور سوٹ بوٹ والا ایک تہذیب یافتہ آدمی بن چکا تھا، کیا وہ سوچتی تھی کہ میں اب بھی انھیں یاد کرتا ہوں گا؟ بلاشبہ ان کے ذہن میں یہی ہوتا تھا جب بھی وہ مجھے اپنے بیگ کے ساتھ باہر سے آتے ہوئے دیکھتی تھی، برسوں نے ان کی کمر جھکا دی تھی اور ان کی جلد پر جھریاں ڈال دی تھیں، لیکن ان کی شائستہ مسکراہٹ اب بھی باقی تھی۔

میں نے پوچھا:

آپ کیسی ہیں بدیعہ خالہ؟

انھوں نے اپنا سر اٹھایا، میں نے ان کی آنکھوں میں زبردست خوشی اور ان کے ہاتھوں کو پریشان دیکھا جب انھوں نے اپنے کپڑے کے اوپر سے مٹی صاف کی۔ وہ مسکرانے ہی والی تھی مگر انھوں نے اسے ایک شفقت اور ماتم بھری آواز کے ساتھ روک لیا۔ اس آواز نے مجھے ہلا کر رکھ دیا کیونکہ میری خالہ بدیعہ ایسی نہیں تھی۔ میری خیریت پوچھتے ہی سارا کام چھوڑ کر جلدی سے کھڑی ہوتی اور خوشی میں گنگناتے ہوئے دروازہ کھولتی اور کہتی:

وہ آگیا... وہ آگیا...

ہمارے گھر میں اس وقت کافی شور مچ رہا تھا، گھر والوں نے مجھے چھ ماہ یا سال بھر سے دیکھا نہیں تھا، وہ ہمیشہ میرے لیے ترستے رہتے تھے، میں نے کم عمری میں ہی گریجویشن کرلیا، جس دن سے میں نے گریجویشن کیا میں نے انھیں کبھی کبھار ہی دیکھا تھا، گھر والے مجھے بہت پیار کرتے تھے۔

ہمارا دروازہ کھلتا تھا اور میرے ایک سے زیادہ بھائی ننگے پاؤں اور اپنے لباس میں اور کبھی کبھی ٹی شرٹ اور پتلون میں باہر آکر ان میں سے ہر ایک میرے گلے سے چمٹ جاتا۔ اپنے بڑے بھائی کے لیے ان کی خوشی ناقابل بیان ہے، ایسی خوشی جو ان کی زبانوں پر چیخوں اور خوشیوں کے ساتھ نمایاں ہوتی تھی، اور وہ صرف یہ کہتے:

خوش آمدید..... خوش آمدید.....

میں بھی انھیں اپنے دل اور بازوؤں سے گلے لگاتا تھا کیونکہ وہ میرے بھائی تھے اور میں بھی ان سے پیار کرتا تھا۔ میں جس شہر میں رہتا تھا وہ کشمکش سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں میری زندگی محصور تھی جہاں میں اپنے اور دوسروں کے وجود کا دفاع کرتا تھا، میں بڑی طاقت کے سامنے کھڑا تھا، میرا دل تنہا تھا، میں لوگوں کو ناپسند نہیں کرتا تھا، بلکہ ان پر ترس آتا تھا۔ میرے دوست تو بہت تھے مگر ایسی محبت کا احساس بس یہیں پر ہوتا تھا۔ ایک ایسی محبت جو منفرد تھی اور اتھاہ بھی۔ ایسی محبت جسے محسوس کیا جاسکتا تھا اور تجربہ بھی، اسے نہ تو کوئی چھپاتا اور نہ اس میں کوئی بخالت کرتا۔

میں بھائیوں سے گلے ملتا اور بہت کوشش کرتا کہ ان کے ننھے ننھے بازوؤں سے کب چھٹکارا پاؤں تاکہ

اپنے والد سے مل سکوں، کیونکہ میں ہمیشہ ان سے ملاقات کے لیے ترستا تھا، میں ان کا سب سے بڑا اور چہیتا بیٹا تھا۔ میری صورت حال کا تقاضا تھا کہ میں ایک پختہ آدمی نظر آؤں اور میں ایسا کرتا بھی تھا، مگر میں ہمیشہ والد سے ملنے کو ترستا تھا، اپنے بچپن کو بھی ترستا تھا، میں تمنا کرتا تھا کہ کاش مرد کا لبادہ پھینک اپنے بچپن میں لوٹ جاؤں یا بچوں کی طرح ہوجاؤں تا کہ بچہ لگوں اور یہاں تک کہ بچہ ہونے کا احساس ہوجائے۔ میں اپنے والد سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا، میں جیسے ہی دروازے سے داخل ہوتا وہ جس کام میں بھی مشغول ہوتے اسے چھوڑ کر کھڑے ہوجاتے، وہ اپنا چوغہ پہنے ہوتے، ان کا سر ننگا اور سینہ کھلا ہوا ہوتا، وہ حیرت میں خوش ہوتے۔ وہ اپنے جوتے یہاں وہاں ڈھونڈنے لگتے تا کہ جلدی سے مجھ سے ملیں۔ کیونکہ وہی مجھ سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ دنیا میں وہ تمام چیزوں سے زیادہ مجھ سے ہی پیار کرتے۔ وہ ہمارے بڑے گھر کے دروازے پر کھڑے ہوتے اور دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر میرا استقبال کرتے ہوئے کہتے:

خوش آمدید... کہاں غائب تھے میاں!

میں جلدی سے ان کے سینے سے لگ جاتا اور وہ بھی مجھے اپنے سینہ سے لگا لیتے، نہ جانے کتنی بار میں ان کے سینے سے لگا اور کتنی مرتبہ انھوں نے مجھے اپنے سینے سے لگایا، میں تمنا کرتا تھا کہ زندگی بھر ان کے سینے سے چپٹا رہوں، جب میں چھوٹا تھا تو ان کی پنڈلیوں کے برابر ہوتا اور ان سے لپٹ جاتا۔ پھر جب میں بڑا ہوا تو اپنے دونوں ہاتھوں سے ان کی کمر کو پکڑ لیتا۔ اس وقت میری خوشی کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ پھر میں مزید بڑا ہوا اور ان کی طرح لمبا ہوگیا۔ جب میں ان کی پنڈلیوں کے برابر تھا تب سے زیادہ اب میں ان سے پیار کرتا ہوں، ان کو گلے لگاتا ہوں اور بے تابی کے ساتھ ان کو چومتا ہوں، میں ان کی گردن کی جھریوں کو دیکھتا ہوں، مجھے وہ جھریاں، ان کے سینے کے بال جو کہ سفید ہو چکے ہیں اور جسے میں ان کی قمیص کے سوراخ سے جھانک کر دیکھتا ہوں، ان کی اندرونی جلد کا ہلکا رنگ، ان کا بھورا چہرہ، ان کی نرم و باوقار ناک اور ان کی آنکھیں جو نیکی اور محبت سے بھری ہیں مجھے بہت پسند ہیں۔ میں اپنے والد کو بہت زیادہ بوسہ دیتا تھا اور وہ بھی مجھے بوسہ دیتے تھے، ان کی آنکھیں آنسو سے ڈبڈبا جاتیں اور کہتے: ارے مولانا! تم سے ملنے کا کتنا دل چاہتا تھا!

ان لمحات میں میں خاموش رہتا اور محسوس کرتا کہ میرے اندر جان واپس آ چکی ہے اور میں بڑے شہر میں کھو چکا ہوں، تنہا ہوں، جبکہ یہاں میرے والد ہیں... ہمارا گھر ہے۔ یہاں میں ایک ایسا انسان ہوں جو اپنے حسب و نسب کو اور اس دھرتی کو پہچانتا ہے جہاں وہ پروان چڑھا ہے۔

میرے والد گلے ملنے کو ختم نہیں کرنا چاہتے تھے، میرے اردگرد میرے بھائی مجھ سے بیگ چھین کر میرے کپڑوں سے چمٹ جاتے اور ایک دوسرے سے گلے ملتے۔ اور میری ماں! میں جانتا تھا کہ وہ اس وقت سونے کا بہانہ کر رہی ہوتی اس انتظار میں کہ میں ان کے پاس جاؤں اور انھیں آواز دوں، مگر وہ مجھے کوئی جواب نہیں دیتیں جیسے وہ کافی میٹھی نیند میں ہوں، اس لیے میں ان کے بستر کے قریب جاتا، ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتا اور اپنے پورے جسم کے ساتھ جھک کر ان کے گورے ہاتھ کو چومتا، تب میری ماں آنکھیں اس طرح کھولتیں گویا گہری نیند سے بیدار ہو رہی ہوں اور اُداس لہجے میں کہتیں:

اللہ تم کو سلامت رکھے۔

میں بے قابو ہوکر ان سے چمٹ جاتا اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیتا، وہ بھی کنٹرول نہیں کر پاتیں اور میرے گال پر بوسہ دیتیں، ان کی آواز لمبی، غمزدہ اور شکایت والی ہوتی، میرے تئیں پیار جتانے کا ان کا یہی طریقہ تھا کیونکہ وہ اپنی محبت کو کبھی ظاہر نہیں کرتیں۔

ہم ان کے بستر کے اردگرد بیٹھ جاتے اور میرا ہر بھائی میرے پاس یا میری ٹانگوں کے اوپر بیٹھنے کے لیے ایک دوسرے کو دھکے دیتا۔ میرے والد ان کو جگہ دینے کے لیے مجھ سے دور ہوجاتے، اگر وہ بھائیوں کی طرح ہوتے تو وہ بھی بیٹھنے کے لیے دوسرے کو دھکا دیتے اور میرے قریب ہی بیٹھتے۔ میری ماں کو زکام اور گٹھیا کی شکایت تھی۔ ان کا سردرد سے پھٹا جا رہا ہوتا تھا، میرے والد کی خوشی ناقابل بیان ہوتی تھی جو ان کی خاموشی اور میرے آرام و آسائش کے سامان مہیا کرانے میں پوشیدہ ہوتی، چنانچہ میری پیٹھ کے پیچھے ایک مسند رکھ دیتے یا ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری زیادہ آرام دہ جگہ پر بٹھا دیتے، ان کی خوشی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ کبھی کبھی اپنے پیروں میں جوتے یا چپل پہننا بھی بھول جاتے۔ ان کے پیر بڑے بڑے تھے۔ جب میں چھوٹا تھا تو میں اپنے والد کے پیروں پر اپنا چہرہ رگڑنے اور ان کے پیر کی انگلیوں سے کھیلنے کا بڑا شوقین تھا۔ مجھے ان کے پیروں اور ان کی انگلیوں کی لمبائی دونوں پر بڑا فخر تھا۔

ہم سب ایک جگہ بیٹھتے تھے، ہمارا خاندان زندگی کا سامنا کر رہا ہوتا تھا۔ مگر وہ ایک ایسا لمحہ تھا جہاں خلوص ہوتا، ایک ایسی گھڑی تھی جس میں دُکھ اور پریشانیاں ختم ہوجاتیں اور صرف پیار، محبت، چھوٹے چھوٹے بکھرے ہوئے الفاظ اور ہنسی، جی ہاں! خلوص والی ہنسی ہی باقی رہ جاتی تھی، خاندان چھوٹا ہوتا اور زندگی بڑی، راستہ دشوار مگر وہ بھی کٹ جاتا، گیس سے چراغ جلتا تھا، گھر کا کمرہ دیہاتی طرز کا ہوتا تھا، تخت پر مچھردانی ہوتی اور صوفہ تنگ ہوتا۔ گرمی کے موسم میں ہم دروازے کے سامنے کھلے آسمان کے نیچے بیٹھتے اور میرے والد محترم ہمارے بیچ خدا کی طرح بیٹھے ہوتے۔ ہم سب ان کو بہت چاہتے تھے اور ان کی باتوں میں کھو جاتے۔ ان کی باتیں کتنی پیاری ہوتی تھیں! جب وہ باتیں کرتے تو ہم سب خاموش ہوجاتے اور انتظار کرتے، وہ مسکرا کر اپنی باتیں شروع کرتے اور ان کی یہ مسکراہٹ دوران گفتگو باقی رہتی، ان کی آواز میٹھی اور بھری ہوئی ہوتی، ان کا طریقۂ کلام ہمیں مسحور کر دیتا تھا۔

اگر کبھی گواہ کے طور پر کورٹ چلے جاتے تو وہاں کی پوری کہانی ہمیں سناتے، ہم سب ان کی کہانی کو بہت پسند کرتے اور وہ وہیں سے شروع کرتے جہاں سے ہم لوگ چاہتے، وہ ہمیں نہایت دلچسپ تفصیلات بتاتے اور ہمارے ساتھ تفریح کرتے، پھر دوسری کہانی شروع کر دیتے۔ ہمیں اس کا بالکل احساس ہی نہیں ہوتا کہ ایک کہانی کب شروع ہوئی اور دوسری کب ختم ہوگئی۔ ہم اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے تھے، ہم اپنے والد کو ٹوٹ کر چاہتے تھے اور ان کی فرماں برداری کرتے تھے۔

بہرکیف، اس مرتبہ میری خالہ بدیعہ مجھے دیکھ کر نہ تو کھڑی ہوئی، نہ اس نے اپنا کام کاج چھوڑا اور نہ ہی میری آمد کی خبر کسی کو دی، بلکہ میرے سلام کا جواب دیا اور اپنا سر جھکا لیا اور برتن مانجھنے میں مشغول ہوگئی۔ میں نے ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا اور اپنے گھر کا رُخ کیا، صحن کا دروازہ کھلا ہوا تھا، دروازہ لوہے کا تھا جس سے ہوا اٹکھیلیاں کر رہی تھی، جس سے اس کے جوڑ تنگ ہوجاتے تھے، دروازے کے پیچھے ایک مرغی اپنے آپ میں سکڑی بیٹھی تھی اور ایک بچہ پیشاب کر رہا تھا۔ میں اندر داخل ہوا، وہاں پہلے ہی جیسا سکون تھا، لیکن ہمارا گھر وہ گھر نہیں تھا، یہ اب زیادہ وسیع اور زیادہ اونچا تھا، اس میں کافی خالی جگہ تھی، میں اندر کی طرف چند قدم چلا۔ صحن ویسا ہی تھا، پتھر سے گھرا پانی کا ایک موٹر موجود تھا، پانی حوض سے لیک کر رہا تھا اور اپنے لیے چینلز بنا رہا تھا، پہلے کی طرح پیڑ بکھرے ہوئے تھے۔ کھجور کا پیڑ بڑھ چکا تھا اور اپنے آس پاس کے چھوٹے کھجور کے پیڑوں کو ختم کر کے دیوار سے بھی بڑا ہو چکا تھا، پانی کی زیادتی سے انگور کی بیلیں سوکھ چکی تھیں، صحن کے ایک سرے پر موجود کبوتر کا گھونسلہ سفید

تھا جو ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا۔ باورچی خانے کا دروازہ ٹوٹا پھوٹا کالا پڑا تھا اور تاریکی اس کے اندر سے پھیل رہی تھی، زمین پر کوڑا کرکٹ پھیلا ہوا تھا حالانکہ صحن کافی بڑا تھا۔

گھر کا دروازہ کھلا تھا مگر نہ تو دروازے کے باہر کوئی تھا اور نہ اندر، اور نہ کوئی میرا انتظار کر رہا تھا، تمام چیزیں بیکار تھیں، دنیا سرد پڑ چکی تھی، سورج کی زردی بڑھ چکی تھی اور کھجور کے چھوٹے درخت کے سائے کی لمبائی ہمارے گھر کی لمبائی سے زیادہ ہو چکی تھی۔

میں گھر کے اندر داخل ہوا۔ بڑا ہال اب اس سے بھی بڑا تھا جتنا میں نے پچھلی بار دیکھا تھا، چھت اونچی تھی اور زیادہ نمایاں، صوفے، گندے اور مسند دبے دبے، کمرے بند تھے اور وہاں کوئی آواز نہیں تھی۔

سیڑھیوں کی طرف جانے والے دروازے کے اوپر کبوتر برآواز نکال رہا تھا، ہمارا کتا جائے نماز پر سو رہا تھا، غیر مرئی پرندے چہچہا رہے تھے، سورج کی ایک کرن سیڑھی پار کر کے ہال کے فرش پر جا گری جس سے پیلی روشنی کا ایک چھوٹا سا دائرہ بن گیا، لاکھوں چھوٹے چھوٹے ذرات اس کرن کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ ہمارا گھر برباد ہو چکا ہے۔

میں واپس باہر آکر سڑک کی طرف چلا گیا۔ میری خالہ بدیعہ مجھے دیکھتے ہی بولی:

کیا کچھ چاہیے؟

میں نے پوچھا:

سارے لوگ کہاں گئے؟

اس نے جواب دیا:

سارے لوگ قبرستان گئے ہیں۔

میں نے پوچھا:

اور گھر خالی چھوڑ گئے؟

اس نے کہا:

میں یہاں ہوں نا۔

اس وقت میں نے خود کو چلتے ہوئے پایا۔

میرا سینہ خالی، تنہا اور غمزدہ تھا، میرے آس پاس کی دنیا بے مزہ لگ رہی تھی، کسی بھی چیز کی کیا اہمیت ہے؟ میں لوگوں کو سلام کروں، وہ اس کا جواب دیں اور پھر مجھے خوش آمدید کہیں، ان سب باتوں کی کیا اہمیت ہے؟ وہ لوگ زندہ ہیں اور میں بھی زندہ ہوں، لیکن جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔

میں گم ہو گیا۔ ہمارا شہر جس کے کونے کونے سے میں واقف تھا وہ کوئی اور شہر لگنے لگا۔ میں ان سڑکوں اور گلیوں سے گزرتا تھا اور ان کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا تھا، میں ان سے اس قدر مانوس تھا گویا وہ ہمارا گھر ہو، آج جب میں وہاں سے گزر رہا تھا تو میں نے اسے پہلی بار دیکھا۔ میں اپنے شہر کو جانتا تھا اور کافی عرصے کی جان پہچان کی وجہ سے میں وہاں کے لوگوں سے مانوس تھا، لیکن میں ان کے پاس سے گزر رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا تو مجھے لگا کہ وہ انسان ہیں، وہ اجنبی ہیں اور تھکے ہوئے ہیں۔ کچھ تو ضرور ہوا ہے۔ میں اب اپنے شہر اور وہاں کے لوگوں کو محسوس کرنے لگا ہوں۔ حالانکہ پہلے سے ہی ان سے مانوس ہوں۔ کچھ تو ضرور ہوا ہے۔

میں گم ہو گیا، کیونکہ میں کافی سالوں تک اپنے شہر سے دور رہا، اس درمیان وہ شہر بڑا ہو گیا اور دور تک پھیل گیا، نئی نئی عمارتیں کھڑی ہو گئیں۔ پہلے میں قبرستان کا راستہ پہچانتا تھا، اسی کے پاس ایک بڑا میدان تھا، جہاں عید کی نماز ہوا کرتی تھی، عید؟ اب وہاں عید کی نماز کیوں نہیں ہوتی؟ اب ہمیں اس کا احساس کیوں نہیں ہوتا؟ اب عید بھی عام دنوں کی طرح آتی ہے اور چلی جاتی ہے، کہاں گیا صبح سویرے کا جگنا، وہ کیک، وہ عیدی، وہ نئے نئے عمدہ لباس، وہ جھولے، وہ جلیبیاں اور حلوے، اور وہ ٹوائے گن جس کی دھماکے دار آواز سے ہم اپنی دادیوں کو ڈراتے تھے؟

میں گم ہو گیا، مگر میں وہاں پہنچ گیا اور شہر کے باہر چلا ہو گیا... لیکن وہ بڑا میدان نہیں مل سکا۔ وہاں پر بہت سارے مٹی کے گھر بن چکے تھے اور قبرستان کی قبریں گھروں کے بیچ سے نظر آتی تھیں۔

ہم کتنے لاپرواہ تھے!

یہ دیکھو میرے سامنے اور آس پاس قبریں ہی قبریں ہیں۔ کچھ قبریں بدحال اور منہدم ہو چکی تھیں، وہاں کوئی چیز ڈرانے والی نہیں تھی، کیا آپ کو معلوم ہے کہ جب ہم بچپن میں دور سے قبرستان کو دیکھتے تھے تو کیوں ڈر جاتے تھے، کیا آپ جانتے ہیں کہ میری دادی، میرے چچا اور میرے ماموں کی قبر کہاں ہے؟ تمام قبریں منہدم ہو چکی ہیں اور بکھر چکی ہیں، آپ شاید ہی ایک کو دوسرے سے فرق کر پائیں گے، فرق کرنے والی چیز صرف کسی قبر کے سرہانے اور کسی کے پائینتی کی جانب رکھی ہوئی کھجور کی ٹہنی ہے جو سوکھ چکی ہے اور بوسیدہ ہو گئی ہے۔ اس کے پتے خراب ہو کر جدا ہو چکے ہیں۔

میں ادھر ادھر گھومتا رہا مگر وہاں کوئی نہیں ملا، بلا شبہ لوگ قبرستان سے اپنے گھر لوٹ گئے ہوں گے۔ مجھے قبر کو پہچاننے میں زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ کیونکہ مجھے اب بھی یاد تھا کہ قبر ایک کپور کے پیڑ کے پاس تھی، اور یہ رہا کپور کا پیڑ... ضرور یہی وہ قبر ہے... میں وہاں رک گیا، قبر کے اوپر کی سیمنٹ ابھی بھی تازہ تھی، اس کی تعمیر اچھی نہیں تھی، کنکر صاف نظر آ رہے تھے۔ قبر کے آگے کی جانب ایک کتبہ لگا تھا جس پر لکھا تھا مرحوم... میں نے اپنے والد کا نام پڑھ لیا، پھر میں اپنے ارد گرد دیکھنے لگا... قبریں منہدم تھیں، کپور کا پیڑ لمبا، اکیلا اور ننگا کھڑا تھا۔ سورج ڈوب رہا تھا، کوے دور سے آپس میں جھگڑ رہے تھے، تاریکی شدید تھی۔

تو پھر میرے والد یہاں پر اس قبر کے اندر ہیں!

اتنے سارے پتھر، مٹی اور سیمنٹ ان کے اوپر ہیں، یہ وہی شخص ہے جو ایک لمحے کے لیے کمرے کی کھڑکی بند رکھنا برداشت نہیں کر سکتا تھا، میرے والد یہاں سو رہے ہیں۔ دھاری دار کتان کے کفن میں لپٹے ہیں اور اس کے اوپر ایک سفید کفن ہے اور ان کے ارد گرد صرف وحشت ہی وحشت ہے۔ ان کی آنکھیں بند ہیں۔ میرے والد یہاں ہیں! وہ سو نہیں رہے ہوں گے کیونکہ وہ اتنی دیر تک سو ہی نہیں سکتے تھے، ضرور وہ بیٹھے ہوں گے... ہاں وہ بیٹھے ہیں... اکڑوں بیٹھ کر وہ درود و سلام پڑھ رہے ہیں اور ان کے بڑے بڑے پیر مڑے ہیں۔ ان کی شہادت کی انگلی حرکت میں ہے اور دونوں آنکھیں نیچی، گویا وہ نماز پڑھ رہے ہوں، یہ دیکھو اب وہ اپنی نماز بھی پوری کر چکے۔ میں نے کہا:

السلام علیکم ابو جان!

انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا، صرف اپنی دونوں بڑی بڑی آنکھوں سے میری جانب دیکھا، میں نے ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو دیکھے، انھوں نے میرے سلام کا کوئی جواب نہیں دیا، وہ غمگین تھے اور نماز پوری کر کے منہ ہی منہ میں کچھ بول رہے تھے۔

میں نے ان سے کہا:

میں یہاں ہوں ابو جان... میں آپ کا چہیتا واپس لوٹ آیا ہوں۔ آپ کیوں نہیں میرے استقبال میں خوش آمدید... خوش آمدید کہتے..

آپ کیوں نہیں پوچھتے:

کہاں غائب تھے میاں؟

انھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھایا اور اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھا کر کچھ دعا مانگی، پھر دونوں ہاتھوں کو اپنے چہرے پر پھیرا اور میری طرف دیکھا، وہ غمگین اور تھکے ہوئے تھے۔ وہ کچھ بھی نہیں بولے۔

میں نے پوچھا: کیا آپ کو معلوم نہیں کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں؟

انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور پپوٹوں کو زور سے بند کر لیا، گویا وہ کہہ رہے ہوں، ہاں... ہاں...

میں نے کہا: کیا آپ کے لیے میری محبت کا کوئی اندازہ لگا سکتا ہے؟

انھوں نے آنکھیں کھولی، ان میں اداسی کی چمک تھی۔

پھر میں نے کہا:

کیا آپ ہمارے لیے سب سے محبوب انسان نہیں ہیں؟

انھوں نے تکلیف میں آنکھیں موند لیں۔

میں نے زور سے کہا:

تو پھر کیوں آپ نے آنکھیں موند لیں اور چل بسے؟

انھوں نے حیرت سے آنکھیں کھولیں اور اپنی سخت اور مستحکم نگاہوں سے مجھے گھورنے لگے۔

ان کی یہ وہی نظر تھی جس سے وہ مجھے دیکھا کرتے تھے جب بھی میں کوئی بڑی غلطی کرتا تھا۔ میں بچپن میں ان کی اس نظر سے بہت ڈرتا تھا۔ ان کے اس گھورنے نے مجھے اتنا ڈرا دیا جتنا اس سے پہلے زندگی میں کبھی نہیں ڈرا۔ میں نے اپنی آواز نیچی کی اور آہستہ سے پوچھا:

نبیؐ کی قسم جو آپ کو بہت پسند تھے! آپ ہمیں چھوڑ کر کیوں چلے گئے؟

میرے والد بھورے رنگ کے تھے اور ان پر بڑی اچھی جھریاں تھیں، جنھیں ہم پسند کرتے اور اکثر بوسہ دیتے، برسوں گزر جانے کے باوجود ان کی شکل ہماری آنکھوں میں نہیں بدلی، ہم بڑے ہوتے، جدا ہوتے اور پھر واپس آتے تو ان کو بھورے رنگ اور بڑی بڑی اچھی جھریوں والا پاتے۔

میرا جی چاہا کہ اسی وقت ان کو بوسہ دوں، مگر اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں ان کا مشتاق ہوں اور میں نے اپنی زندگی ان کے اشتیاق میں ہی گزاری ہے، جب بھی میں گھر واپس لوٹتا اور ان کو دیکھتا تو قسم کھاتا کہ آئندہ چھٹی لے کر کچھ دن صرف ان کے ساتھ گزاروں گا اور آسودگی حاصل کروں گا، کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میری آسودگی سے پہلے ہی وہ چل نہ بسیں... میں نے انہیں بوسہ دینا چاہا اور اس کے لیے ان کی طرف لپکا، لیکن انھوں نے اپنا ہاتھ اپنے گھٹنے کے اوپر سے اس طرح اٹھا لیا جیسے وہ نماز کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں چاہتے ہوں۔ میں رک گیا اور بولا:

میری آسودگی سے پہلے آپ کیوں چل بسے؟

میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے ایک چھوٹا سا آنسو کا قطرہ نکل رہا ہے۔ مجھے وہ لمحہ یاد آیا جب لوگوں نے تابوت کو قبر کے پاس رکھا، پھر انھوں نے اس پر ایک بڑی چادر بچھا دی اور تابوت کا غلاف ہٹا دیا۔ آرام سے ان کو اٹھا لیا تو اب وہ سفید کفن میں چھوٹے ہو گئے، ان کی کمر لوگوں کے ہاتھوں میں تھی، ان کا دایاں ہاتھ جب کفن سے پھسلا تو یقیناً وہ انھیں کا ہاتھ تھا، بالوں اور ہتھیلی والا وہی لمبا ہاتھ جو ہمیشہ ہمارے سروں کو چھوتا اور دعائیں دیتا، وہی ہاتھ جسے ہم چومتے اور چومتے وقت غور سے دیکھتے رہتے، وہی ہاتھ جن کی بڑی بڑی انگلیوں سے ہم اکثر کھیلتے، ان کے رنگ، ان کی لکیریں اور ان کی لمبائی کو ہم پسند کرتے تھے۔

دوبارہ میں نے ان سے پوچھا:

آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ آپ چل بسیں گے؟ میں نے ان کے جواب کا انتظار کیا، مگر وہ کچھ نہیں بولے، میں نے ان کی جانب دیکھا تو پایا کہ وہ ابھی بھی اسی طرح بیٹھے ہیں، مگر ان کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ پیلا اور اترا ہوا تھا، کوئی حرکت نہیں تھی۔ میں نے ان کو ہمارے اس کٹے ہوئے درخت کی طرح پایا جب وہ صحن میں اپنی لمبائی کے ساتھ گرا تھا، اسے کٹے ہوئے کئی دن گزر چکے تھے، اس کے پتے زرد پڑ چکے تھے، مرجھا چکے تھے اور شاخیں ننگی ہو چکی تھیں۔

میں اپنے گھر واپس لوٹ گیا، ابھی بھی صحن کے آخر میں کبوتر کا گھونسلہ سفید تھا اور ادھر اُدھر بکھرا پڑا تھا۔ تندور کے کمرے کا دروازہ ٹوٹا اور سیاہ تھا، اندر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ فرش پر بہت سارا کوڑا کرکٹ پڑا تھا، گھر بہت کشادہ تھا مگر خالی، وہاں اندھیرا، خاموشی اور ٹھہری ہوئی ہوا تھی۔ ہوا کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔

اسی کمرے میں جہاں ہم ملتے تھے اب اکیلے تھے... ہم بیٹھے تھے... میرے بھائی اپنے پورے کپڑے پہنے ہوئے تھے، ان کے معصوم اور جوان چہرے پر اداسی عجیب سی لگ رہی تھی، میری ماں رومال باندھے ہوئے تھی، ان کی ناک، منہ اور آنکھوں میں درد، سرخی اور آنسو تھے۔

ہم غمگین و خاموش بیٹھے تھے۔ گیس والے چراغ کی روشنی لال اور مدہم تھی، دیواروں پر ہمارے سروں کے سائے تھے... ہمارے دلوں کی طرح ایسے سیاہ سائے جو چراغ کی بتی کے بڑے اور چھوٹے ہونے کے ساتھ ساتھ مدہم ہوتے گئے۔ ہم خاموش بیٹھے تھے گویا ہم کسی چیز کا انتظار کر رہے ہوں۔ ہم انتظار کر رہے تھے کہ وہ دروازہ کھٹکھٹائیں گے اور ہم سب اسے کھولنے کے لیے جائیں گے، کیونکہ وہ آ چکے... مسکراتے ہوئے، اپنی ٹوپی پیچھے دھکیلتے ہوئے جیسا کہ ان کی عادت تھی، اپنے دونوں بازوؤں اور سینہ کھول کر تا کہ وہ ہماری ہر پریشانی اور مصیبت کو اپنے اندر سمو لیں... وہ ضرور غسل خانے میں ہیں، ابھی فوراً وہ نکلیں گے... وہ کھنکاریں گے اور کھانسیں گے جسے ہم جانتے تھے اور اس سے مانوس ہو چکے تھے۔ ان کی کھانسی کے بغیر ہم اپنے گھر کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ کیا وہ واقعی صحن میں کھڑے ہو کر پڑوسی سے باتیں کر رہے ہیں اور دور سے ان کی آواز ہم تک پہنچ رہی ہے؟ ان کی کتنی خوبصورت آواز تھی جب دور سے ہم تک پہنچتی تھی! ہم اپنے والد کی آواز کو خوب پہچانتے تھے۔ ہم ہزار آواز میں ان کی آواز کو پہچان جاتے اور ہزاروں آوازوں میں سب سے زیادہ ان کی آواز کو ہم پسند کرتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمارے والد آس پاس میں ہی ہیں اور ابھی آتے ہی ہوں گے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم ان کے اردگرد، ان کی گود میں، ان کی آنکھوں، ان کی باتوں اور ان کے سینے کے بالوں کے قریب ہوں گے۔

مگر جس چیز کا ہم انتظار کر رہے تھے، وہ نہیں ملا۔ نہ تو کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور نہ ہم نے کوئی آواز سنی، سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ ہمیں یقین تھا کہ نہ تو کوئی دروازہ کھٹکھٹائے گا اور نہ ہی ہمیں کوئی آواز سنائی دے گی۔

چراغ کی روشنی تقریباً بجھ رہی تھی اور اس کی گیس خالی ہو رہی تھی، ہمارے سائے دیواروں پر ڈھل رہے تھے اور مدہم ہو رہے تھے۔ میں ایک عجیب و غریب احساس میں مبتلا تھا مگر مجھے اس کا علم نہیں، ایسا احساس کہ میں اپنی زبان کی نوک سے چکھ سکتا تھا اور اس کی گرفت کو اپنے سینے کے گرد محسوس کر سکتا تھا، احساس اس بات کا کہ میں غمگین ہوں... میں غمگین ہوں۔

میں نے اپنے بھائیوں کے چہروں کو دیکھا... ان کے چہرے مرجھائے، خاموش اور حیرت زدہ تھے۔

ان لوگوں نے بھی میری طرف دیکھا...

اچانک گویا ہمیں ایک ہی خیال نے ڈنک مارا اور ہم سب کے آنسو چھلک پڑے۔ صرف اسی وقت ہمیں احساس ہوا کہ واقعی ہمارے والد اس دنیا سے کوچ کر چکے ہیں اور ہمیشہ کے لیے ہم ان سے محروم ہو گئے ہیں۔ اب ہمارے والد واپس نہیں آنے والے، اور یہ کتنا برا ہوا... ہمارے والد اب واپس کبھی نہیں آنے والے۔

■

Dr.Md. Qutbuddin
Centre of Arabic and African Studies
School of Language, Literature and Culture Studies (New Dbuilding)
Jawaharlal Nehru University
New Delhi- 110067
Mob.:9999912655
basmaqutb@gmail.com

انیس فاروقی

قرونِ اولیٰ کی مصوری

تمہید

مصوری قدیم ہندوستان میں خیالات کے اظہار کا ایک محبوب ترین ذریعہ تھی۔ اس زمانے کے ادب اور تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فن جمالیاتی اور تکنیکی نقطہ نظر سے اپنے عروج پر تھا۔ مصوروں کو شاہی سرپرستی اور خصوصی مراعات حاصل تھیں۔ انھیں شاہی محلات اور مندروں کی دیواروں کو مصور اور مزین کرنے کا کام سونپا جاتا تھا۔ خصوصاً شہزادوں، امرا اور ممتاز شہریوں کو فن مصوری کا مطالعہ کرنا ضروری تصور کیا جاتا تھا۔ ہر شہر اور قصبے میں خاص موقعوں اور تیوہاروں پر گھر کی باہری دیواروں اور سڑکوں پر خوبصورت تصاویر لٹکا کر ماحول کو خوبصورت ترین بنا دیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی سازگار فضا میں اس فن لطیف نے خوب ترقی کی ہوگی اور یہ قیاس لگایا جاتا ہے کہ کافی تعداد میں تصاویر بنائی گئی ہوں گی مگر زمانے کے نشیب و فراز نے انھیں برباد کردیا اور اب بہت کم نشانات باقی رہ گئے ہیں۔ مورخین کا خیال ہے کہ لکڑی پر نقش بنانے یا پتھر تراشنے میں چونکہ وقت کافی صرف ہوتا تھا لہٰذا اظہارِ خیال کے لیے مصوری زیادہ کارگر ثابت ہوئی کیونکہ اس میں بت تراشی کی بہ نسبت بہت کم وقت لگتا ہے۔ اس کی ابتدا غالباً مندروں اور استوپ وغیرہ کی اندرونی دیواروں میں مذہبی روایات کو مصور کرنے سے ہوئی۔ بعد ازاں راجاؤں نے اپنے محلات کو سجانے اور سنوارنے میں دیواری تصاویر سے کام لیا اور خصوصی نگارخانے بنوائے۔ یہ نگارخانے عموماً دو قسم کے ہوتے تھے۔ ایک جو فقط حرم کی عورتوں کے لیے وقف ہوتے تھے، دوسرے وہ جو بارہ دری یا باغات میں عوام اور خواص دونوں کے لیے ہوتے تھے۔

ہندوستانی روایت کے مطابق مصوری زندگی کے اعلیٰ مقاصد حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور زندگی کا سب سے بڑا مقصد نجات حاصل کرنا ہے۔ نجات حاصل کرنے کے لیے علما نے مختلف طریق کار بتائے ہیں۔ عام طور سے زندگی کے تمام لوازمات سے علیحدگی اور بے تعلقی اختیار کر کے جنگلوں میں چلا جانا نجات حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تصور کیا جاتا تھا لیکن اسے منفی نظریہ فکر کہا جاتا ہے۔ مثبت نظریۂ فکر کے تحت نجات کے معنی ہیں انسان کے شعور میں قادر مطلق اور اس کی عظمت کا احساس پیدا ہونا جو سماج میں رہ کر ہی اعلیٰ قدروں کو اپنا کر اجاگر کیا جا سکتا ہے۔ 'دھرم' یعنی ضابطۂ حیات (زندگی کے فرائض کا صحیح ڈھنگ سے انجام دینا) دوسرا 'کام' یعنی خواہشات انسانی نسل کو برقرار رکھنا اور تیسرا 'ارتھ' یعنی ادعائے حیات (بنیادی ضروریات زندگی کے لیے روزگار کرنا) ہندوستانی فلسفۂ زندگی کے اجزائے ترکیبی بتائے گئے ہیں۔ ہندوستانی فن مصوری اسی تصور کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہندوستانی مصوری میں جمالیات کا نظریہ بھی زندگی کی حقیقتوں اور انسانی برادری کی فلاح اور بہبود پر منحصر ہے یعنی 'ستیم' (سچ)، 'شوم' (فلاح) اور 'سندرم' (خوبصورتی) سندر یا خوبصورت وہی ہے جو سچ اور فلاح پر قائم ہو۔

ہندوستانی مصوری دراصل ہندوستانی زندگی، رہن سہن اور مذہبی عقیدے کی ترجمان ہے۔ چونکہ ہندوستانی عوام نے عام طور سے اپنی زندگی کو ہمیشہ مذہبی نظم و ضبط میں رکھا، لہٰذا سماج کے ایک نمائندے کی حیثیت سے ہندوستانی مصور نے بھی مذہبی عقائد کو اپنے جمالیاتی کار میں فوقیت دی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہندوستانی مصوروں نے قدرت کی بیش بہا حقیقتوں سے اپنی آنکھیں بند رکھیں۔ ہندوستانی مصور سادھو نہیں تھے کہ وہ دنیا سے اپنا منہ موڑ کر الگ تھلگ بیٹھ جاتے بلکہ وہ صوفی، فلسفی اور مجدد تھے جنھوں نے اپنے تخیل اور جمالیاتی حس سے قدرت کے اسراروں کو عیاں کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے قدرت کے خارجی حسن کو لغوی طور سے قلمبند نہیں کیا۔ ان کی کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ وہ ہر شے میں داخلی حسن کو تلاش کریں اور اس کے نئے معنی پہنائیں۔ اسی جمالیاتی فلسفہ کے تحت ہندوستانی مصوروں نے انسانی جسم کو اپنے شاہکاروں میں پیش کرتے وقت اس کی تمام تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے انتہائی سادگی سے جسم کے خصوصی خط و خال کو نمایاں کیا ہے کیونکہ ان کا بنیادی مقصد فقط انسانی جسم کی تفصیلی نمائش نہیں بلکہ ان روحانی قدروں کو پیش کرنا رہا ہے جو انسانی شعور کا سرمایہ ہیں۔ اسی لیے ہندوستانی روایتی مصوری بنیادی طور سے عارفانہ، تصوری، اشارتی، علامتی اور ماورائی سمجھی جاتی ہے۔

روایتی اور ادبی شہادتیں

ہندوستانی مصور دراصل ایک مکمل فنکار ہوتا ہے اور بیک وقت تمام فنون لطیفہ میں ماہر تصور کیا جاتا ہے۔ وشنودھرموترا، حصہ سوم میں ایک راجہ اور ایک عارف کے درمیان مندرجہ ذیل گفتگو کا تذکرہ ملتا ہے جس سے اس نظریے کی سند مل جاتی ہے۔

راجہ: آپ براہِ کرم مجھے فن بت تراشی کے طریقے سکھلائیں۔

عارف: جسے فن مصوری کے قوانین کا علم نہیں وہ فن بت

تراشی کے قوانین نہیں سمجھ سکتا۔

راجہ: تب آپ مجھے پہلے مصوری کے قوانین سے روشناس کرائیں۔

عارف: لیکن مصوری کے قوانین کو سمجھنا بڑا مشکل ہے، جب تک کہ رقص کی تکنیک نہ معلوم ہو۔

راجہ: تب مجھے پہلے فن رقص سکھایئے۔

عارف: لیکن ساز کی موسیقی کے قوانین کو اس سے پیشتر جاننا ضروری ہے ورنہ رقص کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

راجہ: تب مجھے پہلے ساز کی موسیقی سکھایئے۔

عارف: لیکن ساز کی موسیقی اس وقت تک نہیں آسکتی۔ جب تک کہ آپ ناطق موسیقی سے واقف نہ ہوں۔

راجہ: اگر ناطق موسیقی ہی ہمارے فنون کی بنیاد ہے تو مجھے ناطق موسیقی پہلے سکھایئے۔''

اسی طرح فن مصوری کے جنم اور اس کے ارتقا کے متعلق بہت سی ادبی شہادتیں ملتی ہیں ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

سنسکرت میں لکھے ہوئے قدیم قلمی نسخوں میں ایک نسخہ 'مان سار' ہے جس کے مطابق برہما کے چار چہروں سے چار اولادیں پیدا ہوئیں جن کے نام ہیں (1) وشوکرما (2) مئے (3) توشٹا اور (4) منو۔ توشٹا کی شادی ویشرون ستا سے ہوئی جس سے وردھکی نامی اولاد پیدا ہوئی، چونکہ اچاریہ وردھکی کا دائرہ کار مصوری تھا لہٰذا ہندوستانی روایت کے اعتبار سے فن مصوری کا سلسلہ اچاریہ وردھکی سے شروع ہوا۔ ایک دوسرا نسخہ 'برہم دیورت پران' میں وشوکرما (جو سب سے بڑے شلپ کار مانے جاتے تھے) کے 9 لڑکے بتائے گئے ہیں جس میں آٹھویں لڑکے کا نام چتر کار تھا۔ فن مصوری کے موضوع پر تفصیل کے ساتھ جن ہندوستانی قدیم نسخوں میں روشنی ڈالی گئی ہے ان میں 'وشنودھرموتم پران' (اس نسخہ میں مصوری اور بت سازی کو الگ الگ فن سے منسوب کیا گیا ہے) رپارنی کی 'آشٹا دھیائی' (تقریباً 500 قبل مسیح) آچاریہ کوٹلیہ کا 'ارتھ شاستر' (تقریباً 400 قبل مسیح) آچاریہ وراہ مہر کی 'درہت سہنتیا' (تقریباً 500) اور دوسرے نسخے مثلاً 'وشوکرم پرکاش'، 'مے مت'، 'چتر سوتر' (تقریباً 600-700)، 'چتر لکشن' (تقریباً 600-700) 'چتر کرم شلپ شاستر' راجہ بھوج کا لکھا ہوا 'سمرانگن سوتر دھار' (تقریباً 1010-1055) 'کلا ولاس'، کلیان کے چالکیہ راجہ وکرمادت ثانی کے لڑکے سومیشور کا 'مان سولاس' (تقریباً 1131) 'ورتانت پرکرن' (اور 'شلپ کلا دلیپکا' قابل ذکر ہیں۔

تقریباً دوسری صدی عیسوی میں لکھے گئے 'للت وستر' نامی نسخہ میں شہزادہ سدھارتھ کو 89 فنون کا ماہر بتایا گیا ہے جن میں فن مصوری بھی شامل ہے۔ اس نسخہ میں ایک دلچسپ واقعہ کا تذکرہ ملتا ہے۔ 'راجہ شدودھن کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کے فرزند شہزادہ سدھارتھ کو ایک شلپ کار ونڈ پانی نامی شخص کی لڑکی یشودھرا پسند ہے تو اس کے یہاں راجہ نے شادی کا پیغام بھجوایا لیکن ونڈ پانی نے اس اعتراض کے ساتھ کہ شہزادہ سدھارتھ کو چونکہ فنون سے کوئی واقفیت نہیں ہے اس رشتے کو ٹھکرا دیا۔ راجہ شدّودھن اس طرح صاف صاف جواب پاکر بہت غمگین ہوئے لیکن اس واقعہ کا جب شہزادہ سدھارتھ کو علم ہوا تو اس نے راجہ سے کہا کہ وہ سارے راج میں منادی کرادیں کہ شہزادہ سدھارتھ تمام ملک کے فنکاروں سے مقابلہ کے

ہندوستانی مصوری دراصل ہندوستانی زندگی، رہن سہن اورمذہبی عقیدے کی ترجمان ہے۔ چونکہ ہندوستانی عوام نے عام طور سے اپنی زندگی کو ہمیشہ مذہبی نظم و ضبط میں رکھا، لھٰذا سماج کے ایک نمائندے کی حیثیت سے ہندوستانی مصور نے بھی مذہبی عقائد کو اپنے جمالیاتی کار میں فوقیت دی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہندوستانی مصوروں نے قدرت کی بیش بہا حقیقتوں سے اپنی آنکھیں بند رکھیں۔

لیے تیار ہے۔ چنانچہ حسب پروگرام مقابلہ منعقد ہوا جس میں شہزادہ سدھارتھ کو 80 فنون میں ممتاز قرار دیا گیا۔''

ہندوستانی فن مصوری کی تاریخ میں جس نسخہ کا بار بار تذکرہ کیا جاتا ہے وہ رشی واتسائن کا 'کام سوتر' (تقریباً 200-300) ہے اس میں 64 طرح کے فنون بتائے گئے ہیں جن میں فنون لطیفہ کے ساتھ ساتھ فنون صنعت و حرفت شامل ہیں۔ ان فنون کے نام ہیں 'ناطق موسیقی، ساز والی موسیقی، رقص، مصوری، پتیوں سے مختلف قسم کی شکلیں بنانا یا تلک وغیرہ کے لیے خصوصی سانچے تیار کرنا۔ پوجا کے وقت مختلف قسم کے جو یا چاول کے دانوں سے یا پھول سے سجانا، دانت، کپڑے اور بدن کے دوسرے حصوں کو رنگنا، گھر کے فرش کو قیمتی پتھروں اور موتیوں سے جڑنا، بستر کو سجانا، پانی میں ڈھولک کی سی آواز نکالنا، پانی کی چوٹ مارنا یا پچکاری چھوڑنا، دشمن کو ختم کرنے کے لیے طرح طرح کے عمل کرنا، پہننے یا چڑھاوا چڑھانے کے لیے پھولوں کی مالائیں بنانا، سر اور پگڑی میں لگانے والے زیوروں کو صحیح جگہ پر پہننا، اپنے بدن کو سجانا اور پھولوں سے آویزاں کرنا، شنکھ، ہاتھی دانت وغیرہ سے کان میں پہننے کے لیے زیورات بنانا، خوشبو دار اشیا مثلاً اگربتی وغیرہ بنانا، زیورات پہننے کا فن جاننا، جادو کا کھیل دکھا کر نظر بندی کرنا۔ طاقت بڑھانے کے لیے دوائیں بنانا، ہاتھ کی صفائی دکھانا، مختلف قسم کے کھانے، رس اور مٹھائی وغیرہ بنانا۔ مختلف قسم کے پینے کے لیے شربت بنانا، سوئی کے کام میں مہارت پیدا کرنا، سوت میں کرتب دکھانا، وینا اور ڈمرو بجانا، پہیلیاں بجھانا، دوہا اور اشلوک وغیرہ پڑھنا۔ مشکل الفاظ کے تلفظ اور معنی جاننا۔ خوبصورت آوازوں میں گرنتھوں کا پڑھنا، ناٹکوں اور ناولوں میں ماہر ہونا، کسی مسئلے کو سلجھانا، چھوٹے چھوٹے روزگاروں میں ماہر ہونا، لکڑی اور دھات کی چیزیں بنانا، بڑھئی کے کام میں ماہر ہونا، فن تعمیر، سکوں، ہیروں اور جواہرات کو پہچاننا اور جانچنا، دھاتوں کو ملانے اور اسے صاف کرنے کا فن، موتیوں اور شفاف سنگ مرمر اور کانچ وغیرہ رنگنے کا کام، کھیتی باڑی کرنے کا علم، مینڈھے، مرغ اور تیتروں کی لڑائی پرکھنے کا فن، طوطا اور مینا کو سکھانا اور ان کے ذریعہ پیغام پہنچانا، ہاتھ پیر سے بدن دبانا، بالوں کو ملنا اور ان کا میل دور کرنا اور ان میں تیل اور خوشبو وغیرہ لگانا۔ الفاظ کو ملانا اور ان سے معنی نکالنا، اشاریہ جملوں کو بنانا، مختلف ملکوں کی زبانوں کو جاننا، اچھے شگون کا علم ہونا، پھولوں کی گاڑی بنانا، چلانے کی مشین اور پانی نکالنے کے اوزار وغیرہ بنانا۔ یادداشت کو تیز کرنے کا فن، یادداشت اور دھیان سے متعلق فن، دل و دماغ سے اشلوکوں اور اشعار کو پورا کرنا، شاعری کرنا، لغت اور شعر کا علم، شاعری اور ادبی رنگینیت کا علم، شکل اور بولی چھپانے کا علم، بدن کی خفیہ جگہوں کو کپڑے سے چھپانے کا علم، ایک خاص قسم کا جوا کھیلنا۔ پانسوں کا کھیل کھیلنا، بچوں کے کھیل کا علم، اپنے اور پرائے کے ساتھ بہت ادب اور تمیز سے پیش آنے کا علم، شاستروں کا علم، کسرت اور شکار کا علم۔''

اس فہرست کو دیکھنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مہذب زندگی کے لیے وہ تمام فنون جو سماج میں رہ کر ایک انسان کو آنے چاہئیں وہ سب اس میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ مورخین کا خیال ہے کہ شہزادہ سدھارتھ جن 89 فنون میں ماہر تھے ان میں مندرجہ بالا 64 فنون شامل تھے۔

■

ماخذ: ہندوستانی مصوری، ایک خاکہ: **مصنف:** ڈاکٹر انیس فاروقی، **دوسرا ایڈیشن:** 1998، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

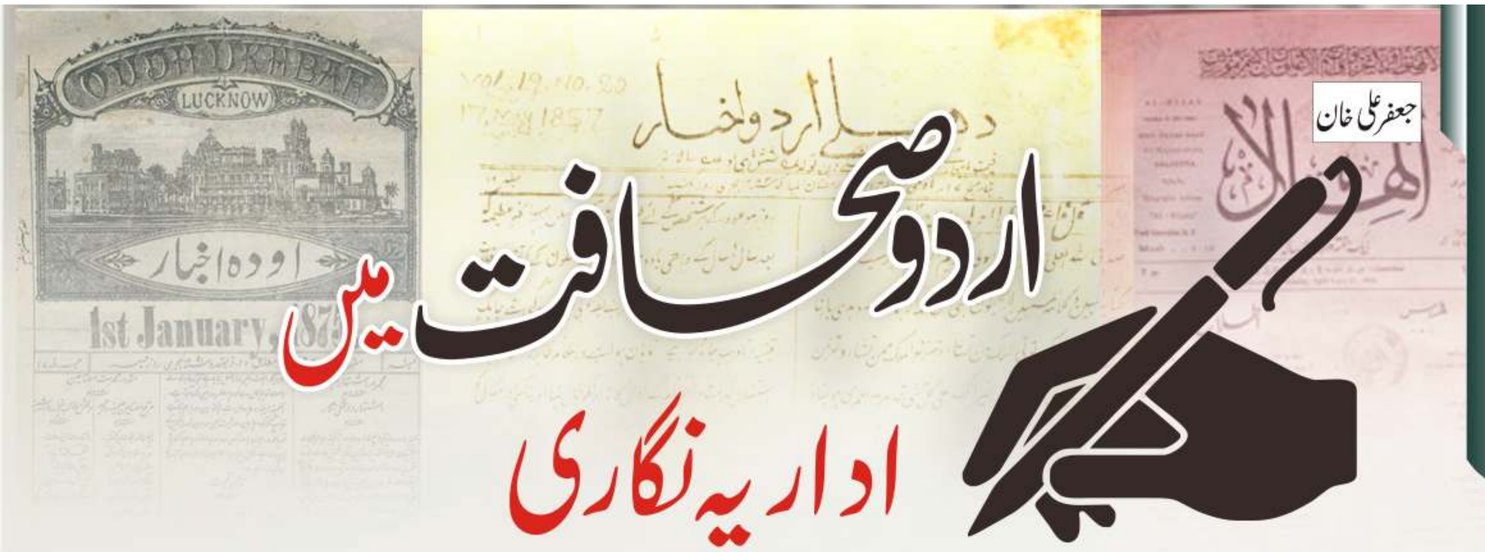

اردو صحافت میں اداریہ نگاری

جعفر علی خان

اردو صحافت میں اخبارات و رسائل کو اہم مقام اور مرتبہ عطا کرنے میں اداریہ نگاری کا بھی اہم رول رہا ہے۔ اداریے میں مدیر، ناشر یا اخبار کا مالک کسی اہم مسئلے پر اپنی رائے دیتا ہے۔ اداریے کے بغیر کسی اچھے اخبار یا رسالے کے بارے میں سوچا نہیں جاسکتا۔ یہ کسی بھی اخبار و رسالے کی پالیسی اور مزاج کا مظہر ہوتا ہے۔ اس میں عصری زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا جاسکتا ہے اور ملک کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور معاشرتی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر محمد شاہد حسین رقمطراز ہیں:

’’ اداریے کو کسی نے اخبار کی جان کہا ہے تو کسی نے اس کا ضمیر کسی نے اسے واقعات پر روشنی ڈالنے والی مشعل بتایا ہے تو کسی نے اسے عوام کی رہنمائی کرنے والا روشنی کا منارہ۔ کسی کا خیال ہے کہ یہ ایک آئینہ ہی نہیں بلکہ ایسا ہتھیار بھی ہے جس سے سلطنتوں کی قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں اور تہذیب وتمدن کے کئی شعبوں میں انقلاب لایا جاتا ہے۔ اس سے اخبار کی بے باکی، احساسات اور پالیسی کا اظہار ہوتا ہے جو کہ اخبار کے کردار کا تعین کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اداریہ اخبار کی وہ اہم تحریر ہوتی ہے جس میں مدیر، ناشر یا مالک کسی اہم مسئلے پر رائے دیتا ہے۔‘‘ (ابلاغیات، ڈاکٹر محمد شاہد حسین، 2003، ص 154)

اداریہ نویسی نہایت ہی مشکل، بڑی جانفشانی اور ریاضت والا کام ہوتا ہے۔ اس میں ایک اداریہ نگار کو حالات کا مکمل جائزہ لے کر کسی بھی موضوع پر اداریہ لکھنا ہوتا ہے۔ وہ حالات واقعات کی ایسی منطقی تصویر کشی کرتا ہے کہ قارئین میں غور وفکر کی عادت پڑے اور معاشرے میں ایک تبدیلی رونما ہو۔ حالات حاضرہ کو سمجھنے اور اپنی رائے قائم کرنے کے لیے ایک اداریہ نگار کے لیے باشعور اور بالغ نظر ہونا بہت ضروری ہے۔ کسی بھی موضوع پر لکھنے سے پہلے وہ اس کے تمام پہلوؤں پہ غور وخوض کرے اور پھر اپنی حتمی رائے قائم کرے۔ اداریے میں دی جانے والی رائے سے حکومت اور عوام کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے۔ ملک یا سماج کے لیے کون سی باتیں مفید یا غیر مفید ہیں ان پر ایک اداریہ نگار کو جواں مردی سے مذمت اور کھل کر تنقید کرنی چاہیے۔ تعصب، خوشامد، مبالغہ آرائی اداریے کو بے اثر بنا دیتی ہے لہٰذا اداریہ لکھتے وقت ان سب سے پرہیز کیا جائے۔

جہاں تک اردو صحافت میں اداریہ نگاری کے آغاز کا سوال ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو صحافت کے شروعاتی دور میں اداریہ نگاری کا بہت کم رواج تھا اور اداریے بہت کم شائع ہوتے تھے۔ اردو صحافت میں اداریہ نگاری کا سب سے اہم اور زریں دور 1857 کی ناکام بغاوت کے بعد شروع ہوتا ہے۔ 1858 میں منشی نولکشور کے ’اودھ اخبار‘ میں اداریوں کو کافی جگہ دی گئی۔ اس اخبار کے ساتھ مختلف نامور اہل قلم کی وابستگی رہی جن کی علمی اور ادبی صلاحیتوں نے اس اخبار کے معیار کو ہمیشہ قائم رکھا۔ سماجی برائیوں اور اخلاقی کمزوریوں کو اس اخبار نے طنز کا نشانہ بنایا۔ اس کے بعد اداریہ نویسی میں جو نام سب سے زیادہ اہم ہے وہ سرسید کا ہے۔ 1837 میں سرسید کے بھائی سید محمد خان نے ’سید الاخبار‘ جاری کیا اسی اخبار سے سرسید نے اپنی علمی و ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ علوم وفنون کو فروغ دینے کے لیے سرسید نے 1863 میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد انگریزی کی مفید کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنا تھا۔ 1866 میں سرسید نے اس سوسائٹی سے ایک اخبار جاری کیا جس کا نام ’اخبار سائنٹفک سوسائٹی‘ تھا۔ اس اخبار سے قبل اردو اخبارات میں اداریہ لکھنے کا رواج نہیں تھا، اخبار نے اسے عام کیا۔ اخبار نے جہاں ایک طرف ہندوستانیوں کو مغربی علوم وفنون سے روشناس کرایا تو دوسری طرف اردو زبان وادب کو آسان اور عام فہم بنانے میں کلیدی رول ادا کیا۔ اس کے بعد سرسید نے 1870 میں رسالہ ’تہذیب الاخلاق‘ جاری کیا جس کا مقصد سماجی اصلاح تھا۔ انھوں نے یہ رسالہ انگلستان سے واپس آکر وہاں کے دو رسالوں بنام ٹیٹلر (TheTatler) اور سپکٹیٹر (The Spectator) کے نمونے پر جاری کیا۔ اس میں لکھے اداریوں کے ذریعے سرسید نے مسلمانوں کو جدید تہذیب سے روشناس کرایا تاکہ وہ ایک تہذیب یافتہ اور ترقی یافتہ قوم بن سکیں۔ سرسید کے لکھے گئے اداریوں سے معاشرے میں سدھار پیدا ہوا اور قوم کے ہر فرد کو اپنی ذمے داری کا احساس ہوا۔ انھوں نے اداریہ نویسی کو ایک نئی سمت دی جس کی پیروی کرتے ہوئے بعد کے صحافیوں نے اداریہ نویسی کو فروغ دیا۔ ڈاکٹر شریف الدین لکھتے ہیں:

’’بلاشبہ صحافت کے اس دور کا امام سرسید ہی کو تصور کیا جاتا ہے۔ سرسید نے 1866 میں سائنٹفک سوسائٹی اور 1870 میں ’تہذیب الاخلاق‘ جاری کیا جنھوں نے اردو اداریہ نگاری کو ایک نئی سمت عطا کی اور اداریوں کو حقیقی معنوں میں اخبار کی روح بنا دیا اور پابندی سے اداریے شائع ہونے لگے۔

چونکہ سرسید نے علمی و ادبی صحافت کا آغاز کیا تھا اس لیے انہوں نے بھاری بھرکم اور عربی وفارسی کے گنجلک اور پیچیدہ لفظوں سے اپنے دامن کو بچایا، اور عام فہم، سادہ وسلیس زبان میں اداریے لکھ کر اردو صحافت کو ایک نئی راہ دکھائی اور اردو میں اداریہ نویسی کے فن کو خوب اجاگر کیا اور اردو صحافت کے اس اہم ترین دوسرے دور میں مختصر اداریوں کا رواج چل پڑا۔‘‘

(اردو صحافت اور حسرت موہانی، ڈاکٹر شریف الدین، 2005، ص 155)

سرسید کے بعد حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، محمد علی جوہر اور ابوالکلام آزاد کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ سب اپنے زمانے کے بلند پایہ صحافی، مقرر، خطیب، ادیب، شاعر اور سیاستداں تھے جن کے لکھے گئے اداریوں کی مقبولیت آج بھی اردو صحافت میں برقرار ہے۔ 1903 میں حسرت موہانی نے علی گڑھ سے رسالہ ’اردوئے معلی‘ جاری کیا۔ یہ محض علمی و ادبی رسالہ نہیں تھا بلکہ اس میں سیاسی موضوعات پر بھی تند وتیز تحریریں اور شذرات بھی ہوتے تھے۔ اس رسالے کے ذریعے حسرت موہانی نے

ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کیا اور اپنی پلند پایہ صحافیانہ تحریروں سے آزادی کامل کا نعرہ بلند کیا۔ 1903 میں ہی مولوی سراج الدین نے کسانوں اور زمینداروں کی فلاح و بہبود کے لیے 'زمیندار' اخبار جاری کیا۔ 1910 میں مولوی سراج الدین کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مولانا ظفر علی خاں نے اس اخبار کی ادارت سنبھالی۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں کے بارے میں خبروں اور مولانا ظفر کے لکھے گئے اداریوں نے اس اخبار کو عوام کا مقبول ترین اخبار بنا دیا۔ اس اخبار کے ادارتی عملے میں نیاز فتح پوری، عبداللہ عمادی، وحیدالدین سلیم پانی پتی اور منشی وجاہت حسین جیسی علمی و ادبی شخصیات شامل تھیں۔ اس کے علاوہ اس اخبار نے تحریک آزادی ہند میں بھی کلیدی رول ادا کیا ہے۔ 13 جولائی 1912 کو ابوالکلام آزاد نے ہفتہ وار اخبار 'الہلال' جاری کیا تو اردو صحافت نے ایک نیا روپ اختیار کیا۔ مولانا آزاد بیک وقت صحافی، انشاپرداز، ادیب، سیاستدان، عالم اور محبِّ وطن تھے جس کی زندہ مثالیں ان کی تحریروں میں موجود ہیں۔ الہلال میں مولانا آزاد نے مذہب کے علاوہ سیاست، معاشیات، تاریخ، جغرافیہ، عمرانیات اور حالاتِ حاضرہ کے مسائل پر بھی لکھتے تھے۔ مولانا آزاد نے الہلال کے ذریعے مسلمانوں کو بیدار کیا اور ان کو یہ بتایا کہ وہ عملی طور پر قومی سیاست میں حصہ لیں۔ الہلال نے اپنے اداریوں میں ان ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے بعد مولانا نے 1915 میں 'البلاغ' جاری کیا جو الہلال کا دوسرا حصہ تھا۔ بجنور سے محمد مجید حسن نے 'مدینہ' نام کا ایک اخبار نکالا جس نے انگریزی حکومت کی زیادتیوں کو اپنے اداریوں میں کھل کر تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس اخبار میں اکبرالہ آبادی، علامہ اقبال، حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خاں جیسے بلند پایا ادیب و شاعر لکھتے تھے۔ اردو صحافت کی تاریخ محمد علی جوہر کے مشہور اخبار 'ہمدرد' کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔ 1913 کو دہلی سے اس اخبار کا اجرا ہوا یہ دور ملک میں سیاسی افراتفری کا تھا اس دور میں ہمدرد نے ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دیا۔ ہمدرد کا بنیادی مقصد انگریز حکومت کی مخالفت، ملک کی آزادی اور ہندو مسلم اتحاد تھا۔ محمد علی جوہر نے اپنے اداریوں کے ذریعے عوام کے سیاسی شعور کو بیدار کیا، ملک میں ہونے والی فرقہ ورانہ کشیدگی اور فساد سے لوگوں کو روشناس کرایا جس سے انتشار پیدا ہونے کا خدشہ ہو۔ نور جہاں ثروت لکھتی ہیں:

''جب ہم صحافت کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایسے اخبارات بطور خاص کسی خاص طبقے میں مقبول ہوتے نظر آتے ہیں جو غیر معمولی ذہانت اور منفرد انداز نگارش کے مالک ہوتے ہیں۔ قدیم زمانے میں دہلی اردو اخبار، اس کے بعد تہذیب الاخلاق بعد میں زمیندار، الہلال اور علی گڑھ گزٹ اسی طرح کے اخبارات میں الجمعیت اور مدینہ جیسے اخبارات بھی اپنے مدیروں کی وجہ سے زیادہ پسند کیے گئے اور ان سے وابستگی خود ان کے مدیروں کے لیے بھی وجہ شہرت وافتخار بنی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا 'الہلال' یا بعد میں 'البلاغ' اور مولانا محمد علی جوہر کا 'کامریڈ' اور 'ہمدرد' اسی دائرہ میں آتے ہیں۔ ظفر علی خاں کے اداریوں کو کون نظر انداز کر سکتا ہے۔ ان ارباب صحافت کے وسیلے سے ہماری صحافت کی ایک ادبی، تہذیبی، سماجی اور سیاسی تاریخ بن گئی۔''

(اردو اور عوامی ذرائع ابلاغ، مرتبین پروفیسر محمد شاہد حسین، اظہار عثمانی، اردو اکادمی نئی دہلی، 2007، ص 115)

''
عصر حاضر میں اگر اردو اداریہ نگاری کو ایک نئے
مقام پہ لے جانا ہے تو سب سے پہلے صحافیوں
کو اپنے ذاتی مفاد کو ایک طرف رکھ کر اخبارات
کے بہتر مستقبل کے لیے سوچنا ہوگا۔
''

اردو صحافت کی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ماضی میں ان صحافیوں نے اپنے اخبارات ورسائل کے اداریوں کے سماجی اصلاح کا فریضہ انجام دیا اور عوام میں علمی وادبی ذوق پیدا کیا۔ اس کے علاوہ اس دور کے دیگر اہم اخبارات میں سیاست، ملاپ اور پرتاب کے نام قابل ذکر ہیں جن میں اداریہ نگاری کی بہترین مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ جہاں تک اردو رسائل کی بات ہے تو اردو زبان کے فروغ اور اس کی ترویج و اشاعت میں رسائل کا کلیدی رول رہا ہے۔ اردو رسائل جن میں اداریہ نویسی کے بہترین نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں ان میں مخزن، زمانہ، نگار، شاعر، سب رس، آجکل، اردو ادب، نیا دور، شب خون، ایوان اردو، فکر و تحقیق اور اردو دنیا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ حصول آزادی سے قبل اخبارات ورسائل کے پیش نظر ایک اعلی مقصد تھا اسی مقصد کو سامنے رکھ کر اس دور کے صحافیوں نے اپنی صلاحیتوں کا استعمال کیا۔ اس دور کے صحافیوں کا مشن خدمت خلق، سماجی اصلاح کرنا اور ملک کی آزادی تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ماضی کے مقابلے میں اب نہ ہی اس طرح کے اداریے لکھنے والے لوگ موجود ہیں اور نہ ہی ایسے قارئین۔ موجودہ دور سائنس اور تکنالوجی کا ہے آج لگ بھگ دنیا کے ہر کونے سے اردو اخبارات شائع ہو رہے ہیں ان میں مذہبی، سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی جیسے موضوعات پر سیکڑوں اداریے چھپ رہے ہیں لیکن آج اردو اداریے کی اہمیت میں کمی ہوتی جا رہی ہے اچھے باصلاحیت لوگوں کی کمی کو محسوس کیا جا رہا ہے جو اردو اداریے کو معیاری بنا سکیں۔ موجودہ دور میں اردو اخبارات کے اداریے ملکی اور عالمی سطح کے کسی بھی مسئلے کو بہترین انداز میں پیش کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آزادی سے پہلے صحافیوں کو جو چیلنجز تھے وہ آزادی کے بعد ایک نئی صورت کے ساتھ سامنے آئے۔ آج پوری دنیا کے سامنے ان گنت مسائل ہیں لیکن اردو صحافت کے اداریوں میں جو گراوٹ دیکھنے کو ملتی ہے اس کے پس پشت کئی وجوہات ہیں۔ دراصل عصر حاضر میں اردو اخبارات پڑھنے والوں کی تعداد میں کمی ہوتی جا رہی ہے کیونکہ تکنالوجی کے اس دور میں معلومات حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہوگئی ہے لوگ اب انٹرنیٹ سے ہی معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔ ماضی میں اردو صحافیوں کو مختلف زبانوں پر عبور حاصل تھا ان کے پاس موجودہ جدید ترین وسائل تو دستیاب نہیں تھے لیکن انھوں نے اپنی شستہ زبان، دلکش طرز تحریر اور زبان پر مکمل دسترس کی وجہ سے اردو صحافت میں اپنی چھاپ چھوڑی ہے۔ آج کے مدیران اپنی کم علمی اور زبان پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے زبان کی بے شمار غلطیاں کر رہے ہیں جس سے اردو صحافت کا معیار گھٹتا جا رہا ہے کسی بھی زبان کے اخبار کے اداریے کا کمزور ہونا اس زبان کے اخبار کی موت کا سبب بنتا ہے۔ عصر حاضر میں اگر اردو اداریہ نگاری کو ایک نئے مقام پہ لے جانا ہے تو سب سے پہلے صحافیوں کو اپنے ذاتی مفاد کو ایک طرف رکھ کر اخبارات کے بہتر مستقبل کے لیے سوچنا ہوگا۔ آج اردو اداریہ نگاری تب ہی جان دار اور مقبول ہوگی جب اخبار کے بنیادی ڈھانچے کو مضبوط بنایا جائے گا اور اس کی مظبوطی کا بنیادی ستون وہ اردو داں طبقہ ہے جو زبان کے ساتھ اس کے اصولوں سے بھی واقفیت رکھتا ہے جب تک یہ طبقہ آگے نہیں آئے گا اردو صحافت اور اداریے کا معیار روز بروز گھٹتا جائے گا۔

■

Jhafar Ali Khan
Research Scholar, Department of Urdu
University Of Kashmir
Srinagar-190006 (J & K)
Mob.: 9103562905

گلبرگہ کی ادبی وتہذیبی انجمنیں

کوثر فاطمہ

شہر گلبرگہ اردو زبان وتہذیب کا علاقہ کہلاتا ہے اردو زبان وادب نے یہاں ایک نئی تاریخ بنائی جس کے نتیجے میں بلند پایہ شاعر، ادیب، مقرر، صحافی اور ماہرین تعلیم ونظم ونسق پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے علم وعمل سے ایک زمانے کو متاثر کیا۔ ماضی کی ادبی قدروں کا سلسلہ آج بھی انجمنوں کی صورت میں باقی ہے اور گلبرگہ میں ادبی وتہذیبی انجمنوں کا قیام ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔

گلبرگہ کلب

1944 کے وسط میں عبدالرحیم فضل، شور عابدی، ڈاکٹر کاشمیری، سلیمان خطیب، حسن خاں مجھمی، روشن علی، نواب مکرم محمود سرفراز، غلام محمد چغتائی، گلوسیٹھ نواز خان، احمد حسین سحر قادری، عبدالرزاق جیسے گلبرگہ کے ذی علم باشعور اور ذہین افراد کی کوششوں سے گلبرگہ کلب'' کا وجود ہوا۔ بقول نیاز گلبرگوی:

''گلبرگہ کلب، گلبرگہ کے نوجوانوں کا دھڑکتا ہوا فعال صحت مند وہ دل تھا جب دھڑکتا تو پورے گلبرگہ کی زندگی حیات تازہ سے لہلہانے لگتی تھی اس کی آواز پورے گلبرگہ کی آواز تھی۔'' (بقول نیاز گلبرگوی گلبرگہ کلب، ص:9)

انجمن ترقی پسند مصنّفین

1936 میں ادب میں ترقی پسند تحریک کے آغاز کے ساتھ میدان عمل میں کارکردگی کے لیے شہر شہر ادیبوں کی ایسی انجمنیں قائم کی گئیں جو تحریک کے نصب العین کے حصول میں معاونت کرتی ہوں۔ ادب وشعر کو فرسودہ روایات سے آزاد کرانے اور ادب کے ذریعے معاشرتی اور سیاسی مقصد حاصل کرنے کے لیے ادیبوں میں اشترا کی خیالات کی تبلیغ عام ہوئی چنانچہ ادیبوں کی ایسی ہر انجمن ترقی پسند مصنفین کہلائی۔ دوران تحقیق مرحوم سید ابراہیم مامون کا ایک غیر مطبوعہ مضمون گلبرگہ میں اردو کا ماضی پڑھنے کا اتفاق ہوا تو پتہ چلا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک شاخ گلبرگہ میں قائم ہوئی تھی اور گلبرگہ کلب اس کا مرکز بن گیا تھا۔ اس انجمن (ترقی پسند مصنّفین) کے تحت چھوٹے چھوٹے مشاعروں کے علاوہ بین الریاستی مشاعرے بھی منعقد کیے جاتے تھے اس شاخ نے گلبرگہ میں ادبی ذوق کو فروغ دینے میں نمایاں رول ادا کیا۔ فضل گلبرگوی، سلیمان خطیب اور شور عابدی، گلبرگہ کلب اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ شعرا تھے۔ گلبرگہ کلب کے تحت اکثر شعری محفلیں منعقد ہوتی تھیں ابراہیم جلیس اور عثمان صحرائی بنیادی طور پر نثر نگار تھے مگر شعری محفلوں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ بیرونی مہمانوں میں راج بہادر گوڑا اور ساجد حسین لطیف (مارکیٹنگ آفیسر حیدرآباد) شرکت کرتے تھے۔ شعرا میں نظر حیدرآبادی، تحسین سروری، سلیمان اریب کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ آزادی ہند کے چند سال بعد، انجمن ترقی پسند مصنفین، قدرے تعطل کا شکار ہوگئی لیکن 1980 کے بعد اس انجمن کے احیا کی کوشش کی گئی۔ ملک کی بیشتر ریاستوں میں اس کا قیام عمل میں آیا تو گلبرگہ کے ادبا و شعرا نے بھی انجمن کے قیام کی ضرورت محسوس کی۔ جناب رشید جاوید (ٹریڈ یونین لیڈر اور افسانہ نگار) نے 30/جنوری 1988 کو ایک مشاورتی اجلاس میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کے قیام کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے فنکاروں کی توجہ اس طرف مبذول کروائی اس طرح دوبارہ اس کا قیام عمل میں آیا۔ ڈاکٹر طیب انصاری صدر منتخب کیے گئے۔ رشید جاوید (نائب صدر)، محبّ کوثر (معتمد) ڈاکٹر جلیل تنویر (معتمد عمومی) اور منظور وقار (شریک معتمد منتخب ہوئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین) نے ادبی محفلوں اور شعری نشستوں کے انعقاد وانصرام سے مقامی فن کاروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور قلم کاروں کی پیش کردہ تخلیقات پر بے لاگ تحقیق پر زور دیا جو فن کار کے لیے مفید ہو ان کی یہ مساعی انجمن ترقی پسند مصنّفین کی روایت کی پاسداری ہے انجمن ترقی پسند مصنفین کی شعری نشستیں اور ادبی مجالس گلبرگہ کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔

بزم اردو ادب

عبدالقادر ادیب اور سید ابراہیم مامون کی کوششوں سے گلبرگہ میں نوجوانوں کی مقامی تنظیم بزم اردو ادب شاہ بازار کا قیام عمل میں آیا اس بزم کے تحت ہفتہ وار مباحثے ہوتے تھے اور ماہنامہ خدمت کے نام سے دو تین شمارے بھی شائع ہوئے۔ یہ ماہنامے دستی پریس (Hand Press) کی مدد سے شائع کیے گئے تھے۔ اس بزم کے تحت ایک دارالمطالعہ بھی قائم کیا گیا تھا اکبر عالم، سجاد علی، خالدی صاحب ایڈوکیٹ، عبدالکریم تماپوری، شہاب علی کے علاوہ محبوب علی، یوسف زئی، سید محمد، سید احمد اور غلام محمد وغیرہ، اس دارالمطالعہ کے معاونین تھے۔

پریم چند سوسائٹی

حیدرآباد کرناٹک میں پولیس ایکشن 1948 کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں سے نفرت وحقارت کے جذبات کو محبت اور ہمدردی میں بدلنے کے لیے امن پسند وسیع القلب اور دوراندیش افراد نے پریم چند سوسائٹی کے نام سے ایک انجمن قائم کی اس انجمن کے نائب صدر مرحوم عبدالقادر ادیب کے مراسلے سے یہ جانکاری ہوئی کہ اس کا قیام 1954 میں عمل میں آیا تھا اس انجمن کا بنیادی مقصد پریم چند کے مقاصد کی تبلیغ و اشاعت اور خلوص ومحبت کی فضاعام کرنا تھا تا کہ سماج امن وشانتی کا گہوارہ بن جائے امرسنگھ راٹھور اس کے صدر تھے قاضی حسام الدین معتمد اور محبوب حسینی اور غلام حسین ساحل کے اسمائے گرامی اراکین کی حیثیت سے ملتے ہیں۔

بزم معراج العاشقین

خانوادہ حضرت خواجہ بندہ نواز کے احوال کی اشاعت، قدیم تاریخی کتب کی اشاعت ادبی اور مذہبی جلسوں کا انعقاد اردو زبان کی خدمات، ان مقاصد کے پیش نظر 1957 میں بزم معراج العاشقین کا بمقام حویلی روضہ خرد گلبرگہ کا قیام عمل میں آیا سید عارف اللہ نے اس بزم کے معتمد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ تحقیق کے دوران راقم الحروف نے انہی سے معلومات اکٹھا کی تھیں اس بزم کے زیر اہتمام شاہد صدیقی کی صدارت میں شام جگر، منعقد کی گئی تھی۔ سلیمان اریب، سلیمان خطیب، تحسین سروری نے جگر مرادآبادی کو منظوم نذرانہ عقیدت پیش کیا سید رحیم الدین حسینی (ڈائریکٹر سیول سپلائی حکومت آندھرا پردیش) نے محققانہ مقالہ پڑھا تھا اس بزم کے تحت ہر سال 20 محرم کو ذکر حسین کے عنوان سے سمپوزیم منعقد کیا جاتا۔ جس میں کرناٹک کے علاوہ آندھراپردیش کے مفکرین بھی حصہ لیتے تھے۔

انجمن ترقی اردو ہند

31/دسمبر 1902 کو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے کانفرنس کا لٹریری سیکشن قائم کیا اور علامہ شبلی اس کے سکریٹری مقرر کیے گئے۔ شبلی نے لٹریری سیکشن کو انجمن ترقی اردو کے نام سے موسوم کیا۔ شبلی کی وفات کے بعد اس کی ذمے داری مولوی عبدالحق کو سونپی گئی مولوی عبدالحق نے انجمن کو ایک فعال اور کارکرد انجمن ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ تقسیم ہند کے بعد مولوی عبدالحق پاکستان چلے گئے تب مولانا ابوالکلام آزاد نے انجمن (ترقی اردو ہند) کا دفتر دہلی سے علی گڑھ منتقل کیا اور ڈاکٹر ذاکر حسین کو صدر اور قاضی عبدالغفار (مدیر پیام) کو جنرل سکریٹری بنایا، پنڈت سندر لال (نائب صدر انجمن) اور قاضی عبدالغفار (معتمد) کے دورۂ حیدرآباد کے نتیجے میں 1950 میں انجمن کی شاخ حیدرآباد میں قائم ہوئی۔ گلبرگہ میں تقریباً 9 سال بعد 8/ جنوری 1959 کو انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی گئی، مبارزالدین رفعت (پروفیسر گورنمنٹ کالج گلبرگہ) کو صدر بنایا گیا سعدالدین قریشی اور محمد ہاشم علی (نائب صدر) وہاب عندلیب (معتمد) سید ریاض حسینی (شریک معتمد) کی حیثیت سے انجمن سے وابستہ ہو گئے۔ انجمن ترقی اردو (شاخ) گلبرگہ کا دائرہ عمل ضلع گلبرگہ ہے۔ جس کا دفتر شہر گلبرگہ میں واقع ہے۔ انجمن کی مجلس عاملہ کی تشکیل ہر تین سال بعد عمل میں آتی ہے۔

ادبی مجالس، سمینار، کانفرنس کے اہتمام کے ساتھ ساتھ مشاعروں کا بھی انعقاد عمل میں آتا ہے۔ تصنیف و تالیف کی طرف بھی توجہ کی جاتی ہے۔ اور انجمن کا ترجمان رسالے کی شکل میں انجمن کے نام سے شائع ہوتا ہے جس کے تا حال 9 شمارے شائع ہوئے

ان شماروں میں انجمن کی تمام ادبی تعلیمی و تہذیبی سرگرمیوں کی مفصل رپورٹیں شامل ہیں۔

بزم محبان اردو

محفل شعر وسخن کا انعقاد، تقاریر، مقالہ نویسی اور بیت بازی کے مقابلوں کا انعقاد، کتب خانہ اور دار المطالعے کا قیام ان مقاصد کے پیش نظر جناب قطب الدین جمعدار سید احمد حسین قادری سحر اور سرور مرزائی کی پر زور کوششوں سے 11/جولائی 1960 کو بزم محبان اردو کا قیام عمل میں آیا۔ غلام حسین ساحل کو صدر، محمد اسماعیل زرگر کو معتمد چنا گیا۔ محمد حسین قادری سحر اور سرور مرزائی اراکین کی حیثیت سے کام کرتے رہے 24/دسمبر 1960 کو رئیس المتغزلین علی سکندر جگر مرادآبادی کے سانحہ ارتحال پر ایک جلسہ بہ یاد جگر، بطور تعزیت منعقد کیا گیا تھا۔

انجمن ادیبان نو

شہر گلبرگہ کے چند نئے قلم کاروں نے ایک ادبی انجمن، انجمن ادیبان نو کے نام سے 1968 میں قائم کی اس انجمن کے محرک اور بانیوں میں اکرام باگ، حکیم شاکر (مدیر روزنامہ سلامتی) ریاض قاصدار اور بشیر باگ قابل ذکر ہیں۔ اسماعیل غازی (صدر) حامد اکمل (نائب صدر) بشیر باگ (معتمد) اور حکیم شاکر (معتمد عمومی) کے نام قابل ذکر ہیں اس انجمن نے ادب کے ایک خاموش خدمت گزار کی حیثیت سے رول ادا کیا جدید افسانہ نگاروں کو اردو دنیا سے متعارف کیا۔ انجمن حیات نو

شاہ پور چند باشعور نوجوانوں نے اپنے مقام کو رضا کارانہ طور پر بدلنے کا ارادہ کیا ان کا مقصد تھا لوگوں میں تعلیم کا شوق پیدا کرنا ان کا خیال تھا کہ علم کی بدولت ان کا شمار ترقی یافتہ طبقے میں کیا جائے گا چنانچہ 19/مئی 1969 کو جناب راجے محمد یوسف، بے محمد قاسم، محمد عبدالحق اور راجے محمد سخاوت کی دعوت پر چند نوجوان یکجا ہوئے۔ نادار طلبا کی مدد، دینی مدارس کا قیام اور اردو کی بقا اور ترقی و ترویج کے لیے مسلم اسٹوڈنس یونین کی تشکیل عمل میں آئی محمد اعظم اثر (صدر) عنایت الرحمن صدیقی (نائب صدر) راجے محمد سخاوت (معتمد) اور محمد عبدالحق چاند کو شریک معتمد کے عہدے تفویض کیے گئے۔

21/اگست 1970 کو اتفاق رائے سے مسلم اسٹوڈنٹس یونین (شاہ پور) کا نام بدل کر انجمن حیات نو شاہ پور رکھا گیا۔ عنایت الرحمٰن صدیقی، محمد اعظم اثر کے علاوہ فضل الرحمٰن شعلہ، سنگرام عبدالجلیل، مسعود عبدالخالق محمد جعفر الدین، محمد عبدالخالق چاند مختلف عہدیداران کی حیثیت سے انجمن سے منسلک ہوگئے۔

انجمن (حیات نو) کا ترجمان جام حیات اور اس کے خاص نمبر جن میں مولانا محمد علی جوہر فضل گلبرگوی، نیاز گلبرگوی، وقار خلیل نمبر قابل ذکر اشاعت ہیں۔ تصانیف اور مجموعہ کلام روئے گل (فضل گلبرگوی) حرف وفا (نیاز گلبرگوی) عکس کی ہجرت (راہی قریشی) نقش ہائے رنگ رنگ (فضل الرحمٰن شعلہ) مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی تصورات (محمد عبدالرزاق فاروقی) کی اشاعت بھی اس کا بہترین کارنامہ ہے۔

اردو اکادمی

وہ زبان جو عہد بہمنی سے یہاں رائج تھی اس زبان کی ترویج وترقی کی خاطر عوام کے ان نمائندوں نے جنھیں

اس زبان سے لگاؤ تھا 16/جنوری 1970 کو شہر گلبرگہ میں ایک انجمن اردو اکادمی کی بنیاد رکھی اس کا تعلق سرکار کی جانب سے قائم کی جانے والی اکادمیوں سے نہیں تھا۔ ہر سال اس اکادمی کے عہدیداران کا انتخاب ہوتا رہا۔ ڈاکٹر غیاث صدیقی کو پہلے صدر کا اعزاز حاصل ہے۔ اکادمی کا ترجمان زاویے (مدیر حامد اکمل) کی اشاعت اور عزیز حسین عابدی المعروف شور عابدی کے مجموعہ کلام خم کاکل کی اشاعت اس کا قابل ذکر کارنامہ ہے۔

سلامتی لٹریری فورم

گلبرگہ کی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے چند محبان اردو نے ایک ادارہ روزنامہ سلامتی کے نام کی مناسبت سے 1972 میں سلامتی لٹریری فورم قائم کیا سید مجیب الرحمٰن کو اس فورم کی صدارت سونپی گئی۔

ادبی اور شعری نشستوں کے علاوہ عوام میں بیداری اور حالات حاضرہ سے مطابقت پیدا کرنے کے علاوہ 16/اگست 1976 کو منعقدہ اجلاس ایمرجنسی اور صحافتی ذمے داریوں، کی مدد سے حالات کو مزید ابتری سے بچانے کے لیے دانشوروں اور محبِّ وطن کا رول ادا کرنے کے لیے باشعور شہریوں کو راغب کیا گیا۔

ادبی سنگم

گلبرگہ کے چند نمائندہ قلم کاروں کے اجتماع نے 1970 میں ادبی سنگم کی تشکیل کی ادبی سنگم، اردو اکادمی اور سلامتی لٹریری فورم کے اشتراک سے کئی ادبی جلسوں کا انعقاد کیا گیا۔

حیدرآباد کرناٹک اردو فرنٹ (مرکز) گلبرگہ:

ریاستی سطح پر اردو کے صحیح موقف کو اجاگر کرنے کے لیے ایک علاقائی لسانی تنظیم کا قیام ضروری سمجھا گیا۔ چنانچہ گلبرگہ کے چند اہل ذوق حضرات کے اجتماع میں 16/نومبر 1975 کو حیدرآباد کرناٹک اردو فرنٹ کا قیام عمل میں آیا اور سعادت حسین استاد کو صدر منتخب کیا گیا۔ سلیم ہزاری، ابراہیم مامون، اکرام باگ، قاسم شاہ پوری، ستار زخمی، خالد سعید وغیرہ کو مختلف عہدوں پر مامور کیا گیا، فرنٹ کے ترجمان، سنگ زر کی اشاعت بھی عمل میں آئی۔

حیدرآباد کرناٹک اردو فرنٹ (شاخ) گرمٹکال

اردو فرنٹ گلبرگہ کے معتمد سلیم ہزاری کی پرخلوص کوششوں سے گرمٹکال ضلع گلبرگہ میں 19/فروری 1977 کو فرنٹ کی ایک شاخ قائم ہوئی۔ جناب کشن راؤ مہندر کر کو صدر اور گرو ناتھے ریڈی کو نائب صدر مقرر کیا گیا۔ اور محبّ کوثر نے معتمدی کے فرائض انجام دیے۔ اردو فرنٹ گرنکال کا ترجمان آواز 1978 میں سائیکلو اسٹائل میں شائع کیا گیا۔

بزم خواتین

حیدرآباد کرناٹک اردو فرنٹ کے تحت 12 فروری 1984 کو بزم خواتین کی تشکیل عمل میں آئی، ڈاکٹر لئیق صلاح اس کی صدر منتخب ہوئیں۔ صغری عالم، شاہدہ نسرین، تقدیس کوثر، نسرین فرزانہ اور رابعہ خانم نے مختلف عہدے سنبھالے، 14/جنوری 1985 کو ایک بین الریاستی مشاعرہ برائے خواتین منعقد کیا گیا۔

انجمن امین ادب تماپور

جناب مبارک احمد ایڈوکیٹ کی سرپرستی میں چند باشعور اور تعلیم یافتہ نوجوانوں نے ایک تنظیم انجمن امین ادب کے قیام کا فیصلہ کیا اور یکم جنوری 1978 کو اس فیصلہ پر عمل کیا گیا، محمد اسماعیل پرویز (معتمد، غلام احمد (شریک معتمد)، اور ملا یوسف (خازن) کے عہدے پر فائز تھے، اس انجمن کے تحت تنہا تماپوری کے مجموعہ کلام چھلنی چھلنی سائبان اور انل ٹھکر کے ڈراموں کا مجموعہ اندھے رشتے کی رسم اجرا کی کامیاب تقریب کا انعقاد کیا گیا۔

انجمن ارباب

اردو نوجوانوں اور طلبہ کے اشتراک سے جناب خلیل مجاہد، منظور وقار اور فاروق نشتر نے یکم مارچ 1986 کو انجمن انقلاب اردو کی بناڈالی دو ماہ بعد 19/مئی 1980 کو انجمن انقلاب اردو کا نام تبدیل کر کے انجمن ارباب اردو رکھا گیا۔

ادبی مجلس

ڈاکٹر طیب انصاری کی صدارت میں ایک ادبی تنظیم ادبی مجلس کا احیا کیا گیا تھا۔ ادبی مجلس نے ادیبوں اور شاعروں کو ایک پلیٹ فارم عطا کیا، متعدد ادبی جلسے اور شعری نشستوں کا انعقاد کیا گیا۔

ایقان لٹریری فورم

گلبرگہ کا مشہور ہفت روزہ ایقان کی مناسبت سے گلبرگہ کی ادبی وثقافتی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے 1987 میں ایقان لٹریری فورم کا قیام عمل میں آیا، سید مجیب الرحمٰن اس کے صدر منتخب ہوئے، شکیب انصاری، وہاب عندلیب، مختار احمد منو، حامد اکمل، حنیف، قمر، امجد علی فیض، صادق کرمانی، وحید انجم، اور کوثر پروین فورم کے فعال کارکنان کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں اپریل 1993 کو ایقان کا خصوصی نمبر راہی قریشی شائع ہوا جو آئندہ محققین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا۔

کرناٹک کلچرل اکادمی

گلبرگہ کے چند اہل فن کے اجتماع نے 1986 میں کرناٹک کلچرل اکادمی قائم کی، شری اے ایچ پر ایک کا نام صدر کی حیثیت سے ملتا ہے، قاسم شاہ پوری محمد ابراہیم، محبّ کوثر، قاضی انور، وقار ریاض جیسے اہل ذوق حضرات

ادبی اجلاس اور مشاعروں کا انعقاد زبان کی ترقی و ترویج میں ایک اہم رول ادا کرتے ہیں لیکن یہ کارنامے انجمنوں کے سرگرم رہنے تک ذہن میں محفوظ رہتے ہیں بعد میں ذہن سے محو ہو جاتے ہیں باضابطہ تحریر کی شکل میں ان کارناموں کو محفوظ کرنے کے لیے انجمنوں نے اپنے ترجمان، تصانیف مجموعہ کلام کی اشاعت سے اپنے کارناموں کی دستاویز کی شکل میں محفوظ کر لیا۔

اس سے وابستہ تھے، محبت کوثر کے مجموعہ کلام ایاغ تازہ، کے علاوہ محبت کوثر کے فن اور شخصیت پر ایک سونیئر کی اشاعت بھی عمل میں آئی۔

ذہن جدید

محمد عبید اللہ صادق کرمانی، امجد علی فیض، حنیف قمر، رشید سگری، جیسے نو واردان سخن کی ادب پرستی نے اکتوبر 1989 کو ایک نئی تنظیم ادارہ ذہن جدید کو جنم دیا اور محمد عبید اللہ کو صدر بنایا گیا حامد اکمل، جبار جمیل، احمد جلیس، صابر شاہ آبادی، وہاب عندلیب، عبدالعظیم، سید مجیب الرحمٰن جیسے بزرگوں کی سرپرستی میں یہ نوجوان قلم کا رادبی نشستوں اور بحث و مباحث کا اہتمام کرتے۔ کبھی ممتاز افسانہ نگار حمید سہروردی اور اکرام باگ ان نشستوں کی زینت بڑھاتے، ڈاکٹر طیب انصاری جلیل تنویر، وحید انجم وغیرہ ذہن جدید کی نشستوں میں شریک ہوتے اور اپنے زریں مشوروں سے نوازتے۔

حیدرآباد کرناٹک سوشیو کلچرل اسوسی ایشن (حکسلا):

ڈاکٹر طیب انصاری نے محمد بن علی کے اشتراک سے سلیمان خطیب کی صدارت میں حیدرآباد کرناٹک سوشیو کلچرل اسوسی ایشن (حکسلا) کی بناڈالی۔ راچپا انجینئر کا نام اس کے سرپرستوں میں شامل ہے۔

احمد جلیس ٹرسٹ

9/مئی 1996 کو ادبی دنیا کی ایک قد آور شخصیت احمد جلیس اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ٹھیک ایک سال بعد یعنی 9/مئی 1997 کو اہل گلبرگہ نے احمد جلیس کی یاد میں ایک ادبی ٹرسٹ احمد جلیس ٹرسٹ کے قیام کا اعلان کیا، اس ٹرسٹ کا مقصد نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا تھا۔ حامد اکمل (صدر) اور خواجہ پاشاہ انعامدار، امجد علی فیض، فہیم پیرزادہ، کوثر پروین وغیرہ نے اراکین کی حیثیت سے اس ٹرسٹ کو فعال بنانے میں اہم خدمات انجام دیں۔ 19 مئی 1998 کو اس ٹرسٹ کا پہلا ادبی اجلاس، الکٹرانک میڈیا میں اردو، کے عنوان سے سمینار منعقد کیا گیا۔ اسلم فرشوری اور کبیر احمد (ڈائرکٹر دوردرشن) شرکائے اجلاس تھے، توسیعی لکچرز کا انعقاد، طنز و مزاح محفل افسانہ اور مختلف عنوانات پر لیکچرز اس کے اہم اجلاس تھے۔

بزم فروغ ادب

گلبرگہ کے چند نوجوان اور ادبی ذوق رکھنے والے طلبہ و طالبات نے 1986 کے اواخر میں بزم فروغ ادب کی بنیاد ڈالی 1988 میں اس بزم کا رجسٹریشن ہوا محمد نظام الدین گولہ (صدر) سید سیف اللہ حسینی (نائب صدر) عبدالباری (معتمد) عبدالجبار گولہ (شریک معتمد) اور وقار ریاض (معتمد برائے تہذیبی امور) اپنے فرائض انجام دیتے رہے بعد میں وقار ریاض کو صدر منتخب کیا گیا۔ محترمہ صغریٰ عالم کے مجموعہ کلام حیطہ صدف کی رسم اجرا کی تقریب بزم نے شاندار پیمانے پر منعقد کی تھی۔ انجمن شبستان اردو نوجوانوں کی ایک تنظیم انجمن شبستان اردو کا قیام 1989 میں عمل میں آیا۔ فوزیہ چودھری اس کی صدر رہ چکی ہیں۔

بزم امان اردو

جعفر جاگیردار اور پروفیسر حمید اکبر کی سرپرستی میں چند اہل ذوق طلبہ و طالبات نے 16/فروری 2002 کو بزم امان نامی انجمن کے قیام کا ارادہ کیا 16/جون 2002 کو انجمن کے عہدیداران کا انتخاب کیا گیا۔ مشتاق احمد سہروردی صدر کوثر پروین اور رشید سگری نائبین صدر حافظ شکیل احمد معتمد اور ہاجرہ پروین کو شریک معتمد چنا گیا۔ ضیا ساجد، اسد اللہ حسینی، کلیم اللہ حسینی، منظور احمد دکنی ارکان بزم کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ماہانہ ادبی اجلاس کے علاوہ مختلف جلسوں کا انعقاد بھی ہوتا رہا۔ عبدالستار خاطر کی تصنیف خیابان خاطر کی رسم اجرا کا جشن بھی منایا گیا۔ ممتاز بیگم کا تحقیقی مقالہ کتابی شکل میں بعنوان 'ڈاکٹر محمد طیب انصاری' کی خدمات شائع ہوا۔ اس کی بھی رسم اجرا کا انعقاد کیا گیا۔ تین سال تک پابندی سے ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات کا انعقاد ہوتا رہا۔ 2002 تا 2006 بزم امان فعال رہی 2006 کے بعد عہدیداران کی ملازمت کے سلسلے میں مستقر سے دوری بزم سے تعطل کا سبب بنی۔

ادبی اجلاس اور مشاعروں کا انعقاد زبان کی ترقی و ترویج میں ایک اہم رول ادا کرتے ہیں لیکن یہ کارنامے انجمنوں کے سرگرم رہنے تک ذہن میں محفوظ رہتے ہیں بعد میں ذہن سے محو ہو جاتے ہیں باضابطہ تحریر کی شکل میں ان کارناموں کو محفوظ کرنے کے لیے انجمنوں نے اپنے ترجمان، تصانیف مجموعہ کلام کی اشاعت سے اپنے کارناموں کی دستاویز کی شکل میں محفوظ کر لیا۔

مذکورہ انجمنوں نے مختلف افراد کو مختلف عہدوں پر نامزد کر کے انجمن کو جاندار بنانے کی سعی کی ہے اور با صلاحیت افراد کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے بہترین مواقع بھی عطا کیے ہیں۔

گلبرگہ کے ادبی ماحول کے فروغ میں تعلیمی اداروں میں طلبہ کی انجمنیں بھی اپنا ایک اہم رول ادا کرتی ہیں جن میں گورنمنٹ کالج گلبرگہ کی بزم اردو، اور جامعہ گلبرگہ شعبہ اردو کی بزم ادب اردو قابل ذکر ہیں۔ گورنمنٹ کالج گلبرگہ کی بزم اردو کے زیر اہتمام کئی یادگار سمینار، کل ہند مشاعرے، بین الکلیاتی علمی و ادبی مقابلہ جات منعقد ہوتے رہے۔ شعبے سے وابستہ اساتذہ، سید مبارز الدین۔ رفعت محمد ہاشم علی حسن، محی الدین صدیقی غیرت، محترمہ بہجت شیرازی، ڈاکٹر طیب انصاری، ڈاکٹر جلیل تنویر، جناب سعید شاہد، جناب روف خوشتر، محترمہ رحیم انسا وغیرہ نے طلبہ میں مسابقتی جذبات کو ابھارنے اور مقابلہ جات کے انعقاد میں اپنا بھرپور تعاون دیا۔

شعبہ اردو جامعہ گلبرگہ کی بزم ادب اردو کے زیر اہتمام برسوں سے طلبہ کے لیے بین الکلیاتی مقابلہ جات کا انعقاد ہوتا رہا ہے۔ شعبے کے اساتذہ پروفیسر راہی قریشی، پروفیسر قیوم صادق، پروفیسر محترمہ لئیق صلاح، پروفیسر حمید سہروردی، پروفیسر عبدالحمید اکبر، پروفیسر عبدالرب استاد کی مساعی نے طلبی کی صلاحیتوں کو ابھارنے، اظہار قدرت پر مہارت اور معلومات میں اضافے کے لیے راہیں ہموار کرتی رہیں۔ تہذیب و ثقافت اور ان کے مختلف مظاہر کو خاص سمت میں ترقی دینے اور ان کی رفتار کو تیز تر کرنے میں انجمنیں ایک اہم رول ادا کرتی رہی ہیں۔

■

Dr. Kauser Fatima
Associate Professor, Department of Urdu
Got Degree Collage
Sedam-585222
Dist: Kalaburagi (Karnataka)
Mob: 9449638647
dr.kauserfatima71@gmail.com

وسط ہند کا ایک اہم شاعر ناطق گلاوٹھوی

محمد اسرار

ناطق نے اپنی زندگی میں کافی شہرت حاصل کی۔ انھیں ملک کے بڑے مشاعروں میں بڑی عزت کے ساتھ بلایا جاتا تھا۔ ان کی شخصیت بھی بڑی رعب دار تھی۔ ناطق کی پیدائش 11 نومبر 1886 کو کامٹی میں ہوئی۔[1] یہ کامٹی کی ایک مشہور بستی وارث پور میں پیدا ہوئے۔ یہاں ان کے تایا مرحوم نعیم الدین داروغہ نے ایک مسجد کی بنیاد ڈالی تھی جو آج بھی قائم ہے اور داروغہ مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اب یہ مسجد کافی کشادہ ہے۔ نئے طرز کی عمارت بن گئی ہے۔ ان کے والد کا نام ظہورالدین حسن تھا۔ ان کا نام ابوالحسن رکھا گیا۔ یہی ابوالحسن مستقبل میں مولانا ناطق گلاوٹھوی کے نام سے شعروادب کی دنیا میں مشہور ہوئے۔ انھوں نے اس زمانے کے دستور کے مطابق عربی، فارسی ،اردو کی تعلیم مختلف مدرسوں میں حاصل کی۔ ابتدائی 8 سال کامٹی میں گزارنے کے بعد 1894 میں اپنے والد کے ساتھ گلاوٹھی گئے۔ یہاں انھوں نے مولانا عبدالعزیز صاحب سے اور بعد ازاں دارالعلوم دیوبند میں شیخ الہند مولانا محمودالحسن صاحب سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ حکیم احسن صاحب سے طب کی کتابیں بھی پڑھیں۔[2]

اس زمانے میں اردو و فارسی کی تعلیم کا اثر یہ تھا کہ کم عمری میں ہی ذہین افراد شعروشاعری کی جانب راغب ہوجاتے تھے۔ ناطق نے بھی قریب 15 سال کی عمر میں شاعری شروع کردی تھی۔ لیکن اس وقت کا کلام شاید دستیاب نہیں ہوسکا۔ اس لیے مرتب دیوان ناطق، محمد عبدالحلیم نے وضاحت کی کہ اس دیوان میں 1930 سے 1969 تک کا کلام شامل ہے۔[3]

شعروسخن کی دنیا میں ہر مبتدی کو استاد کی تلاش ہوتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اس کا استاد واقعی کامل ہو۔ ابتدا میں بیان میرٹھی سے اصلاح کی لیکن 1900 میں بیان کا انتقال ہوگیا۔ ناطق نے کافی غوروفکر اور مختلف استاد شاعروں کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد داغ کی شاگردی کا فیصلہ کیا۔ داغ دہلوی اس وقت کے سب سے کامل استاد شاعر تسلیم کیے جاتے تھے۔ ذوق، غالب، ظفر کا زمانہ انھوں نے دیکھا تھا اور غالب کے ساتھ مشاعروں میں پڑھا بھی تھا۔ داغ کا شاگرد ہونا ایک بڑے اعزاز کی بات تھی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ناطق اپنے وطن میں تھے۔ لہٰذا خط و کتابت سے اصلاح کا سلسلہ 1904 میں شروع ہوا اور قسمت کی ستم ظریفی یہ کہ 1905 میں ہی داغ کا انتقال ہوگیا۔ ناطق داغ سے کچھ ہی غزلوں پر اصلاح لے پائے تھے۔ داغ کے بیشتر شاگردوں نے بعد میں کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔ ناطق نے بھی طے کرلیا کہ اب کسی کی شاگردی میں نہیں رہنا ہے۔ حالانکہ اگر عمر دیکھی جائے تو صرف 19 برس کی تھی۔ لیکن خود پر اتنا یقین تھا کہ کسی کو اپنا کلام نہیں دکھایا۔

ناطق اپنے والد کے انتقال کے بعد 1908 میں ناگپور آگئے۔ ناگپور آنے کے بعد ہی ناطق کی شاعری کو عروج حاصل ہوا۔ وہ خود علم وادب کے شوقین تھے۔ مزاج بھی تھا کہ علم وادب کی ترقی ہو۔ لہٰذا اس بات کے لیے تا عمر کوشش بھی کرتے رہے۔ انھیں سماجی زندگی گزارنے کا شوق تھا۔ انھوں نے سیاست میں سرگرمی سے حصہ لیا اور تقریباً 30 سالوں تک ناگپور بلدیہ کے رکن رہے۔ انھوں نے تقریباً 65 سالوں تک شاعری کی۔ یقیناً اتنے طویل عرصے میں انھوں نے بہت کچھ کہا ہوگا۔ لیکن افسوس کہ ان کا صرف ایک دیوان شائع ہوا۔ وہ بھی ان کے انتقال کے بعد اکتوبر 1976 میں۔ جسے محمد عبدالحلیم صاحب نے ترتیب دے کر شائع کروایا۔ اس میں 203 غزلوں کے علاوہ متفرق اشعار ایک قطعہ شاعر کے پوتے کی تاریخِ وفات پر، 6 رباعی، کچھ نظمیں، خمسہ وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے جو کچھ کہا وہ کہاں گم ہوا، یہ ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا۔ ان کے کلام کا کافی حصہ کسی نہ کسی صورت ضائع ہوگیا۔ مرتب کو جو کچھ ملا وہ اس دیوان میں شامل ہے۔ ان کی غزلوں میں اس دور کا عام رجحان پایا جاتا ہے۔ لیکن ان کی زبان نہایت ہی اعلیٰ درجے کی ہے۔ غزلیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہایت قادر الکلام شاعر تھے۔ اشعار ملاحظہ کریں۔

مصلحت وقت کی آج اور ہے اے بادہ فروش
کل کی کل سوچیں گے اس وقت تو دکان اٹھا

وجہ رسوائی ہے ناطق، مستیِ بزم سخن
بادہ پیما ہیں بجامِ غالب مستانہ ہم

اس طرح کے اشعار ان کے دیوان میں کثرت سے موجود ہیں۔ ناگپور کامٹی کے سخن فہم حضرات جو بڑی عمر کے ہیں اور جنھوں نے ناطق کو مشاعروں میں سنا ہے وہ بتاتے ہیں کہ وہ بڑے رکھ رکھاؤ اور تہذیب والے شخص تھے۔ وہ مشاعروں میں گا کر پڑھنے کے سخت خلاف تھے۔ وہ خود تحت میں پڑھتے تھے، آواز بلند اور لہجہ صاف ستھرا تھا۔ زبان کی باریکیوں اور شعر کی فنی خوبیوں سے وہ پوری طرح واقف تھے۔ وہ جو صرف ترنم کی بنا پر مشاعروں میں چھا جاتے ہیں ان پر طنز کرتے ہوئے ناطق نے کہا۔

کانوں میں عوام کے سمانا سیکھو
لکھو کچھ بھی، گلا بجانا سیکھو
شاعر بننے کی ہے ہوس تو ناطق
سارنگی طبلے پر گانا سیکھو 5

غالب کی اتباع میں کچھ مشکل ردیف میں بھی بخوبی غزل کہی اور بہت عمدہ مضامین نکالے ہیں۔ مثلاً ان اشعار پر غور کیجیے۔

ہم پاؤں بھی پڑتے ہیں تو اللہ رے نخوت
ہوتا ہے یہ ارشاد کہ پڑتے ہیں گلے آپ
لے چلی ہے مجھ کو صحرا کی کشش
چارہ گر لے اب مری زنجیر کھینچ
رہ نوردان وفا، منزل پہ پہنچے اس طرح
راہ میں ہر نقش پامیرا بناتا تھا چراغ
لو جنوں کی سواری آ پہنچی
میرے دامن پہ چل رہا ہے چاک

آپ ان اشعار سے سمجھ سکتے ہیں کہ واقعی ناطق کو مضامین کے برتنے پر عبور حاصل تھا۔ ان کے کلام کے متعلق آغا غیاث الرحمٰن نے اپنی کتاب ادبیات و دربھ میں نیاز فتح پوری کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''ناطق گلاؤٹھوی تغزل کے دیرینہ گرفتار ہیں اور کسی خاص اسکول کے پابند نہ ہونے کے باوجود ان کا اندازِ بیان ہمیں اساتذۂ دہلی کی یاد دلاتا ہے۔ یہ معاملاتِ حسن وعشق کو اسی زبان میں ادا کرتے ہیں جو تغزل کے لحاظ سے معیاری سمجھی جاتی ہے اور بعض اوقات یہ اپنے خیال کو ایسے پہلو سے پیش کرتے ہیں کہ سننے والا ''دفعتاً چونک پڑتا ہے'' 6

نیاز فتح پوری کی یہ رائے نہایت قیمتی سمجھی جاسکتی ہے۔ نیاز صاحب جیسے سخت نقاد کی یہ رائے مولانا ناطق کے عمدہ شاعر ہونے کی دلیل ہے۔ عام طور سے شاعر کی کوشش ہوتی ہے کہ مختلف بحروں میں طبع آزمائی کرے۔ رواں بحروں کے علاوہ انھوں نے طویل بحر میں بھی کلام کہا ہے۔ ایک غزل کا مطلع اور مقطع ملاحظہ کیجیے۔

اس انجام تک، اس کو لے جا کے پہنچا، جہاں سے پھر آغاز ہونے نہ پائے
غم دو جہاں، کھا کے بیباق کردے، یہاں کچھ پس انداز ہونے نہ پائے
اگر شاعری، ساحری ہے تو ناطق، خوشی ہے ہمیں اپنی جادوگری کی
نبوت کا دعویٰ یہاں ہو تو غم ہو، اگر شعر اعجاز ہونے نہ پائے 7

شاعری کو ساحری اکثر کہا گیا ہے۔ شعرا گر تاثیر رکھتا ہے تو وہ واقعی ساحری کا کام کرتا ہے۔ ایک عمدہ شعر برسوں تک لوگوں کی زبان پر رہتا ہے۔ حشر اور حساب کتاب پر اردو شاعری میں کافی مشہور اشعار موجود ہیں۔ اسی طرز کے مضمون کو ناطق نے یوں کہا ہے۔

داور محشر بتاؤں کیا، گناہوں کا حساب
کام ہی دنیا میں، اور اس کے سوا کیا تھا مجھے

اسی غزل کا یہ شعر بہت مشہور ہوا تھا اور آج بھی مختلف موقعوں پر لوگ یاد کرتے ہیں کہ۔

ساتھ بھی چھوڑا تو کب، جب سب برے دن کٹ گئے
زندگی تونے، کہاں، لاکر دیا دھوکا مجھے

ناطق کی نظر میں شاعری ایک اہم کام تھا۔ وہ اسے بے جانہیں سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے جو شخص 15 یا 16 سال کی عمر سے شاعری کر رہا ہو اور تقریباً 65 برس اس دشت کی خاک چھان چکا ہو تو وہ اسے ایک ضروری کام ہی خیال کرے گا۔ ناطق شاعری میں لغویات سے پرہیز کرتے تھے۔

غالب کو تمام ہی شعرا تسلیم کرتے ہیں اور مختلف انداز میں غالب کی تعریف کی جاتی رہی ہے۔ میر کے بعد غالب ہی سب سے زیادہ پڑھے جانے والے شاعر رہے ہیں۔ غیر اردو داں حضرات بھی غالب کے نام سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ناطق نے مرزا کی شاعری کی یوں داد دی ہے۔

واہ رے حسن بیاں ، اللہ رے اندازِ کلام
میرزا غالب ہے ناطق ، یوسف ثانی مجھے

خود اپنی بھی تعریف انھوں نے اس انداز میں کی ہے۔ غالب کے حوالے سے اپنی تعریف دیکھیے۔

شاعری جس کی ہو، اندازِ سخن میں ناطق
دوسرا کون ہے غالب کے سوا میرے بعد

عہدِ زرّیں کے اہم شاعروں اور ان کے اندازِ بیان کو تسلیم کرتے ہوئے مولانا ناطق کا شعر ہے۔

مومن پہ بھی ایمان ہے، غالب پہ بھی ناطق
ہم ذوق کے انداز میں رہتے ہیں مگن اور

ناطق غالب کے چاہنے والے تھے۔ انھوں نے غالب کے دیوان کی شرح لکھی جو 'کنزالمطالب' کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کا سنہ اشاعت 1968 ہے۔ ڈاکٹر سروشہ نسرین نے ناطق کی حیات وخدمات پر تحقیق کی ہے۔ 'مولانا ناطق گلاؤٹھوی' میں وہ لکھتی ہیں:

''یگانہ نے اپنے مضمون میں غالب کی شاعری پر کئی اعتراضات کیے تھے۔ مولانا ناطق چونکہ غالب پرست تھے اور فن شاعری پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے یگانہ کے ہر اعتراض کا تفصیلی جواب ماہنامہ 'خیال' ہی میں ایک مضمون 'آتش پرست' کے عنوان سے تحریر کرکے دیا۔'' 8

یہ تو سب جانتے ہیں کہ یگانہ کو غالب کی مخالفت کرنے پر بہت کچھ برداشت کرنا پڑا۔ ان کے غالب پر لکھے گئے مضامین کا کئی لوگوں نے جواب دیا ہے۔

ناطق کو فن شاعری پر دسترس تھی اس بات کا اس وقت کے ناقدوں نے بھی اعتراف کیا ہے۔ نیاز فتح پوری اس کی مثال ہیں۔ اس کے علاوہ وسط ہند کے پورے علاقے میں یہ بات مشہور تھی کہ ناطق مشاعروں میں اگر کسی شاعر کو غلط شعر پڑھتے ہوئے دیکھتے یا بحر سے خارج، یا وزن کے اعتبار سے اگر شعر میں خامی ہوتا اسے ٹوک دیتے تھے۔ ناطق کی نظر میں شاعری ایک اہم کام تھا۔ وہ اسے بے جانہیں سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے جو شخص 15 یا 16 سال کی عمر سے شاعری کر رہا ہو اور تقریباً 65 برس اس دشت کی خاک چھان چکا ہو تو وہ اسے ایک ضروری کام ہی خیال کرے گا۔ ناطق شاعری میں لغویات سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کے کلام میں آپ کہیں بھی ایسا مضمون نہیں دیکھ سکتے جسے تہذیب کے خلاف سمجھا جاسکے۔ ہاں کہیں کہیں نہایت چبھتا ہوا طنز اور کہیں شوخی بھی موجود ہے۔ یہ دونوں باتیں اردو شاعری کا جزو ہیں۔ اگر شاعری میں شوخی بالکل نہ ہو تو کلام کچھ پھیکا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حالات کو دیکھتے ہوئے اگر شاعر طنز یہ مضامین سے بالکل اجتناب کرے تو سچ کہیں پیچھے چھوٹ جاتا ہے۔

غرض یہ کہ ناطق کو کلاسیکی شاعری کا ایک اچھا شاعر تسلیم کرنا چاہیے۔ ساتھ ہی ناطق کی شخصیت اور فن پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر شرف الدین ساحل، ڈاکٹر سروشہ نسرین، ڈاکٹر ایم آئی ساجد وغیرہ نے کام کیا ہے۔ اگر وہ کلام مل جائے جو کہیں ضائع ہو چکا ہے تو شاعر کی خوبیوں پر زیادہ روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔

■

Mohd Asrar
Research Scholar, Dept Urdu
Rashtrasant Tukadoji Maharaj Nagpur University
Nagpur - 500032 (MS)
Cell: 9822724276
asrarmohammad1977@gmail.com

نہال

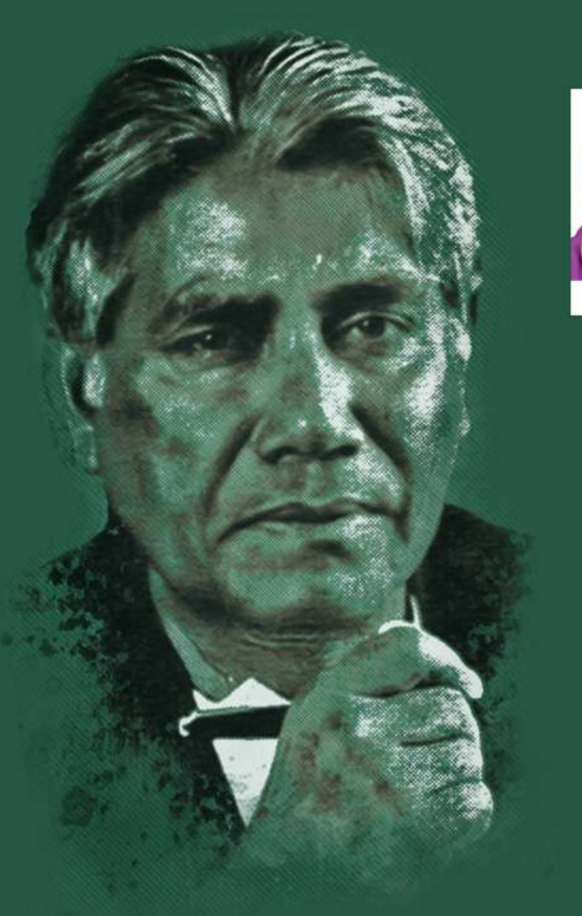

اختر الایمان کی شاعری کے موضوعات

اختر الایمان کی شاعری فکر وفن دونوں اعتبار سے اہم ہے۔ اس میں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور اسلوب وتکنیک کی رنگا رنگی بھی۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''اختر الایمان کی نظموں میں زندگی کے سبھی رنگ ملتے ہیں۔ اختر الایمان نے خود بھی زندگی سے آنکھیں چار کی ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کو بھی یہ حوصلہ دیا ہے۔''

(اختر الایمان عکس اور جہتیں، شاہد ماہلی، معیار پبلی کیشنز گیتا کالونی دہلی، 2000، ص65)

اختر الایمان کی شاعری میں زندگی کے بیشتر رنگ جھلملاتے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں وہ تمام رنگ نظر آتے ہیں جو عام طور پر انسانی زندگی میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی شاعری میں انسانی زندگی کا المیہ سیل رواں کی مانند ہے۔ ان کی شاعری میں مختلف النوع موضوعات اس لیے بھی در آئے ہیں کہ ان کا مشاہدہ عمیق اور طبیعت حساس ہے۔ ان کی طبیعت اس قدر حساس ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا واقعہ، جو انسان کی نفسیاتی وسماجی زندگی کا حصہ ہو، ان کی نظم کا موضوع بن جاتا ہے۔ اس کی واضح دلیل ان کی خودنوشت 'اس آباد خرابے میں' ہے۔ جس میں انھوں نے اپنی زندگی کے سفر کی داستان بیان کی ہے۔

اختر الایمان کی شاعری کے موضوعات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان میں زندگی کے دو پہلو بیان ہوئے ہیں۔ ایک ان کی داخلی زندگی سے ہم آہنگ ہے اور دوسرا ان کی خارجی زندگی سے متعلق۔ دونوں ہی پہلو ان کے احساس کی گرفت میں ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں مختلف نشیب وفراز تو دیکھے ہی، اپنے آس پاس رہنے والے دوسرے لوگوں کی زندگیوں کے کرب و اضطراب کو بھی شدت سے محسوس کیا۔ اختر الایمان کا بچپن جن حالات میں گزرا، اوران کے ذہن ودل پر جو اثرات مرتب ہوئے ان کا نقش تادم آخر ان کے ذہن ودل پر قائم رہا۔ گھر میں افلاس کا بسیرا تھا، اوپر سے والد غیر ذمے دار اور حد درجہ لاپرواہ، جس کے باعث ماں باپ کے درمیان ٹکراؤ کا ماحول بنا رہتا تھا۔ اختر الایمان اگرچہ کم سن تھے، مگر ان کی کمسن نگاہوں میں وہ تمام مناظر اس طرح جذب ہوگئے کہ ان کی چبھن کبھی ان کے ذہن ودل سے نہ نکل سکی۔ ان کی ٹیس ان کے سینے میں ان کی زندگی کے آخری دم تک چبھتی رہی۔

اختر الایمان کی نظموں میں روایت پسندی سے گریز اور نئی زندگی کی طرف بڑھنے کا رجحان ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جن کا بیان اُن سے پہلے کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ انسان کی ذہنی اور جذباتی کیفیات، اس کی داخلی اور خارجی دنیا، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف معاملات و مسائل وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جو اس عہد کی ترقی پسند شاعری سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔ وہ روایتی قسم کے رومانی موضوعات کے بجائے اپنے عہد کی زندگی کے حقائق پر نگاہ رکھتے ہیں۔ اپنے عصر کے انسان کی خود غرضی، تشدد اور جارحیت پسندی سے انھیں دکھ پہنچتا ہے۔ ان کی شاعری کا کردار وہ ہے جس نے دنیا میں امن وسکون اور محبت کی خواہش کی تھی، جو اپنے خوابوں کی دنیا کا شیش محل سجانا چاہتا تھا۔ جس کی آرزو تھی کہ یہ دنیا گلوں کا مسکن ہو، زمین کے سینے سے شگوفے پھوٹیں، نئے چمن آباد ہوں، جن سے رنگ ونور مل سکے۔ کوئی ایسا ہو جس کی آغوش میں

اسے سکون مل سکے۔ لیکن جب اختر الایمان نے اپنے خوابوں کی اس دنیا کو ٹوٹتے پایا تو خدا سے شکوہ بھی کیا۔

مگر مجھے کیا دیا یہ تو نے
شباب اک زہر میں بجھا کر
خراب آنکھیں لہو رُلا کر
خدائے عالم، بلند و برتر
نہ ایک مونس بھی ایسا بخشا
کہ جس کی آغوش میں تڑپ کر
سکون کے ساتھ مر سکوں میں

ایک مخلص اور ایمان دار شاعر کی طرح اختر الایمان ہر وہ بات بیان کرتے چلے جاتے ہیں جو ان کے دل پر گزرتی ہے۔ کسی تحریک کا کوئی منشور، کسی رجحان کا کوئی ضابطہ ان کے اس شعری خلوص میں مانع نہیں ہوتا۔ وہ تقلید کے قائل نہیں اپنی راہ الگ بنانا چاہتے ہیں اور انھیں اس بات کا سلیقہ بھی ہے کہ اپنے موضوعات کو کس قدر طاقتِ پرواز دی جائے کہ وہ پر اثر بن جائیں۔

اختر الایمان کے زیادہ تر موضوعات ان کی ذاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اسی لیے وہ پڑھتے وقت روداد معلوم ہوتے ہیں مگر انھیں سیدھے سادے انداز کے بجائے رمز و علائم کے انداز میں پیش کرنے سے ان کی معنویت بڑھ گئی ہے اور بیان کے حسن میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ یہی وہ مخصوص انداز ہے جو ان کی شاعری میں رزمیے کی شان پیدا کرتا ہے اور انھیں دوسروں سے منفرد بھی بناتا ہے۔ رمزیت اور اشاریت سے ان کی شاعری میں تہہ داری بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ذات سے باہر کی زندگی سے تعلق رکھنے والے موضوعات میں بھی کہانی والے بیانیے کا رنگ نمایاں ہے مگر وہاں بھی اختر الایمان کی رمزیت حاوی رہتی ہے جو کہانی لگنے والی تخلیق کو شعری رنگ و آہنگ بخش دیتی ہے۔ جمیل جالبی نے ایک جگہ لکھا ہے:

''ان کے یہاں سماجی شعور کا احساس بہت شدید ہے اور اس کا اثر ان کے مزاج میں اس قدر رچ بس گیا ہے کہ قاری تو ان احساسات اور جذبات کو محسوس کر لیتا ہے لیکن خود شاعر کو وہ نظر نہیں آتے۔''

جمیل جالبی کی یہ بات تو سو فی صد درست ہے کہ اختر الایمان کی شاعری میں سماجی شعور کا احساس بہت شدید ہے مگر ان کے اس دعوے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے سماجی شعور والے جذبات و احساسات کو قاری تو محسوس کر لیتا ہے لیکن خود شاعر کو وہ نظر نہیں آتے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اختر الایمان کو سب کچھ نظر آتا ہے اور خوب نظر آتا ہے۔ جمیل جالبی کو یہ غلط فہمی شاید اس لیے پیدا ہوئی کہ اختر الایمان چوں کہ ترقی پسندوں سے خود کو مختلف رکھتے تھے اور یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ ترقی پسندی کا ٹھپہ ان پر لگ جائے، ایسا رویہ رکھنے والا سماجی شعور کا اظہار بھلا اس طرح کیوں کر کر سکتا ہے جس طرح اختر الایمان نے کیا مگر یہ بات لکھتے وقت جمیل جالبی صاحب کو یاد نہیں رہا کہ معاشرے کے ایک آباد خرابے میں رہنے اور مسلسل کرب و آلام جھیلنے والے کی آہیں اور کراہیں کسی مقام پر چیخ بھی بن سکتی ہیں۔

اختر الایمان کی شاعری کی عمارت صرف اپنے گھر کے آنگن اور گاؤں دیہات کی مٹی سے بنے گارے سے ہی تیار نہیں ہوئی بلکہ شہروں خصوصاً فلم نگری ممبئی کی زندگی کے سیمنٹ، سریا اور پتھروں کے سہارے بھی بلند ہوئی۔ اختر الایمان فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے، معروف و مشہور ہستیوں سے ان کا واسطہ رہا، صاحب ثروت اشخاص کی زندگی کے طور طریقے انھوں نے دیکھے، غریبوں کا استحصال کر کے مالداروں کو اپنی تجوریاں بھرتے ہوئے دیکھا، امیر کو اور امیر، غریب کو اور غریب بنتے ہوئے مشاہدہ کیا۔ گویا گاؤں کے کچے گھر سے لے کر شہروں کے پکے مکان تک کے سفر میں اختر الایمان نے جو بھی دیکھا، بھوگا اور سہا اس نے انھیں اس حد تک حساس بنا دیا کہ انھوں نے

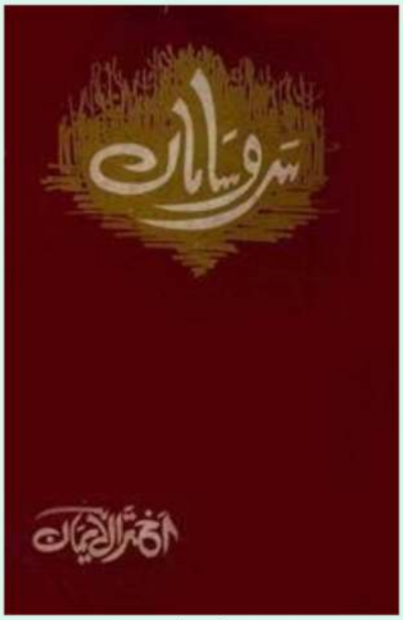

ایک ایک درد، ایک ایک کرب کو اپنی شاعری کا حصہ بنا لیا۔ اس طرح ان کی شاعری فکری طور پر وسیع ہو گئی۔ اختر الایمان کے شعری سفر کو انھیں کے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

صبح اٹھ جاتا ہوں جب مرغ اذاں دیتے ہیں
اور روٹی کے تعاقب میں نکل جاتا ہوں
شام کو ڈھور پلٹتے ہیں چراگاہوں سے جب
شب گزاری کے لیے میں بھی پلٹ آتا ہوں

'صبح اٹھ جاتا ہوں جب مرغ اذاں دیتے ہیں' یہ مصرع اختر الایمان کی زندگی کی ترجمانی تو کرتا ہی ہے ساتھ ہی ان انسانوں کی زندگی کی عکاسی بھی کرتا ہے جو رات کی نیند کو ادھوری چھوڑ کر دو وقت کی روٹی کے حصول کے لیے بستروں سے نکل پڑتے ہیں اور صبح سے شام تک محنت و مشقت میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اپنی ذات کے حوالے سے انھوں نے اس موضوع پر نظمیں لکھیں، اس کے پردے میں ان بے شمار لوگوں کی زندگیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے جو گاؤں سے شہر کی جانب ہجرت پر مجبور ہوئے۔ یہی سبب ہے کہ مادیت پرستی یا موجودہ صنعتی نظام کے خلاف احتجاج اختر الایمان کی شاعری میں ایک مستقل موضوع کی حیثیت اختیار کر گیا۔ انھوں نے اس تناظر میں کئی نظمیں کہی ہیں۔ نظم 'عہدِ وفا' کے یہ الفاظ:

''یہ کہہ کر گیا ہے کہ میں سونے چاندی کے گہنے
ترے واسطے لینے جاتا ہوں رامی''

یہ ان خواہشوں اور خوابوں کا علامتی بیان ہے جن کی تعبیر پانے کے لیے انسان اپنے آپ کو پُر شور بھیڑ میں گُم کر دیتا ہے اور اپنے پیچھے ان منتظر نگاہوں کو چھوڑ جاتا

> **اختر الایمان کی نظموں میں روایت پسندی سے گریز اور نئی زندگی کی طرف بڑھنے کا رجحان ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جن کا بیان اُن سے پہلے کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ انسان کی ذہنی اور جذباتی کیفیات، اس کی داخلی اور خارجی دنیا، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف معاملات و مسائل وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جو اس عہد کی ترقی پسند شاعری سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔**

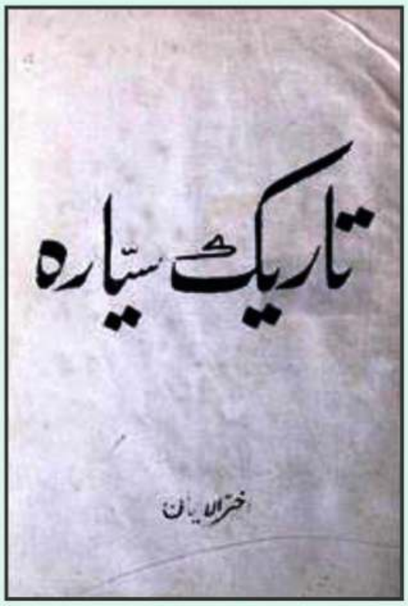

ہے جو بس انتظار ہی کرتی رہتی ہیں۔

اختر الایمان کی شاعری کے موضوعات میں ایک اہم اور نمایاں موضوع موجودہ مادی نظام سے بیزاری بھی ہے۔ اس نظام سے وہ اس لیے بھی بیزار ہیں کہ اس نے اچھے خاصے انسان کو مفاد پرست، لالچی اور چاپلوس بنا دیا ہے، اس کی اچھی خصلتوں پر بری عادتوں کو غالب کر دیا ہے۔ اس نے حیاتِ انسانی سے وابستہ فطری نظام کے دھاگوں کو الجھا دیا ہے۔ اس موضوع سے متعلق اپنے افکار کو اختر الایمان نے اپنی مشہور نظم 'ایک لڑکا' میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اس نظم میں فطری اور غیر فطری، خودداری اور چاپلوسی، ایثار وقربانی اور مفاد پرستی تمام پہلوؤں کو انھوں نے بڑے ہی پر اثر انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ نظم یوں تو اختر الایمان کی آپ بیتی کہلاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم پوری بنی نوعِ انساں کی جگ بیتی بن گئی ہے۔ عصرِ حاضر میں انسان کس طرح اپنی فطری زندگی سے بچھڑ کر ہنگامہ آرائی اور استحصالی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا ہے اس حقیقت کا بڑا ہی موثر بیان نظم میں ملتا ہے۔

مٹتی ہوئی تہذیبی اور اخلاقی قدریں بھی اختر الایمان کی شاعری کے اہم موضوعات رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انھیں قدیم تہذیب سے بے انتہا محبت ہے۔ وہ اسے انسانیت کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں، وہ نہیں چاہتے کہ وہ تہذیب جس نے ہماری نسلوں کی زندگیاں سنواری۔ ان کے اندر صالح قدریں پیدا کی۔ ان کردار واطوار کو نکھارا وہ محض ماضی کا حصہ بن کر رہ جائیں، ان کا خیال ہے کہ اگر ہماری تہذیب ختم ہو گئی تو نہ صرف یہ کہ پورے ایک عہد کا خاتمہ ہو جائے گا بلکہ پوری انسانیت ہی مر جائے گی۔ نئی تہذیب انسانیت کو آگے نہیں بڑھنے دے گی اس لیے کہ نئی تہذیب کے اندر محض تصنع اور بناوٹ ہے، وہ فطرت اور فطری حسن سے عاری ہے، وہ انسان کے جذبات کی ترجمانی نہیں کرتی بلکہ انسان کو ایک مشین بنا دیتی ہے جس میں ضمیر واحساس نہیں ہوتا۔ اختر الایمان چاہتے ہیں کہ ایسی تہذیب رواج نہ پائے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہمارا تہذیبی اثاثہ نہ صرف محفوظ رہے بلکہ وہ ہماری زندگی میں گھلا ملا بھی رہے اور ہماری زندگی اس تہذیب کے سائے میں آگے بڑھے۔ اسی لیے وہ معدوم ہوتی ہوئی پرانی تہذیب کے تحفظ کی بات کرتے ہیں اور اس کے آثار کو دیکھ کر غمزدہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی نظم 'مسجد' اسی تہذیب کا علامیہ ہے۔ اس نظم میں اختر الایمان نے تہذیبی اور انسانی اقدار کی بربادی کا مرقع کھینچا ہے۔ اختر الایمان کو ڈر ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ موجودہ نسلوں کے جمود وغفلت کے نتیجے میں ہماری تہذیب کا بچا کچھا ملبہ بھی نہ ختم ہو جائے۔ چند اشعار دیکھیے۔

تیز ندی کی ہر اک موج تلاطم بردوش
چیخ اٹھتی ہے وہیں دور سے فانی فانی
کل بہالوں گی تجھے توڑ کے ساحل کے قیود
اور پھر گنبد و مینار بھی پانی پانی

اختر الایمان کی شاعری میں غربت وافلاس کا مسئلہ بھی بار بار آیا ہے۔ اس لیے کہ وہ غربت کی کوکھ سے پیدا ہونے والے مسائل سے واقف ہیں۔ ان کی اپنی زندگی کا اچھا خاصا حصہ اسی غربت کے عالم میں گزرا تھا اور انھوں نے دوسرے بہت سے ایسے لوگ بھی دیکھے جن پر غربت نے بڑے ستم ڈھائے تھے۔ غربت کے موضوع کو دوسرے شعرا نے بھی اپنی شاعری میں برتا ہے لیکن ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے غربت کی تصویریں کچھ اس انداز سے بنائی ہیں کہ پڑھتے وقت وہ متحرک ہو جاتی ہیں اور دیکھنے والے کے جذبات بھی بر انگیختہ ہو جاتے ہیں۔

اختر الایمان کی شاعری میں غربت وافلاس کا مسئلہ بھی بار بار آیا ہے۔ اس لیے کہ وہ غربت کی کوکھ سے پیدا ہونے والے مسائل سے واقف ہیں۔ ان کی اپنی زندگی کا اچھا خاصا حصہ اسی غربت کے عالم میں گزرا تھا اور انھوں نے دوسرے بہت سے ایسے لوگ بھی دیکھے جن پر غربت نے بڑے ستم ڈھائے تھے۔ غربت کے موضوع کو دوسرے شعرا نے بھی اپنی شاعری میں برتا ہے لیکن ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے غربت کی تصویریں کچھ اس انداز سے بنائی ہیں کہ پڑھتے وقت وہ متحرک ہو جاتی ہیں اور دیکھنے والے کے جذبات بھی برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔

تقسیم وطن اور سلسلہ فسادات جیسے موضوعات بھی ان کی شاعری میں موجود ہیں۔ تقسیم وطن اور فرقہ وارانہ فسادات نے انسانیت کو جو نقصان پہنچایا، جس طرح عورتیں، بچے، جوان اور بوڑھے قتل کیے گئے، گھر اجڑے، آبائی گاؤں اور مکانات چھوٹے، انھوں نے حساس اور دردمند انسانوں بالخصوص ادیبوں، فنکاروں اور شاعروں کی آنکھوں کو اشک بار کیا ہے۔

اختر الایمان کی شاعری میں فنا وبقا، تہذیب ومعاشرت، سماج کی ناانصافی، جبر واستحصال، عدمِ مساوات، حال و استقبال اور فکر وفلسفے جیسے موضوعات بھی شامل ہیں جو ان کی شاعری کے کینوس کو وسیع کر دیتے ہیں۔ اس نوع کے مضامین اختر الایمان نے مسجد، پرانی فصیل، ایک لڑکا، نقش پا، میرا نام، ناصر حسین جیسی نظموں میں برتے ہیں۔ ان کی نظم 'پگڈنڈی' اسی قبیل کی بہترین نظم ہے۔ نظم میں زندگی کے کئی پہلو اجاگر ہوئے ہیں۔ اس کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی بل کھاتی ہوئی شادیانوں کی آوازوں اور مسرت کے قہقہوں کی روشنیوں سے گزرتی ہے، تو کبھی مایوسی اور شکست خوردگی کے گہرے احساسات سے دوچار ہو جاتی ہے۔ یہ نظم صرف حقیقت کا مظہر ہی نہیں بلکہ تاثیر وغنائیت سے پُر بھی ہے جو اختر الایمان کی شاعری کا خاصہ ہے۔

■

Neha
Research Scholar, Dept of Urdu
Allahabad University
Prayagraj- 211002 (UP)
Cell.: 7985966630
nehaansariali@gmail.com

محمد ارشاد

عطیہ فیضی
ایک شعلۂ مستعجل

ہندوستان میں تعلیم نسواں کے باب میں عطیہ فیضی کا نام قابل ذکر ہے۔ اپنی نجی زندگی سے قطع نظر عطیہ نے ہندوستان میں خواتین کی تعلیم کو مستحکم کرنے والی تحریکوں کا بھر پور ساتھ دیا اور کچھ حد تک ذاتی طور پر بھی اس سلسلے میں سرگرم رہیں۔ عطیہ تین بہنیں تھیں۔ ماہر القادری نے نازلی بیگم کو عطیہ کی سب سے بڑی بہن بتایا ہے اور عبدالستار دلوی نے زہرا بیگم کو۔ بہر حال عطیہ سب سے چھوٹی تھیں۔ ان کی پیدائش یکم اگست 1877 میں قسطنطنیہ میں ہوئی۔ عطیہ نے ابتدائی تعلیم ترکی میں ہی حاصل کی اس کے بعد بمبئی میں آگے کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا تاہم ''انھوں نے کہاں تک تعلیم حاصل کی اور کس آخری سند کا حصول کیا؟ اس کا کہیں مذکور نہیں۔''[1] لیکن ان کو عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، اردو اور گجراتی جیسی زبانوں پر مہارت حاصل تھی۔ عطیہ کے والد کا نام علی حسن آفندی تھا جو ایک عرب تھے تاہم عطیہ نے کئی جگہوں پر خود کو ترکی النسل ہی بتایا ہے'' لیکن عام طور پر انھیں عرب نژاد ہی خیال کیا جاتا تھا۔''[2] یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ عطیہ کا خاندان علمی اور معاشی طور پر خاصا متمول تھا۔ حسن آفندی کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ وہ ترکی میں برٹش انڈیا کے سفیر تھے تاہم حقیقت یہ ہے کہ وہ وہاں ذاتی کاروبار کرتے تھے لیکن ترکی کے ارباب حل وعقد سے ان کے مراسم اچھے تھے اور حکام میں بھی ان کی پکڑ مضبوط تھی۔

تقسیم ہند سے قبل عطیہ کی نجی زندگی پر نظر ڈالیے تو ہندوستان کی مایہ ناز فیملی طیب جی فیملی سے ان کا تعلق تھا۔ طیب جی فیملی اور فیضی فیملی چچا زاد رشتے دار تھے۔ فیضی خاندان میں پیدا ہونے والی عطیہ حد درجہ پُر اعتماد اور اپنے زمانے کی ذہین ترین خواتین میں سے ایک تھیں۔ ان کا خاندان مالی طور پر متمول ایک پڑھا لکھا خاندان تھا جہاں لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تعلیم پر بھی یکساں توجہ دی جاتی تھی۔ عطیہ کی شادی اپنے زمانے کے ایک مشہور مصور سموئل رحمین سے ہوئی تھی جو یہودی تھے لیکن بعد میں اسلام قبول کرلیا تھا۔ قبول اسلام کے بعد فیضی رحمین کے نام سے جانے گئے۔ وہ حد درجہ وفا شعار شوہر تھے۔ عطیہ کی ہر خواہش کو پورا کرتے اور بعض اوقات عطیہ ان سے خفا بھی ہوجاتیں تو خاموشی سے ان کی خفگی برداشت کرلیتے۔

عطیہ فیضی کی نجی زندگی کے اس مختصر ذکر کے بعد اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی شخصیت کے اس پہلو کی طرف بھی توجہ دی جائے جس کا سروکار ہمارے اس مضمون سے ہے۔ زاہدہ حنا نے عطیہ پر بات کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ عطیہ اپنے زمانے کے ہندوستان کی ذہین ترین خواتین میں سے ایک تھیں۔ کئی زبانوں پر مہارت رکھنے کے علاوہ علم موسیقی کا بھی انھیں اتنا علم تھا کہ یورپ اور امریکہ کے شہروں میں اس پر تقریریں کرتی تھیں۔ موسیقی پر انھوں نے باقاعدہ ایک کتاب انگریزی میں لکھی جو الگ الگ اوقات میں مختلف ناموں سے شائع ہوئی۔

عطیہ اپنے زمانے کے ہندوستان کی ذہین ترین خواتین میں سے ایک تھیں۔ کئی زبانوں پر مہارت رکھنے کے علاوہ علم موسیقی کا بھی انھیں اتنا علم تھا کہ یورپ اور امریکہ کے شہروں میں اس پر تقریریں کرتی تھیں۔ موسیقی پر انھوں نے باقاعدہ ایک کتاب انگریزی میں لکھی جو الگ الگ اوقات میں مختلف ناموں سے شائع ہوئی۔

سب سے پہلے یہ کتاب لندن سے Indian Music کے نام سے 1914 میں چھپی، پھر The Music of India کے نام سے 1925 میں لندن ہی سے، اس کے بعد Sangit of India کے نام سے 1942 میں بمبئی سے اور آخری مرتبہ The Music of India کے نام سے 1995 میں دہلی سے شائع ہوئی۔ تعلیم نسواں کے سلسلے میں بھی ان کی خدمات کو بھلایا نہیں جاسکتا ہے۔ آج اگر ہم ان کی صلاحیتوں اور کارناموں پر نظر ڈالیں تو عطیہ فیضی کئی خصوصیات کی بنا پر اپنے عہد سے ایک قدم آگے نظر آتی ہیں لیکن مرد اساس معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ وہ عورت کو اس کے حسن کی داد تو دل کھول کر دیتا ہے لیکن اس کی ذہانت کے اقرار میں اس کے اندر ایک طرح کا تعصب در آتا ہے۔ شمس بدایونی اس سلسلے میں فرماتے ہیں کہ:

''افسوس ہے کہ اردو اہل قلم نے عطیہ کو ایک حسن پرست، ذہنی عیاش، پرستار شہرت اور اہل علم کو اپنی صلاحیتوں سے مرعوب کرنے والی خاتون کی صورت میں دیکھا، اس میں موجود استعداد و صلاحیت، مجلسی تہذیب، حاضر جوابی، علوم وفنون کے متعدد شعبوں سے دل چسپی، خواتین کے جملہ مسائل سے شغف، کچھ کر گزرنے کا جذبہ نہیں دیکھا۔''[3]

خواتین کے تعلق سے عطیہ بہت پہلے سے ہی سرگرم تھیں۔ جب شیخ عبداللہ نے علی گڑھ میں تعلیم نسواں کی تحریک کی شروعات کی تو اس کے ابتدائی دنوں میں عطیہ اور ان کی بہن زہرا فیضی نے ان کی بڑی معاونت کی۔ عطیہ نے اس وقت عمر کی تیسری دہائی کو بھی پار نہیں کیا تھا۔ 1905 میں جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ علی گڑھ میں منعقد ہوا تو شیخ عبداللہ نے اس میں خواتین کے لیے بھی ایک سیشن کا اہتمام کیا اور خواتین کے ہاتھوں بنائی گئی مختلف طرح کی دستکاری کی اشیا کی نمائش کا انتظام بھی کیا گیا۔ چوں کہ اس سے ایک سال قبل 1904 میں شیخ عبداللہ چندے کے سلسلے میں بمبئی کا سفر کر چکے تھے اور وہاں انھوں نے طیب جی خاندان اور فیضی بہنوں سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ خواتین کا ایک جلسہ کرنا چاہتے ہیں جس پر فیضی بہنوں نے اس میں شرکت کا وعدہ کرلیا تھا لہٰذا جب شیخ صاحب نے کانفرنس اور نمائش کا انعقاد کیا تو عطیہ فیضی نے پروگرام کی ترتیب میں ان کی بہت مدد کی۔ شیخ عبداللہ فرماتے ہیں کہ ''عطیہ بی بی نے نمائش کی اشیا کی ترتیب میں بہت مدد دی جس کی وجہ سے نمائش فی الواقع قابل دید ہوگئی۔''[4] اس کے علاوہ عطیہ جب اپنی بڑی بہن نازلی بیگم ہر ہائینس جنجیرہ کے یہاں مقیم تھیں تو اس دوران بھی انھوں نے ان کے ساتھ مل کر خواتین کے سلسلے میں انجمنیں بنائیں اور ان کی بہبود کے لیے کوشاں رہیں۔ ان انجمنوں کا تعلق براہ راست خواتین کی اصلاح اور ان کی تربیت سے تھا۔ ممکن ہے ان کے اسی جذبے کی وجہ سے ان کو لندن میں ہونے والی لیڈیز ٹیچرس ٹریننگ کے لیے منتخب کیا گیا اور حکومت کے صرفے پر وہ دو برس کے لیے لندن روانہ ہوگئیں۔ تاہم

"آج اگر ہم ان کی صلاحیتوں اور کارناموں پر نظر ڈالیں تو عطیہ فیضی کئی خصوصیات کی بنا پر اپنے عہد سے ایک قدم آگے نظر آتی ہیں لیکن مرد اساس معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ وہ عورت کو اس کے حسن کی داد تو دل کھول کر دیتا ہے لیکن اس کی ذہانت کے اقرار میں اس کے اندر ایک طرح کا تعصب در آتا ہے۔"

خرابی صحت کے باعث وہ یہ ٹریننگ مکمل نہ کرسکیں اور تیرہ مہینے بعد واپس ہندوستان آگئیں۔ بقول ان کے '' میں 1906 میں گورنمنٹ اسکالرشپ لے کر لندن گئی تھی۔ مقصد سفر یہ تھا کہ میں معلّمہ بن کر وہاں سے واپس آؤں اور اپنی ہم وطن بہنوں کی خدمت کروں، لیکن وہاں پہنچ کر علیل ہوگئی اور تیرہ مہینے پردیس میں بہ مشکل گزار کر بے نیل مرام واپس آگئی۔''[5] لندن کے سفر اور قیام کو انھوں نے ڈائری کی صورت میں جمع کیا، جو اس وقت کے رسائل میں چھپتا رہا اور جسے بعد کے زمانے میں 'زمانۂ تحصیل' کے نام سے شائع کیا گیا۔

چونکہ عطیہ کی طبیعت میں ایک طرح کا جوش تھا جس نے انھیں لندن سے واپسی کے بعد بھی سرگرم رکھا۔ انھوں نے بمبئی میں 'عقد ثریا' اور 'تھری آرٹس سرکل' کے نام سے دو انجمنیں قائم کیں۔ ان کے ذریعے عطیہ ادبی و ثقافتی جلسوں کے ساتھ رقص و موسیقی اور مصوری کی محفلیں بھی سجاتیں۔ عطیہ کے مقاصد میں سے ایک لوگوں میں فنون لطیفہ سے دل چسپی پیدا کرنا بھی تھا۔ انھیں موسیقی اور تھیٹر سے بے حد لگاؤ تھا۔ ادبا کو جمع کرنا اور شعر و شاعری کی محفل سجانا بھی ان کے مشغلے میں شامل تھا۔ 'یاد رفتگاں' میں ماہرالقادری ان کی اس دل چسپی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ جب بھی بمبئی جاتے عطیہ انھیں اپنے جلسوں میں آنے پر اصرار کرتیں۔ ایک بار تو انھوں نے ماہرالقادری کے لیے ہندوستان کے سب سے بڑے پانچ ستارہ ہوٹل میں دعوت کا اہتمام بھی کیا تھا۔ ماہرالقادری کے الفاظ یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ ''ایک بار انھوں (عطیہ) نے بمبئی بلکہ یوں کہنا چاہیے متحدہ ہندوستان کے سب سے شاندار اور مشہور ہوٹل 'تاج' میں اس خاک نشین کے لیے بہت بڑی دعوت کا انتظام کیا۔''[6] عطیہ جب اپنی بڑی بہن نازلی بیگم اور بہنوئی سرسیدی احمد خان نواب جنجیرہ کے ہم راہ یورپ کے سفر پر دوبارہ گئیں تو وہاں بھی اپنی ادبی مصروفیات کو جاری رکھا۔ 1912 میں سموئل رحمین نامی یہودی النسل سے ان کی شادی ہوئی جنھوں نے شادی سے پہلے اسلام قبول کرلیا تھا۔ ماہرالقادری نے شادی کا سال 1903 بتایا ہے۔ رحمین نے بعد میں اپنا نام محمد انور رحامی رکھا لیکن بعد میں فیضی رحمین نام اختیار کرلیا اور اسی نام سے مشہور ہوئے۔ عطیہ کی شادی کے تقریباً ایک سال بعد ان کی بہن نازلی بیگم کی نواب جنجیرہ سے علیحدگی ہوگئی جس کی وجہ یہ بنی کہ نواب صاحب کے کوئی اولاد نہ ہوتی تھی اس لیے وہ دوسری شادی کرنا چاہتے تھے تاکہ ان کے خاندان کو وارث مل سکے لیکن نازلی بیگم اس کے لیے تیار نہ ہوئیں لہٰذا انھوں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کرلی۔ حالانکہ نواب جنجیرہ نے بہت کوشش کی کہ نازلی بیگم ان کے ساتھ ہی رہیں لیکن انھوں نے علیحدگی کو پسند کیا۔ نواب جنجیرہ نے علاحدگی کے وقت ایک کثیر رقم انھیں دی۔ بقول پروفیسر آصف فیضی ''علیحدگی پر نواب صاحب نے دنیا جہاں کی دولت سے لیس ساز و سامان، قیمتی نوادرات سے بھرے ہوئے جہاز میں انھیں جنجیرہ سے روانہ کیا۔''[7] جس سے نازلی بیگم نے بمبئی کے ملابار ہل میں 1919 میں 'ایوان رفعت' کے نام سے ایک شاندار حویلی تعمیر کرائی جس میں شعر و

ادب اور سیاست و معاشرت کی اہم شخصیات نے وقت گزارا۔ عطیہ اپنی بے پناہ صلاحیتوں کی وجہ سے ایک عمدہ خطیب بنیں، تعلیم نسواں کے لیے جد و جہد کیا اور بقول محمد یامین عثمانی 'مدرسہ یادگار امیر' قائم کیا اور پندرہ روزہ رسالہ 'معین نسواں' جاری کیا۔8 البتہ معین نسواں کے نام سے کوئی رسالہ تلاش کے بعد بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ اس کے علاوہ ماہر القادری، مرتب 'خطوط شبلی: بنام خواتین فیضی، شمس بدایونی' اور رسالہ امکان کے خصوصی شمارہ بنام

عطیہ فیضی میں بھی دیگر قلم کاروں نے کسی رسالے یا کسی مدرسے کا ذکر نہیں کیا ہے۔

مجموعی طور پر عطیہ ایک طلسمی شخصیت کی مالک تھیں جنھوں نے اپنے زمانے کی دو عظیم ہستیوں کو بیک وقت اپنا گرویدہ بنایا۔ ذہانت اور فطانت کے ساتھ ساتھ طبیعت میں ایک طرح کا تجسس بھی تھا۔ بغاوت کے عناصر گویا ان کے خمیر میں شامل تھے۔ مقبولِ عام انھیں ہمیشہ نامنظور رہا، پردہ انھوں نے کم سنی میں ہی ترک کر دیا تھا۔ بے باک سرشت کا یہ عالم کہ قیام لندن کے دوران جب سید امیر علی اور علامہ عبداللہ یوسف علی کے لکچروں میں کوئی نکتہ سطحی محسوس ہوتا تو اس کا اظہار بغیر کسی لیت و لعل کے کر دیتیں۔ ڈاکٹر نزہت فاطمہ نے عطیہ کی شخصیت کے ایک بالکل اچھوتے پہلو کا ذکر ماہنامہ 'آجکل، مارچ 2016' کے شمارے میں کیا ہے۔ موصوفہ نے عطیہ کی سیاسی مصروفیات اور کارناموں کا مختلف اخباروں کے حوالوں سے تجزیہ کرتے ہوئے تحریک آزادی میں ان کی خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے گاندھی جی اور رابندر ناتھ ٹیگور سے عطیہ کے تعلقات کے سلسلے میں کئی اہم اور حیران کن دعوے کیے ہیں۔ اپنے مضمون میں وہ کہتی ہیں کہ ''عطیہ بیگم فیضی، ربیندر ناتھ ٹیگور کے گھر کلکتہ بھی گئی تھیں وہاں کئی دنوں تک رہیں۔''9 اور ''عطیہ کو گاندھی جی سے بہت عقیدت تھی... انھوں نے گاندھی جی کی انگلی میں پن چبھا کر ان کے خون کا نشان اور دست خط لیے۔''10 ایک جگہ انھوں نے اس دور کے مختلف انگریزی اخباروں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''عطیہ بیگم اور نازلی بیگم نے مہاتما گاندھی کے کہنے پر قیمتی لباس زیب تن کرنا چھوڑ دیا اور ہاتھ کی بنی ہوئی کھادی کی ساڑی پہننے لگیں۔ نازلی بیگم نے اپنے تمام

”

عطیہ ایک طلسمی شخصیت کی مالک تھیں جنھوں نے اپنے زمانے کی دو عظیم ہستیوں کو بیک وقت اپنا گرویدہ بنایا۔ ذہانت اور فطانت کے ساتھ ساتھ طبیعت میں ایک طرح کا تجسس بھی تھا۔ بغاوت کے عناصر گویا ان کے خمیر میں شامل تھے۔

“

ہیرے جواہرات سے جڑے زیور اور اپنا محل تک دے دیا۔ عطیہ تحریک آزادی کی بہت سنجیدہ اور فعال رکن ہیں ... گاندھی جی کے کہنے پر چند دنوں میں 10,0000 روپئے تلک سوراج فنڈ کے لیے جمع کیے اور سودیشی تحریک کو طاقت ور بنانے اور اپنے ملک کی صنعت کو آگے بڑھانے کے لیے 6000 ڈالر کے کپڑے نذر آتش کر دیے...۔''11

اگر ان کے دعوؤں کو کوئی زیرک محقق تحقیق کی کسوٹی سے گزار کر صداقت کی سند عطا کر دے تو یہ عطیہ شناسی کے باب میں ایک بالکل نئے پہلو پر مستند کام ہوگا۔ یہاں سے اب سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ عطیہ جیسی کثیر الجہات شخصیت کو کسی میدان میں سند کی حیثیت کیوں نہ مل سکی بلکہ یوں کہیں کہ شخصی لیاقتوں اور اعلیٰ خاندانی ماحول کی دستیابی کے باوجود بھی عطیہ زندگی کے آخری ایام میں ناکام کیوں رہیں؟ میرے خیال سے اس کی وجہ ان کی مستعجل فطرت تھی۔ گرد و پیش کے ماحول سے بہت جلد ہم آہنگ ہو جانا بعض اوقات درست فیصلے کے باب میں سد راہ ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں کوئی باقاعدہ منصوبہ بندی نہیں تھی بلکہ وہ محض ایک اندرونی شوق کے زیر اثر فعال اور متحرک رہیں ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی ہمہ گیر شخصیت کی حامل خاتون کی کوئی مستقل حیثیت نہ ہو۔ شمس بدایونی تقریباً درست کہتے ہیں کہ ''ان کے خاندانی ماحول اور ریاست جنجیرہ کے نوابی کروفر نے انھیں ایک سوسائٹی گرل سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔''

حوالے

1 خطوط شبلی: بنام خواتین فیضی، مرتب و مدون: ڈاکٹر شمس بدایونی، ناشر: اپلائڈ بکس، دہلی، ص 19
2 امکان، ناشر: مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی، ص 100
3 خطوط شبلی : بنام خواتین فیضی، مرتب و مدون: ڈاکٹر شمس بدایونی، ناشر: اپلائڈ بکس، دہلی، ص 25
4 مشاہدات و تاثرات از ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ، ترتیب و تہذیب: اطہر صدیقی، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ص 135
5 زمانۂ تحصیل از عطیہ بیگم رحمین، مرتب: پروفیسر عبدالستار دلوی، ناشر: علمی مجلس (نیسٹ) ممبئی، ص 5
6 یاد رفتگاں، حصہ دوم از ماہر القادری، مرتبہ: طالب الہاشمی، ناشر: حسنات اکیڈمی (پرائیوٹ) لمیٹڈ، ص 141
7 زمانۂ تحصیل از عطیہ بیگم رحمین، مرتب: پروفیسر عبدالستار دلوی، ناشر: علمی مجلس (نیسٹ) ممبئی، ص 12
8 امکان، ناشر: مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی، ص 122
9 عطیہ فیضی: شخصیت اور کارنامے از ڈاکٹر نزہت فاطمہ، مشمولہ آجکل، مارچ 2016، ص 32
10 ایضاً، ص 32
11 ایضاً، ص 32

■

Mohammad Irshad
Research Scholar, Dept of Urdu
University of Calcutta- 700073
Mob.: 8296069173
irshadurdudost@gmail.com

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم 'زبان اور زمینی صورت حال' کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ⮜ urduduniyancpul@yahoo.co.in ⮜

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ و ما علیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط و تفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

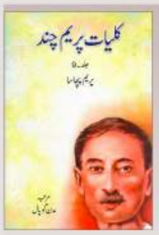

کلیات پریم چند (جلد 9) پریم پچاسا

مرتب: مدن گوپال

صفحات: 616، قیمت: 335 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: زیبا خان، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

مدن گوپال کو شروع سے ہی پریم چند شناسی میں گہری دلچسپی رہی شاید اسی کا اثر تھا کہ وہ پریم چند کا تمام سرمایہ چوبیس جلدوں میں 'کلیات پریم چند' کے نام سے مرتب کرنے میں کامیاب رہے۔ جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے شائع کیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب 'کلیات پریم چند' جلد 9 پریم پچاسا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جو سنہ 2000 میں پہلی دفعہ شائع ہو کر منظر عام پر آئی اور دوسری بار 2023 میں اشاعت پذیر ہوئی، جس میں پیش گفتار کے نام سے مدن گوپال کا تحریر کردہ تقریباً انیس صفحات پر مشتمل ایک تحقیقی و تنقیدی پیش لفظ شامل ہے، جس میں پریم چند کی ادبی زندگی کی شروعات، ان کی پہلی کہانی، پہلا ناول، یکے بعد دیگرے ان کے تمام مجموعے، ہندی سے اردو اور اردو سے ہندی ترجمہ شدہ کہانیاں، ان سب کی اشاعت کے دوران پیش آنے والی دشواریوں کا مدن گوپال نے مختصر مگر جامع خاکہ پیش کیا ہے۔ اسی کے ساتھ منشی پریم چند کا لکھا دیباچہ بھی اس کتاب میں شامل ہے جس میں پریم چند نے کہانی کی ابتدا سے لے کر انسان کا داستانوں سے نکل کر ناول سے ہوتے ہوئے افسانے تک آنے کی وجوہات پر مختصراً روشنی ڈالی ہے۔

کلیات پریم چند جلد 9 میں پچاس افسانے شامل ہیں جس میں اردو کا سب سے پہلا کہا جانے والا افسانہ 'دنیا کا سب سے انمول رتن' بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ صلۂ ماتم، روٹھی رانی، بڑے گھر کی بیٹی، اماوس کی رات، آب حیات، نمک کا داروغہ، خون سفید، شامت اعمال، کرموں کا پھل اور دیگر افسانے بھی ہیں، جو پریم چند کے شاہکار افسانوں میں سرفہرست ہیں۔ یہ تمام افسانے وہ ہیں جن میں پریم چند کا ایک مخصوص رنگ نمایاں ہے، جس میں وہ سادہ اسلوب اختیار کرتے ہوئے سماج کے ایک ایسے طبقے جس کی رہائش چھوٹے موٹے گاؤں یا شہر کی ہوتی ہے کے تمام درد و الم کی عکاسی نہایت فنکارانہ چابک دستی سے کرتے نظر آتے ہیں۔ پریم چند کے ان افسانوں میں جہاں ایک طرف ان کے سادہ اسلوب کی نادر مثالیں موجود ہیں وہیں دوسری طرف ان افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ نفسیاتی پیچ و خم بھی نظر آتے ہیں۔

پریم چند کے افسانوں میں سماجی زندگی کا نقشہ نہ صرف کھینچا گیا ہے بلکہ سماجی اور معاشرتی زندگی ان کے یہاں پورے آب و تاب کے ساتھ سانس لیتی ہوئی معلوم پڑتی ہے۔ انھوں نے غریب طبقے کی نمائندگی کرتے ہوئے ان کے درد و غم، مصائب و آلام، ان کے یہاں پائے جانے والے رسم و رواج (جیسے جہیز وغیرہ جن سے کبھی کبھی انھیں سخت مصیبت کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے) کی سچی تصویر کشی کی ہے۔ ان کے افسانوں میں پائے جانے والے کردار ان کے آس پاس کے ہی گاؤں دیہات کے کسان، مزدور، بیوہ بے سہارا عورتیں، زمیندار، رشوت خور، رسوخ دار لوگ ہوتے ہیں، جن کے حالات و واقعات سے عام قاری بھی بخوبی واقف ہوتا ہے۔ بیٹی کا دھن، پچھتاوا، اناتھ لڑکی، اماوس کی رات کچھ ایسے ہی افسانے ہیں۔ افسانہ بیٹی کا دھن میں پریم چند نے ایک ساہوکار کے دردمندانہ دل کی وضاحت کی ہے کہ وہ ساہوکار جو کسی کو اپنا روپیہ نہیں دے سکتا تھا جسے گاؤں کے لوگ برا بھلا کہتے تھے، اس نے جب یہ سنا کہ چودھری بیٹی کا زیور گروی رکھنے آیا ہے فوراً اس کے دل میں دھرم ادھرم کی چنتا جاگی کہ بیٹیوں کے گھر کا پانی تک نہیں پینا چاہیے اور چودھری اس کے زیور گروی رکھ رہا ہے، اس کے دل میں ہمدردی جاگی اور اس نے چودھری کو روپے ادھار دے کر زیور واپس کر دیا۔ افسانے کا یہ اقتباس دیکھیں:

''انھیں اس وقت چودھری پر رحم آیا۔ یہ شخص جس نے کبھی اوچھے خیالوں کو دل

میں جگہ نہیں دی۔ اس وقت زمانے کی کشمکش سے مجبور ہوکر ادھرم پر اتر آیا ہے۔ اس کے دھرم کی رکشا کرنی چاہیے۔ یہ خیال آتے ہی جھکڑ شاہ گدی سے اٹھ بیٹھے اور تسکین بخش انداز سے بولے۔'وہی پرماتما جس نے اب تک یہ ٹیک نباہی ہے اب بھی تمھارا پرن نباہے گا۔ لڑکی کے گہنے لڑکی کو دے دو۔ لڑکی جیسی تمھاری ہے ویسی میری۔ میں ڈگری کے روپے تمھیں دے دوں گا جب ہاتھ میں روپے آجائیں تو دے دینا۔ مجھے لوگ جتنا برا کہتے ہیں اتنا برا نہیں ہوں۔ ہاں اپنا پیسہ پانی میں نہیں بہاتا۔'' (کلیات پریم چند، مرتب مدن گوپال ص 616)

پریم چند کے اس طرح کے متضاد کردار ان کے بہت سے افسانوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پریم چند نے دیہات کی زندگی کو ان کی پریشانیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر ان پر ہونے والے ظلم و جبر کے خلاف ایک احتجاج درج کروانے کی کوشش کی تھی، پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:

"پریم چند پہلے ادیب ہیں جنھوں نے ہندوستانی گاؤں کے کسانوں، کھیت، مزدوروں... کی عظمت اور انسانی وقار کو سمجھا۔ ان کے لیے ادب کے کشادہ دروازے کھولے، انھیں ہیرو بنا کر، ان کے دکھ سکھ کی گاتھا سنا کر افسانوی ادب کو نئی وسعتوں اور ایک نئے احساس جمال سے آشنا کیا۔'' (قمر رئیس، اردو ادب میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب، ص 468)

پریم چند نے حاشیہ پر کھڑے ہوئے لوگوں کو اپنے افسانوں کا کردار بنایا ہے، ذات پات، چھوت چھات کے خلاف ان کے یہاں عمل اور رد عمل دونوں دیکھنے کو ملے گا، افسانہ 'صرف ایک آواز' میں یہ عمل اور رد عمل دونوں کا باہمی ملاپ ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ پریم چند ایک ادیب تھے یا معاشرے کے نباض، یا پھر مصلح اور مفکر، جو سماج میں پھیلی ہوئی برائی کے خلاف دست بستہ کھڑے نظر آرہے تھے۔

مجموعی طور پر ہم دیکھیں تو کلیات پریم چند پریم پچاسا کے افسانے پریم چند کے بہترین افسانوں میں جگہ پاتے ہیں، جن میں پریم چند نے دیہاتی زندگیوں کی عکاسی، کسانوں، زمینداروں، بارسوخ لوگوں کی نفسیات، عورتوں کے مسائل وغیرہ کو سیدھی سادی زبان اور اسلوب نگارش سے مزین کر کے عام قاری تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور انھیں کلیات کے روپ میں مرتب کر کے مدن گوپال نے پریم چند کے تمام سرمائے کو یکجا کر دیا ہے جس سے عام طلبا و طالبات، ریسرچ اسکالرز کو مستفیض ہونے کا موقع ملے گا۔

آب و ہوا کا سائنسی مطالعہ (عام اور اطلاقی)

مصنف: طاہر حسین، میری طاہر، مترجم: فرحت عثمانی
صفحات: 435، قیمت: 220 روپے، سنہ اشاعت: 2022
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
فروغ اردو بھون، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی
مبصر: نثار احمد، ریسرچ اسکالر، جواہر لعل نہرو یونیوسٹی نئی دہلی

اکیسویں صدی کو سائنس کا عہد کہا گیا ہے، سائنس اور جدید ٹیکنالوجی کی ابتدا بیسویں صدی یا اس سے کچھ قبل ہی ہوگئی تھی۔ لیکن اکیسویں صدی سائنس اور ٹکنالوجی کے عروج کا عہد کہلائی اور آج بھی یہ سلسلہ بدستور جاری ہے اور نت نئی ایجادات سامنے آتی جارہی ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کو برتنے کے سلسلے میں زبانوں کا کردار بھی بے حد اہم رہا ہے۔ اسی لیے سائنس اور ٹکنالوجی کو اپنی زبان میں منتقل کرنا یہ اچھی پہل ہے، اردو زبان میں سائنسی موضوعات پر بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں، حالانکہ دیگر زبانوں سے کچھ اچھی کتابوں کے اردو ترجمے ضرور ہوئے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب 'آب و ہوا کا سائنسی مطالعہ' (عام اور اطلاقی) ہے جس کے مصنف پروفیسر طاہر حسین اور پروفیسر میری طاہر ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب Climatology (General and Applied) کے نام سے انگریزی زبان میں لکھی ہے جسے فرحت عثمانی نے بہت خوبصورت طریقے سے اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ یہ ترجمہ بالکل سادہ تو نہیں ہے البتہ سائنسی نقطہ نظر سے اسے سہل بنانے کی کوشش ضرور کی گئی ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ تراجم میں اکثر ٹارگٹ لینگوج یعنی ہدف زبان کا خیال رکھا جاتا ہے لیکن سائنسی اصطلاحات کو اردو میں منتقل کرنا، یہ ذرا مشکل کام ہوتا ہے، اس لحاظ سے اس کتاب کے ترجمے میں تھوڑا ثقل ضرور ہے، اس کے باوجود یہ ایک بہتر کتاب ہے جو اردو جاننے والوں کے لیے سائنسی ایجادات، اس کے مبادیات اور اس کے اصول و ضوابط سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے معاون ثابت ہوسکتی ہے۔

ہوا اور پانی انسان کی بنیادی ضرورت ہے جن کے بغیر جاندار کی زندگی کا تصور ناممکن ہے۔ آج کرہ ارض کے علاوہ دیگر جگہوں پر اس کی تلاش جاری ہے، اس کتاب میں بہت تفصیل سے آب و ہوا اور اس کی ماہیت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ماحولیات اور دیگر عناصر، مثلاً، درجہ حرارت، بارش، گرمی، سردی، پہاڑ، جنگل، سمندر اور دیگر موضوعات پر بہت تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ سائنس سے دلچسپی رکھنے والا ایک عام قاری بھی اس کتاب سے مستفید ہوسکتا ہے اور سائنس کے مبادیات کے بارے میں جان سکتا ہے۔

آج گرین ہاؤس گیس، کاربن مونو آکسائڈ اور پی ایم ٹو جیسی گیسوں میں خطرناک حد تک اضافے کے باعث اوزون پرت میں سوراخ ہو رہے ہیں جس سے ماحولیات کو شدید خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ کوپ 28 جیسی عالمی تنظیم اس مسئلے پر سر جوڑ کر بیٹھ رہی ہے کہ اس خطرناک ماحولیاتی تبدیلی سے کس طرح دنیا کو بچایا جا سکتا ہے۔ اس کی شرح میں کمی کیسے لا سکتے ہیں۔ اس کتاب میں بہت تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے اسباب و تدارک پر بہت تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

خطرناک ماحولیاتی تبدیلی کے باعث کرہ ارض کو شدید خطرہ لاحق ہے اور وسائل کی تباہی کو دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ مستقبل میں حالات کیسے ہوں گے؟ عین ممکن ہے کہ تیسری عالمی جنگ پانی پر کنٹرول کے لیے ہو۔ عالمی ماحولیاتی تبدیلی کے مطابق دنیا بھر میں پینے والے پانی کی شدید قلت ہونے والی ہے۔ انٹارٹیکا، الاسکا، شمالی اور جنوبی پول پر برفانی تودوں کے پگھلنے سے خطرناک موسمیاتی تبدیلی دیکھنے کو مل رہی ہے۔ ان سے آگاہ کرتی یہ کتاب اردو قاری کے لیے شاندار تحفہ ہے۔ اس کتاب میں عالمی ماحولیات کے ساتھ ہندوستان کی آب و ہوا پر بھی تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

ملک ہندوستان قدرتی طور پر تین اطراف میں بحری سرحد اور ایک طرف بری سرحد سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے لیے اکویٹر بالکل اس کے درمیان سے گزرتا ہے اور اسے دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اس لیے یہاں کا موسم ہمیشہ تغیر پذیر رہتا ہے۔ چاروں موسم تواتر کے ساتھ یکے بعد دیگرے آتے جاتے رہتے ہیں۔ مغربی ڈسٹربنس کی وجہ سے یہاں بارش ہوتی ہے اور ہمالیہ سے ٹکرا کر یہ ہوا سردی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے شمالی مشرق اور مغرب میں سخت سردی پڑتی ہے۔ ان سب کے پیچھے سائنسی وجوہات ہیں۔ اس کتاب میں بہت تفصیل سے ان موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔

آج بھی ہندوستان کی بہت بڑی آبادی کا انحصار زراعت پر ہے۔ اس کتاب میں مصنفین نے زرعی اصلاحات اور اس کے تحفظات کا بہت باریک بینی سے تجزیہ پیش کیا ہے اس طرح یہ کتاب ان تمام موضوعات کا احاطہ کرتی ہے جن کا تعلق آب و ہوا کی تبدیلی سے ہے۔

موسمیاتی تبدیلی کی وجہ سے ہمارا رہن سہن متاثر ہو رہا ہے، ہماری زراعت پر اس کا خاطر خواہ اثر پڑ رہا ہے، بن موسم کی بارش اور گرمی سردی کا متعینہ وقتوں سے متجاوز ہو جانا ماحولیاتی تبدیلی کا منفی اشاریہ ہے۔ زمان و مکان میں شمسی توانائی اور اس کی تقسیم، زمینی تابکاری اور بعد کی خنکی، زمین اور پانی کا بدلتا ہوا درجہ حرارت... موسم سرما اور گرما جن کا واضح اثر ہماری طرز زندگی پر پڑ رہا ہے۔ اس کتاب کی روشنی میں ہم آسانی سے یہ سب جان سکتے ہیں۔

اردو زبان میں، ادبیات، مذہبیات، فلسفہ اور دیگر موضوعات پر بہت سی کتابیں موجود ہیں، لیکن سائنس اور ٹکنالوجی میں دیگر زبانوں کے بالمقابل خاص طور سے انگریزی کے مقابلے میں کم کتابیں دستیاب ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب نہایت اہم ہو جاتی ہے۔ پروفیسر طاہر حسین اور پروفیسر میری طاہر کی یہ کتاب ان سائنسی موضوعات کا بھرپور احاطہ کرتی ہے اور سائنس کے بنیادی مبادیات سے واقف کراتی ہے جس میں دنیا کے سائنسی موضوعات کے ساتھ ہندوستانی آب و ہوا، کئی اور دیگر موضوعات اور نکات پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس لحاظ سے اس اہم ترین موضوع پر یہ ایک مکمل کتاب ہے۔ اس کتاب کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اردو کے ہر طبقے کے لیے یہ یکساں طور پر مفید ہے۔ اردو کا ایک عام قاری بھی اس کتاب کو پڑھ کر آسانی سے ہندوستان کے جغرافیائی احوال اور ماحولیات سے واقف ہو سکتا ہے اور اپنے علم میں اضافہ کر سکتا ہے اور عالمی موحولیاتی تبدیلی میں مثبت کردار ادا کر سکتا ہے۔

ہوا اور پانی کے ترانے

شاعر: متین اچل پوری

صفحات: 45، قیمت: 20 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر اسد رضا، 97 ایف، سیکٹر 7، جسولا وہار جامعہ نگر نئی دہلی ۔ 25

زیر بحث کتاب بچوں کے لیے کہی گئی نظموں پر مبنی ہے جس میں شاعر متین اچل پوری کی 42 نظمیں ہیں لیکن ان نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں شاعر نے ہوا اور پانی سے متعلق موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر صاف پانی، ہوا چیختی ہے، جھرنا، صاف ہوا، پانی کی چیخیں، ہوا اور کلی، پانی کی کہانی، پانی اور مٹی، ساون، ہوا کی حقیقت، ندی، ناریل پانی، ہوا بولتی ہے، پانی کی جھیل، ہوا کے کام، چنچل پھواریں، ہوا بھی دوا ہے آبشار، ہوا کے روپ اور پانی کے گیت وغیرہ۔ مقدمہ میں خود شاعر متین اچل پوری نے لکھا ہے کہ:

''آج ہوا اور پانی کی آلودگی سے دنیا بھر کے لوگ پریشان ہیں۔ ہمارے ماحول کے زہریلے اثرات ہوا اور پانی میں شامل ہو جانے کی وجہ سے ہوا بھی آلودہ ہو جاتی ہے اور پانی بھی آلودگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ آج ہوا اور پانی کو آلودگی سے بچانا انسانیت کی بڑی خدمت ہے۔''

انسانیت کی بڑی خدمت کرنے اور بچوں کو ہوا اور پانی کو صاف رکھنے کی تعلیم دینے کے لیے ہی شاعر نے اس کتاب میں ہوا اور پانی سے متعلق نظموں کا مجموعہ پیش کیا ہے۔ متین اچل پوری نے ہوا اور پانی کو اللہ کا تحفہ قرار دیتے ہوئے اپنی نظم رب کا تحفہ میں کہا ہے۔

تحفہ ہے رب کا پانی   سب رب کے سب کا پانی
اس کی قیمت جانیں ہم   جانیں اور پہچانیں ہم

اسی طرح اپنی دوسری نظم 'ہوا چیختی ہے' میں شاعر کہتا ہے۔

ہوا چیختی ہے بچاؤ مجھے   نہ ایسے برے دن دکھاؤ مجھے
سنو ہوش اپنے گنواؤ نہ تم   درختوں پہ آرے چلاؤ نہ تم
ہوا چیختی ہے بچاؤ مجھے   زمیں لگ رہی ہے الاؤ مجھے

متین صاحب نے جھرنا اور ندی کے بارے میں بھی دلکش نظمیں کہی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اپنی نظم 'جھرنا' میں فرماتے ہیں۔

جھرنے تیری نظر اتاروں   خوش ہوکر کلکاری ماروں
ساری وادی میں پھرتا ہے   سبز بلندی سے گرتا ہے
جھرنے تیری نظر اتاروں   کاغذ پر تصویر اتاروں

شاعر نے اپنی نظم 'ہوا کی حقیقت' میں سائنسی حقائق کا سہارا لیتے ہوئے بتایا ہے کہ ہم جس ہوا میں سانس لیتے ہیں وہ کن کن گیسوں کی حامل ہے۔ متین کہتے ہیں۔

کون سی گیسیں ہیں اس میں دوں جواب   یہ ہوا گیسوں کا آمیزہ جناب
نائٹروجن گیس اسے کہتے ہیں ہم   آکسیجن کی کرے تیزی جو کم
پایا اس کا بھی تناسب ٹھیک ٹھیک   ہائیڈروجن بھی ہوا میں ہے شریک

اس شعری مجموعے میں شاعر متین اچل پوری نے پانی یعنی بارش سے متعلق ہندوستانی مہینہ 'ساون' پر بھی ایک دلچسپ نظم کہی ہے جس کے چند اشعار پر غور فرمایئے۔

کیا کیا بڑھا رہا ہے تن من میں خون ساون   یہ دلنواز موسم، یہ مانسون ساون
ہاتھوں سے چھین لے گا اپنے بلون ساون   کاغذ کی ناؤ ہم سے بنوائے گا وہ پھر سے

اسی طرح انھوں نے ہوا کی بیماریوں کو ٹھیک کرنے والی خاصیت پر بھی ایک نظم 'ہوا بھی دوا ہے' اس کتاب کی زینت بنائی ہے۔ اس نظم کا ایک بند ملاحظہ کیجیے۔

ہوا بھی دوا ہے   کسی کا کہا ہے
سویریں بلائیں   یہ تازہ ہوائیں
ٹلی ہیں بلائیں   گھٹن کو گھٹائیں

اس کتاب میں ایک پیاری نظم سمندر بھی ہے جس میں شاعر نے سمندر کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس نظم کے یہ تین موثر شعر۔

موج میں ہیں بستیاں تجھ سے یہاں انسان کی   تیرے سینے پر رواں ہیں کشتیاں انسان کی
ورنہ یہ پکوان بے لذت نمک دیتا ہے تو   عارضوں کو ماہی گیروں کے چمک دیتا ہے تو
دودھ سے نہلا رہی ہیں ہم کو یہ موجیں تری   تیرے احسانات گنوائے زباں کیسے مری

اس مجموعے کی آخری نظم 'پانی کی فریاد' سبق دینے والی ہے جس میں متین کہتے ہیں۔

اب اپنے ماحول کو بچانے، قدم اٹھاؤ قلم اٹھاؤ
یہ ہم سے گھبرا کے بولا پانی، مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ
دھواں اگلتے یہ کارخانے، کثافتوں کی یہ حکمرانی
میں دق زدہ اک مریض جیسا ہوئی ہے دشوار زندگانی
یہ بلبلے پھوڑے پھنسیوں سے یہ موج گویا ہے میرا گھاؤ
یہ ہم سے گھبرا کے بولا پانی، مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ

متین اچل پوری نے اپنی نظموں میں بچوں کو چند عمدہ مشورے بھی دیے ہیں، جیسے وہ نظم 'آؤ، پانی پئیں' میں یہ تاکید کرتے ہیں کہ۔

بیٹھ کر پانی پی جیے صاحب   بات پر دھیان دیجیے صاحب

کتاب کا سرورق دلکش اور عنوان کے عین مطابق ہے۔ اس لیے امید ہے کہ اس کتاب کو نہ صرف بچے بلکہ بڑے بھی پسند کریں گے۔

تحقیق و تنقید

سیوان کی ادبی تاریخ

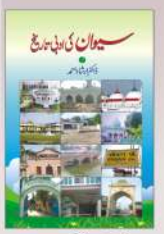

مصنف: ڈاکٹر ارشاد احمد
صفحات:160 ، قیمت 450 روپے، سنہ اشاعت : 2024
ناشر: صغریٰ میموریل پبلک لائبریری، اسلامیہ نگر، سیوان
مبصر: ڈاکٹر محمد مظاہر الحق
شاہین منزل، سلطان گنج، پٹنہ 800006 (بہار)

ڈاکٹر ارشاد احمد کی کتاب 'سیوان کی ادبی تاریخ' میں جو باب قائم کیے گئے ہیں وہ اس طرح ہیں (1) ضلع نامہ:سیوان، (2) سیوان ضلع کا ابتدائی اور ثانوی اردو ادب، (3) سیوان میں اردو غزل کا ارتقائی سفر:ایک جائزہ، (4) سیوان کی خواتین تخلیق کار، (5) سیوان کا ادب اطفال: ماضی تا حال، (6) سیوان میں اردو نثر نگاری ایک اجمالی جائزہ، (7) سیوان میں اردو غزل:موجودہ منظر نامہ، (8) سیوان میں تحقیق وتنقید:ایک بازدید، (9) سیوان کی چند اہم خانقاہیں، (10) سیوان میں اردو صحافت : سفر در سفر، (11) سیوان کی معدوم لائبریریاں، (12) مصنف کا سوانحی خاکہ۔

'ضلع نامہ:سیوان' میں ڈاکٹر ارشاد احمد نے سیوان کی کُل آبادی کیا ہے؟ خواتین اور مردوں کی تعداد کتنی ہے؟ یہاں کی شرح خواندگی کتنی فی صد ہے؟ کتنے فی صد ہندو اور مسلمان آباد ہیں۔سیوان میں کون کون سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔سمندر کی سطح سے اس ضلع کی اونچائی کتنے فٹ ہے۔ کتنے پارلیمانی حلقے اور کتنی صوبائی اسمبلی کی نشستیں ہیں۔مصنف نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

'سیوان ضلع کا ابتدائی اور ثانوی اردو ادب' کے باب میں مصنف نے یہ واضح کیا ہے کہ سیوان ضلع میں اردو ادب کی تاریخ کتنی قدیم ہے۔'سیوان میں اردو غزل کا ارتقائی سفر:ایک جائزہ'۔اس باب میں مصنف نے سیوان میں غزل گوئی کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور ابتدا تا آزادی تک، دوسرا دور آزادی کے بعد 2000 تک اور تیسرا دور 2000 سے دور حاضر تک۔ مذکورہ ادوار پر ڈاکٹر ارشاد احمد نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کا مطالعہ کس قدر وسیع ہے۔

سیوان ضلع کی خواتین تخلیق کار کے باب میں مصنف نے ایسی خواتین تخلیق کار کا ذکر کیا جن کا ذکر تاریخ اردو ادب میں ناپید ہے۔مثلاً بی بی سیدالنسا، آپ کی پیدائش 1878 میں ہوئی اور انتقال 1930 میں ہوا۔سیوان ضلع کے گاؤں تتھلی میں رہائش پذیر تھیں لیکن آپ کے تاریخی قطعات 'تہذیب نسواں' لاہور پاکستان میں تواتر سے شائع ہوتے تھے۔

'سیوان میں ادب اطفال: ماضی تا حال' اس باب میں مصنف نے 1946 سے سیوان میں ادب اطفال کی صورت حال کا جائزہ لے کر موجودہ دور میں ادب اطفال پر دل جمعی سے کام کرنے والوں کے اسمائے گرامی اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔خود مصنف نے بھی بچوں کے لیے نصاب کی کتاب 'جدید اردو ساگر' کی آٹھ جلدیں مرتب کی ہیں۔

'سیوان میں اردو نثر نگاری:ایک اجمالی جائزہ' مذکورہ کتاب کا یہ ایک اہم باب ہے۔اس کی افادیت کا اندازہ ڈاکٹر ارشاد احمد کے مندرجہ ذیل جملوں سے بخوبی ہوجاتا ہے۔ملاحظہ ہو:

''ماضی قریب میں سارن کے حوالے سے جو اردو کے تذکرے شائع ہوئے ہیں وہ صرف شاعروں کے تذکرے ہیں۔ ان تذکروں میں نثر نگاری کی تاریخ، ابتدا اور فروغ پر روشنی نہیں پڑتی ہے۔افسوس کی بات یہ ہے کہ آج تک کسی بھی دانشور، ادیب اور محقق نے اس جانب پیش قدمی نہیں کی ہے۔میں نے بڑی کوشش کر کے سیوان ضلع کے چند معتبر، معروف اور مستند نثر نگاروں کی ادبی خدمات یکجا کی ہیں'' (ص 79)

یہ واضح رہے کہ سیوان ضلع 1972 تک سارن کا ایک حصہ تھا۔

''سیوان میں اردو غزل:موجودہ منظر نامہ'' میں ڈاکٹر ارشاد احمد نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔انھوں نے زمانہ قدیم کے شعرا کا ذکر کیا ہے وہیں موجودہ دور کے شعرا اور ان کی خدمات کا بھی احاطہ کیا ہے۔بقول ڈاکٹر ارشاد احمد 'سیوان میں ایسے شاعر اور ادیب گزرے ہیں جن کا تعلق داغ اسکول سے تھا۔ایک وقت تھا جب جعفر علی خاں اثر، عشرت لکھنوی، شمیم قیصر، نشور واحدی جیسے نابغہ زمانہ شعرا کے شاگرد رشید سیوان میں موجود تھے۔

'سیوان میں تحقیق وتنقید:ایک بازدید' اس باب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیوان ضلع کی سرزمین کیسے کیسے محقق و ناقد کا مسکن ہے۔مثلاً سید حسن عسکری، مولوی امیر حسن، شہاب الدین ثاقب، ڈاکٹر محمد مظاہر الحق، ڈاکٹر ظفر کمالی، ڈاکٹر عبدالبرکات، ڈاکٹر قطب الدین اشرف، ڈاکٹر سید علی عباس، ڈاکٹر ریحان حسن، ڈاکٹر صابر علی سیوانی اور ڈاکٹر ارشاد احمد۔

'سیوان کی چند اہم خانقاہیں' سیوان صوفیوں کی پسندیدہ سرزمین رہی ہے۔ یہاں چودہویں صدی کے ربع اول میں صوفیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ قدیم خانقاہوں میں خانقاہ مخدوم حسن چشتی، تکیہ حیدری، خانقاہ مصطفیٰ آباد اور خانقاہ امجدیہ قابل ذکر ہیں۔

'سیوان میں اردو صحافت:سفر در سفر' باب میں ڈاکٹر ارشاد احمد نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ہندوستان کا پہلا صحافی ہونے کا شرف کس کو حاصل ہے۔اردو زبان کا پہلا اخبار کب منظر عام پر آیا۔سیوان ضلع میں کب کب کون سے اخبارات و رسالے شائع ہوئے اور کن کن لوگوں نے صحافتی ذمے داریاں نبھائیں۔یہ سب معلومات سے قاری واقف ہوجاتا ہے۔

'سیوان کی معدوم لائبریریاں' اس باب میں ڈاکٹر ارشاد احمد نے سارن کی لائبریریوں کا ذکر کیا ہے جو کبھی نامی گرامی ہوا کرتی تھیں۔ان لائبریریوں سے استفادہ کرنے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہوا کرتی تھی مگر زمانے کی ایسی نظر لگی کہ پھلتے پھولتے کتب خانوں پر قفل پڑ گیا۔

آخر میں مصنف کا سوانحی خاکہ اور چند تصویریں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کن اداروں نے مصنف کو ان کی ادبی کارگزاریوں کے عوض ایوارڈ سے نوازا۔

ڈاکٹر ارشاد احمد کی کتاب 'سیوان کی ادبی تاریخ' ایک دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔ عام قاری اور ریسرچ اسکالر دونوں کے لیے مذکورہ کتاب مفید ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی تاریخ لکھنے والوں کے لیے بھی یہ کتاب کارآمد ہے۔

مضامین

ارتباط

مصنف: بسم اللہ عدیم برہان پوری
صفحات: 140، قیمت: 165 روپے، سنہ اشاعت: 2024
ناشر: دارالسرور ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، برہان پور
مبصر: تنویر رضا برکاتی، برکاتِ حبیب منزل ہاؤس نمبر 28
وارڈ نمبر 31 حریر پورہ برہان پور۔ 450331 (مدھیہ پردیش)

بسم اللہ عدیم برہان پوری ادبِ اطفال کے معروف شاعر و ادیب ہیں۔ پوری ادبی دنیا میں برہان پور سے اخبارات و رسائل میں سب سے زیادہ شائع ہونے والی

شخصیت ہیں، اس حوالے سے شہر کی بھرپور نمائندگی فرماتے ہیں۔ پیشے سے شعبۂ خیاطی (ٹیلرنگ) سے وابستہ ہیں۔ آپ کی 1992 میں ایک کتاب بعنوان 'اسمارٹ ٹیلرنگ بک' فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، اتر پردیش کے مالی تعاون سے اشاعت پذیر ہوچکی ہے، جوکہ شعبۂ خیاطی سے تعلق رکھنے والے طلبا کے لیے ہنر مندی اور رہنمائی میں اضافے کے لیے انتہائی اہم ہے۔ حمد ونعت اور سلام پر مشتمل جلوۂ نور 1993 میں، طفلی نظموں پر مشتمل سنہرے خواب 2008 میں، طفلی کہانیوں اور نظموں کا مجموعہ بنام تتلی کے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے 2018 میں، مجموعہ غزلیات لفظوں کی کائنات 2021 میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوچکی ہے۔ زیر نظر کتاب ارتباط ان کے 19 مضامین پر مشتمل ہے۔ ان میں 16 مضامین کا تعلق بالواسطہ یا براہِ راست برہان پور کے ادب سے متعلق ہے۔ کتاب کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ عدیم صاحب نے برہان پور کے ادبی منظرنامے کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی خواہش ہے دیگر علمی، ادبی مراکز کی طرح ملکی سطح کے ادبی منظرنامے پر بھی برہان پر کا ذکر خیر ہوتا رہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''راقم کے مشاہدے کے مطابق یہاں کچھ باذوق محقق، مترجم، مبصر اور لیاقت مند ریسرچ گائیڈ حضرات ہیں لیکن سست گام ہیں۔ اس شہر کی کم نصیبی ہے کہ 1947 کے بعد سے تاحال حوصلہ مند نثاروں کی قلت یہاں رہی ہے۔ ورنہ شہر برہان پور میں اتنے جواہر پارے بکھرے پڑے ہیں کہ انھیں سمیٹ کر گراں مایہ انبار لگا سکتے ہیں۔'' (ارتباط، ص 20)

ارتباط کے مکمل مطالعے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے بسم اللہ عدیم صاحب نے ارتباط کے ذریعے برہان پور کا مختصر ہی سہی لیکن عمدہ تعارف کروایا ہے۔ پہلا مضمون 'اردو زبان کا ارتقائی مرکز برہان پور' میں موصوف نے تاریخی حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ برہان پور اردو زبان کے ارتقائی مراکز میں اہم مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ شہر کے آباد ہونے سے لے کر یہاں کیا کیا ادبی وتاریخی کارہائے نمایاں انجام دیے گئے۔ اس پر بھرپور گفتگو کی گئی ہے۔

چند مضامین شخصیات پر بھی موجود ہیں جیسے 'ایک باکمال شاعر مسرور شفقی، خلیق برہان پوری کی نظموں کا اختصاص، میں نے راز کو دیکھا ساز کو سنا، حسان الہند علامہ آزاد بلگرامی، اقبال محسن کا ادبی کارنامہ، قصیدہ بردہ شریف اور اس کے اردو مترجم علامہ قمرالزماں اعظمی، مولوی محمد اختر رامپوری: ایک ذی العلم شخصیت، شبیر احمد قرار کا سفرِ سخن، نشاطِ غم کا شاعر فاضل انصاری، مظفر حنفی کے رائمس اور میرے تاثرات وغیرہ میں موصوف نے صاحبِ تذکرہ شخصیات کے علمی ادبی کارناموں کے ساتھ ان کی نجی زندگی پر بھی مختصراً نظر ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ برہان پور کے گروہی اسکول اور ان کی نظمیہ شاعری میں حصہ داری، برہان پور میں ادبِ اطفال کا سرسری جائزہ، برہان پور میں کھیلے گئے ڈرامے، تاریخ زرنگار برہان پور (مختصر تجزیاتی مطالعہ)، اردو ادب برہان پور میں لکھے گئے منظوم خط اور دعوت نامے مضامین بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مضامین میں بھی برہان پور کی ادبی تاریخ کے ان گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن پر سرے سے کام ہی نہیں ہوا، یا پھر بہت کم لکھا گیا ہے۔ محققین کی توجہ کو بسم اللہ عدیم نے اس جانب مبذول کرانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔

آج کے اس دور میں جب کہ ہر شاعر وادیب اپنی کتاب پر بڑی بڑی شخصیات سے بڑے شاعر وادیب، ناقد سے تاثرات وآرا کو اپنی کتاب میں شامل فرماتے ہیں، اور فخر محسوس کرتے ہیں تاکہ علمی حلقوں میں کتاب کی قدر وقیمت بڑھ سکے، لیکن اس کے برعکس عدیم صاحب بغیر کسی ادیب کے تاثرات وآرا کے اپنی کتاب شائع کردیتے ہیں۔ پیش لفظ بھی چند سطروں پر ہی مشتمل ہے۔ یہ ان کی سادہ مزاجی نہیں تو ہے اور کیا ہے؟ وہ بے جا تعریفی وتوصیفی کلمات سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔ بڑی سادگی سے وہ اپنی زندگی کا انتہائی اہم ذخیرہ ارتباط کی شکل میں قارئین کے حوالے کرتے ہیں۔ آخر میں پیش لفظ کی چند سطریں ملاحظہ:

''اپنی عمر کے 72 سالہ پڑاؤ اور اب مختلف عارضوں کی کشاکش میں یہ احساس کہ تم نے کیا جمع کیا؟ اس سوال کے نتیجے میں جواب یہ آیا کہ چند کتابوں کا سرمایہ محض ایسی میراث ہے جو فی زمانہ اہل وعیال کے لیے بے فائدہ سہی لیکن خدا کی مخلوق کے لیے شاید کسی قابل ہو۔ باری تعالیٰ مجھ کم مایہ کی یہ محنت اس کے حبیب کے صدقے میں قبول فرمائے۔'' (ایضاً، ص 6)

مجھے یقین ہے علمی ادبی حلقوں میں اس کتاب کی پذیرائی ہوگی۔

تذکرہ و تاریخ

تذکرہ شعرائے ناگور

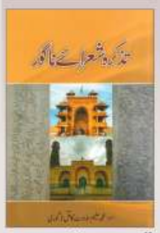

مرتب: محمد سلیم سلاوٹ کامل ناگوری

صفحات: 324، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2023

رابطہ: مون ٹریڈرس، خان مارکیٹ گاندھی چوک ناگور۔ 341001 (راجستھان)

مبصر: حقانی القاسمی، شاہین باغ، نئی دہلی۔ 25

اردو میں جو ادبی تذکرے اور تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں تحفظات، تعصّبات یا عدم رسائی کی صورت میں بہت سے ان جینوئن، مستند شاعروں اور ادیبوں کے احوال و آثار کو جگہ نہیں مل سکی جو مرکزی علاقوں سے دور رہے ہیں۔ اسی لیے اس کے ازالے کے لیے علاقائی تاریخوں اور تذکروں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اگر یہ علاقائی تاریخیں مرتب نہ کی جاتیں تو بہت سے جوہر قابل سے شناسائی کی صورت نہیں نکل پاتی اور بہت سے نامیوں کے نام ونشان بھی مٹ چکے ہوتے۔ اسی لیے جو علاقائی تذکرے لکھے گئے ہیں ان کی بڑی اہمیت اور معنویت ہے کہ مبسوط ادبی تاریخیں ان تذکروں کے بغیر مکمل نہیں کہی جاسکتیں۔

راجستھان بھی ادبی اور تخلیقی لحاظ سے ایک مردم خیز ریاست ہے۔ یہاں کے کئی اضلاع میں شعروسخن کی کہکشاں ہے اور شاید شعروادب کی اسی روایت نے راجستھان جیسے ریگستان کو چمنستان میں تبدیل کیا اور وہاں کے صحرا کو گلزار بنایا۔ ناگور بھی راجستھان کی ریاست کا ایک ضلع ہے جو کبھی جودھ پور کا حصہ ہوا کرتا تھا اور اس میں ڈیڈوانہ، ناگور اور میڑتا وغیرہ شامل تھے۔ ناگور کی شناخت کا سب سے روشن حوالہ حضرت حمیدالدین ریحانی اور قاضی حمیدالدین ناگوری ہیں۔ یہی دو شخصیتیں ہیں جنھیں ناگور میں وارد ہونے والے اولین مسلمان ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حمیدالدین ریحانی کا مزار تو ناگور میں ہی ہے مگر قاضی حمیدالدین ناگوری کا مزار خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ مہرولی میں واقع ہے۔ ان دونوں صوفیا کی وجہ سے ناگور کی ایک الگ شناخت ہے اور یہی وہ سرزمین ہے جس سے ابوالفضل اور فیضی کا وطنی تعلق بھی ہے۔ یہ دونوں اکبر کے نورتنوں میں شامل تھے۔ جیسا کہ محمد سلیم سلاوٹ کامل ناگوری نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ اس کتاب میں 75 شعرا کا ذکر کیا گیا ہے جن کا یا تو ناگور سے وطنی رشتہ رہا ہے یا اقامتی تعلق۔ محمد سلیم سلاوٹ نے اپنے مقدمے میں حضرت حمیدالدین ریحانی، صوفی حمیدالدین ناگوری کے حالات و واقعات، تصانیف وغیرہ کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ صوفی حمیدالدین ناگوری نہ صرف بلند مرتبہ صوفی تھے بلکہ ایک جید عالم بھی تھے جن

کی تصانیف میں لوائح، لوامع، طوالع الشمس، مصباح العاشقین، راحت الارواح، بحرالاسرار، بحرالمرجان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ صاحب کتاب نے وہاں کی کچھ بستیوں کا ذکر بھی کیا ہے جن میں کھاٹو، میڑتا، ڈیڈوانہ قابل ذکر ہیں۔ کھاٹو سے مشہور محقق حافظ محمود خاں شیرانی کا تعلق رہا ہے تو میڑتا میں قاضیوں کا ایک مشہور خاندان ہے جن میں کئی قابل ذکر شعرا پیدا ہوئے۔ ڈیڈوانہ بھی اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہاں علامہ محمد اکرم فیض، قاضی عبدالغفار برقی، عبدالحمید تاباں، مولانا مظفر شاہ اثر وغیرہ جیسی شخصیتیں رہی ہیں۔ محمد سلیم نے شعرا، علما اور ادبا کی خدمات کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔

ناگپور چونکہ صوفیائے کرام کی سرزمین رہی ہے اور تصوف تحقیق کا بھی ایک موضوع و مرکز رہا ہے اس لیے ناگور کی سرزمین سے مورخین و محققین کا بھی بہ سلسلہ تحقیق ایک رشتہ رہا ہے۔ یہاں کی سرزمین میں جو محققین اور مورخین تشریف لائے ان میں زیڈ اے دیسائی، ایچ بی ڈبلو گیرک (H.B. W. Garrick)، خلیق احمد نظامی، بروس لورینس (Bruce Lawrence)، نثار احمد فاروقی اور پرنو پرکاش کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ اس علاقے میں ہندی بول چال کا رواج تھا۔ جیسا کہ سرور الصدور کی ایک عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ بہ زبان ہندی گفتند، مگر یہاں عربی، فارسی اور اردو جاننے والوں کی خاصی تعداد رہی ہے۔ حتیٰ کہ غیر مسلموں میں بھی اردو کا چلن رہا ہے۔ محمد سلیم سلاوٹ نے لالہ لچھمی نرائن آذر کا ذکر کیا ہے جو بہت اچھے شاعر تھے اور جن کی تصانیف میں بھگوت گیتا منظوم، گلدستۂ بھجن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے بہت سے شعرا و ادبا کے سوانحی کوائف کے ساتھ ان کا منتخب کلام بھی درج کیا ہے۔ ان میں کچھ شعرا تو ایسے ہیں جن سے ادبی دنیا آشنا ہے۔ لیکن بیشتر افراد ایسے ہیں جن سے شاید ہی اردو والے مکمل طور پر واقف ہوں۔ جن شخصیات کو قومی سطح پر شہرت اور شناخت حاصل ہے ان میں سید مختار علی ٹونکی، فراز حامدی، خوشتر مکرانوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ناگور کے حوالے سے محمد سلیم سلاوٹ کامل ناگوری کا یہ کام حوالہ جاتی حیثیت کا حامل ہے کہ اس میں ناگور کی علمی، ادبی اور ثقافتی تاریخ سے آگہی کی بہتر صورت نکلتی ہے۔ راجستھان ایک مردم خیز سرزمین ہے اس لیے وہاں بہت سے ایسے علاقے ہیں جہاں سے اردو شعر و ادب کا گہرا رشتہ رہا ہے۔ اس لیے راجستھان کی مجموعی ادبی تاریخ پر بھی کئی کتابیں ترتیب دی گئی ہیں جن میں شاہد جمالی کا تحقیقی و تنقیدی کام واقعی نہایت وقیع ہے کہ اس سے راجستھان کی پوری ادبی، علمی و ثقافتی تاریخ سے شناسائی ہوتی ہے۔ تاریخ ادب اردو راجستھان، تذکرہ شعرائے راجپوتانہ، خم خانہ جاوید میں راجستھان کے شعرا، راجپوتانہ میں تلامذۂ داغ کی شعری خدمات، راجپوتانہ میں اردو، ریختہ اور دوہے وغیرہ بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کا تحقیقی اور تنقیدی ارتکاز ریاست راجستھان پر ہی ہے انھوں نے راجستھان کے نگارخانہ شعر و ادب سے روشناس کرانے کی بہت عمدہ کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ علاقائی تذکرے بھی مرتب کیے گئے ہیں جن میں تذکرہ شعرائے جے پور (احترام الدین احمد شاغل)، تذکرہ بہار سخن (جودھ پور کے شعرا از مولانا شرف الدین یکتا)، تذکرہ شعرائے اجمیر (سید فضل المتین چشتی)، تذکرہ معاصر شعرائے جودھپور (شین کاف نظام)، تذکرہ شعرائے بیکانیر (عبدالعزیز آزاد)، تذکرہ معاصر شعرائے ٹونک (ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی)، تذکرہ شعرائے ادے پور (شاہد عزیز)، تذکرہ شعرائے کوٹہ (عقیل شاداب) اور شاہد جمالی کی کتابیں اجمیر کا دبستانِ شاعری، ہاڑوتی کا دبستانِ شاعری، مارواڑ کا دبستان شاعری، ڈھونڈھار کا دبستانِ شاعری، الور، بھرت پور، دھولپور کا دبستانِ شاعری، ٹونک کا دبستانِ شاعری، میواڑ کا دبستانِ شاعری، ریاست جے پور میں بیرونی شعرا کی شعری خدمات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مگر ناگور کے حوالے سے کوئی باضابطہ تذکرہ یا تاریخ نہیں تھی، اس لیے محمد سلیم سلاوٹ یہ کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس سے ناگور سے تعلق رکھنے والے تمام تخلیق کاروں کے نہ صرف احوال و آثار بلکہ ان کے رنگ سخن سے بھی آشنائی ہوتی ہے۔ یقیناً اس طرح کے کام بہت محنت طلب ہوتے ہیں کیونکہ تمام تخلیق کاروں تک رسائی آسان نہیں ہوتی۔ محمد سلیم سلاوٹ بنیادی طور پر درس و تدریس سے وابستہ رہے ہیں، اردو شعر و ادب سے انھیں جنون کی حد تک محبت ہے اور انجمن فروغ اردو کے صدر ہیں۔ وہ نوائے اردو درجہ دہم کی درسی کتاب کے مرتبین میں بھی شامل ہیں۔ انھوں نے اپنی مٹی کا قرض ادا کرنے کے لیے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ یقینی طور پر اس سے راجستھان کی ادبی و ثقافتی تاریخ مرتب کرنے والوں کو رہ نمائی اور روشنی ملے گی۔

شاعری

سخن زار (رباعیات)

شاعر: ڈاکٹر معصوم شرقی

صفحات: 152، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: ایم آر پبلی کیشن، دہلی

مبصر: خوشبو پروین، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف دہلی۔7

ڈاکٹر معصوم شرقی کا ادبی سفر 50 برسوں پر محیط ہے۔ انھوں نے اردو ادب کے ذخیرے میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے نثری اصناف پر خوب لکھا ہے اور اس میں اپنی شناخت بنانے میں کامیاب بھی ہوئے۔

سخن زار ان کی رباعیات کا پہلا مجموعہ ہے جو 152 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ معصوم صاحب نے جوش ملیح آبادی کی طرح ہی رباعی کے مشکل ترین ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جوش ملیح آبادی نے کہا تھا کہ:

''رباعی ایک بہت ہی بری بلا اور جان لیوا صنف کلام ہے۔ یہ کمبخت 40 برس سے پیشتر کسی بڑے سے بڑے شاعر کے بس میں آنے کی چیز ہی نہیں، بات یہ ہے کہ جب تک کسی شاعر کو بے پناہ مشاقی اور نہایت دیدہ وری کی بدولت دریا کو کوزے میں بھر لینے کا کام نہیں آتا اس وقت تک رباعی اس کے قابو میں نہیں آتی ایک ننھے سے قطرے میں قلزم کو مقید کر لینا ہر شاعر کے بس کا روگ نہیں۔'' قطرہ و قلزم جوش ملیح آبادی، ص 2-1)

ڈاکٹر معصوم شرقی بھی اپنے دیباچے میں کچھ اسی طرح کی بات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

''رباعی کی دنیا میں قدم رکھنا برہنہ پا ایک خارزار میں پاؤں رکھنے کے مترادف ہے رباعی ایک تخلیقی اور عروضی عمل ہے جس کے اظہار کے لیے سخت ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔'' (سخن زار معصوم شرقی، ص 6)

سخن زار میں 250 رباعیات شامل کی گئی ہیں ان رباعیات میں تصوف، اخلاق، فلسفہ، زندگی اور موت، رنگ بدلتی ہوئی دنیا، انسانیت سے عاری انسان، ذاتیات اور حالات حاضرہ کی سیاست کے موضوع پر رباعیاں موجود ہیں۔

اردو ادب کی عام روایت ہے کہ جب کسی شاعر کی کوئی کتاب منظر عام پر آتی ہے تو اس کتاب میں حمد، نعت رسولؐ اور منقبت کے چند اشعار ضرور ہوتے ہیں لیکن ڈاکٹر معصوم شرقی کی کتاب سخن زار میں حمدیہ یا نعتیہ کوئی رباعی درج نہیں ہے انھوں نے اپنی کتاب سخن زار میں کلکتہ شہر کا ذکر خوب کیا ہے غالباً انھیں یہ شہر بہت راس آیا ہو اور شاید

یہی وجہ ہوگی کہ ان کی اس کتاب میں جہاں سے رباعیات پیش کی گئی ہیں شہر نشاط کی رباعیات ہی سے کی ہیں چند رباعیاں دیکھیے۔

آماجگاہ علم و ہنر کلکتہ	ہے وحشت و پرویز کا گھر کلکتہ
اس شہر سے ہے نسبت قلبی مجھ کو	رکھتا ہے مجھے محو سفر کلکتہ
خوش رنگ نظاروں سے سجی ہے یہ زمیں	ہر گام پہ آتے ہیں نظر روئے حسیں
مشہور جہاں شہر ہے یہ کلکتہ	کردار مساوات و اخوت کا امیں
کلکتہ تہذیب و ثقافت کا نگر	رکھتا ہے تمدن میں یہ اپنا اثر
اس بات کو کرتا ہے زمانہ تسلیم	کلکتہ ہے علم و ہنر کا دفتر

ڈاکٹر معصوم شرقی نے بے جا تشبیہات و استعارات کا سہارا نہ لے کر اپنی رباعیات کو پیچیدگی سے بچاتے ہوئے بالکل سادہ الفاظ کا استعمال کر کے نہایت سلیس انداز میں رباعیات کہی ہیں۔ رباعیاں دیکھیے۔

سہما ہوا انسان سدا رہتا ہے	کب خوف بھلا دل سے جدا رہتا ہے
کس وقت کوئی حادثہ پیش آ جائے	ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا ہے

سہما ہوا دبکا ہوا گھبرایا ہوا	پیچیدہ مسائل میں ہے الجھایا ہوا
زندہ ہے مگر زندہ دلی سے عاری	کیوں آج کا انسان ہے مرجھایا ہوا

فارسی کے مستند اور مشہور رباعی گو شاعر سعید سرمد سے معصوم شرقی بڑی عقیدت رکھتے ہیں اس کتاب کا انتساب بھی انہی کے نام کیا گیا ہے اور ان کی عقیدت میں ایک رباعی بھی کہی ہے۔

بر چرخ ادب مثل قمر تھے سرمد	دریائے رباعی کے گوہر تھے سرمد
تھا ان کا تصوف سے تعلق معصوم	مجموعہ خوبی و ہنر تھے سرمد

ڈاکٹر معصوم شرقی نے نثر و نظم دونوں میں طبع آزمائی کی، لیکن انھوں نے شاعری سے زیادہ ادب تخلیق کیا ان کی کئی کتابیں زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ جن میں؛ عکس تاب؛ 2009 نظیر ثانی؛ اشک امرتسری؛ ادب جہاں؛ تنقید و تحلیل؛ ادب و عصر؛ ادب و احتساب؛ کلکتے کا ادبی ماحول بیسویں صدی میں؛ تراوش قلم اور لمحوں کے قدم وغیرہ موصوف ناقد، محقق، شاعر اور نثر نگار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں مقبول ہیں۔

ترتیب

مظفر فہمی

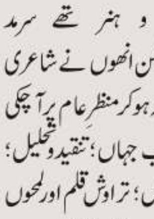

ترتیب و تدوین: انجینئر فیروز مظفر

صفحات 284، قیمت 300 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: مظفر حنفی میموریل سوسائٹی، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: مسعود بیگ تشنہ

گرین پارک کالونی 65A دھار روڈ، اندور 452002 (ایم پی)

'مظفر فہمی' انجینئر فیروز مظفر کی ترتیب و تدوین سے سجی کتاب کا نام ہے جو اپریل 2024 کو مرحوم مظفر حنفی کی 88 ویں یوم ولادت پر زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئی ہے جو مظفر حنفی میموریل سوسائٹی، نئی دہلی کے اشاعتی سلسلے کے تحت شائع ہوئی ہے۔ مظفر حنفی کی ادبی وراثت کو سنبھالے ان کے بیٹے فیروز اور پرویز ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ دونوں ہی اپنے اپنے طور پر اپنے مرحوم والد کی شخصیت و ادبی خدمات کے تعلق سے کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ معیاری و حوالہ جاتی کتابی اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

فیروز مظفر نے ترتیب و تدوین کا کام اپنی جوانی کے دنوں میں ہی بہت پہلے سنہ 1999 سے ہی شروع کر دیا تھا۔ کتاب کے تقریظی مضمون (ص 7 تا ص 34) 'مظفر فہمی کیوں ضروری ہے' میں فیروز مظفر یوں رقم طراز ہیں:

[مقالہ نگار (محبوب راہی) نے مظفر حنفی کے 1984 تک کے تخلیقی، تحقیقی اور دیگر ادبی سرمائے کی روشنی میں ان کے ادبی مرتبے کا تعین کرنے کی مخلصانہ کوشش کی لیکن متعدد اصناف شعر و ادب پر محیط مظفر حنفی کے ادبی کارناموں سے متعلق ہند و پاک کے سیکڑوں ناقدین و مبصرین نے جو کچھ لکھا تھا اس کی سمائی اس مقالے میں ممکن نہیں تھی اور بہرصورت یہ کام ادھورا تھا، چنانچہ میں نے مظفر حنفی کی کتابوں پر تحریر کیے جانے والے ممتاز شعرا، ادبا اور ناقدین کے مضامین و تبصرے وغیرہ کا جو سرمایہ رسائل و جرائد میں بکھرا ہوا تھا، 1999 میں مرتب کر کے 'مظفر حنفی: ایک مطالعہ' کی صورت میں شائع کر دیا تھا جس میں کوئی مضمون مرتب کی فرمائش پر نہیں لکھا گیا تھا اور 2013 میں 'مظفر حنفی: حیات و جہات' ترتیب دے کر (2014 میں اور نئے ایڈیشن کی شکل میں 2021 میں) شائع کی تھی۔

پیش نظر کتاب کی ترتیب و اشاعت کا مقصد مظفر حنفی کے کثیر الجہات ادبی کارناموں پر لکھے گئے تازہ بہ تازہ مضامین کو بیک وقت اہل نظر کے سامنے لانا ہے تا کہ ان کی مجموعی ادبی حیثیت کا از سرِ نو تعین کیا جا سکے کیونکہ دو ضخیم جلدوں پر مشتمل 'کمان' اور 'تیزاب میں تیرتے پھول' موصوف کا شعری کلیات اور 'بھولی بسری کہانیاں' افسانوی کلیات ہمارے سامنے ہیں]

اقتباسِ بالا (ص 13) سے مظفر فہمی کیوں ضروری ہے؟ کے سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ اسی مضمون کے آخر میں ص 13 سے ص 34 تک 'مظفر حنفی کے حالات زندگی اور کارناموں پر ایک نظر' کے ذیلی عنوان سے روشنی ڈالی گئی ہے تا کہ ان کے حالاتِ زندگی اور کارنامے سلسلے وار نظر میں آ جائیں۔

ایس ایم حسینی اپنے مضمون 'پروفیسر مظفر حنفی: پانچواں درویش' میں رقم طراز ہیں:

[آپ (مظفر حنفی) نے 1948 میں محض بارہ سال کی عمر میں بچوں کے لیے چھوٹے چھوٹے چٹکلوں پر مشتمل کہانیاں، نظمیں لکھنی شروع کیں، جو پہلے پہل بچوں کے رسالہ کھلونا (دہلی)، ٹافی (مالیگاؤں)، کلیاں (لکھنؤ) اور 'دوست' کراچی وغیرہ میں چھپیں، لڑکپن میں ہی ادب اطفال کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری میں بھی اپنے جوہر دکھائے، 1953 میں دادا میاں کی مزار سے متعلق، جو کہ کانپور میں محلہ بیکن گنج میں متصل ہے، پہلا افسانہ 'منت کی چادریں' لکھا جو ماہنامہ 'شمع' دہلی میں شائع ہوا۔ 1960 تک تقریباً ڈیڑھ سو افسانے تخلیق کیے جو مسلسل موقر ادبی رسالوں کی زینت بنتے رہے۔ 1954 میں نسیم بکڈ پو لکھنؤ سے پہلا ناول چھپا جو انگریزی سے ماخوذ تھا، ان کے تین افسانوی مجموعے 'اینٹ کا جواب' 1967، 'دوغنڈے' اور 'دیدۂ حیراں' 1968 میں منظر عام پر آئے جس میں توصیفی دیباچے فراق گورکھپوری، کنہیالعل کپور اور کرشن چندر نے لکھے اور ایک اچھا افسانہ نگار تسلیم کیا ہے (ص 75-74]

اس اقتباس بالا اور اسی طرح کے دیگر مضامین پڑھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ مظفر حنفی کا تخلیقی ذہن بچپن سے ہی کس سرعت سے ادب کے میدان میں گھوڑے دوڑا رہا تھا۔ اسی مضمون میں ایس ایم حسینی آگے رقم طراز ہیں...[مظفر حنفی کی پہچان ان کی شاعری ہے، وہ ایک کہنہ مشق اور بقول شمس الرحمن فاروقی زود گو شاعر تھے، جب آپ اسکول میں زیر تعلیم ہی تھے، اسی زمانے سے نظمیں اور غزلیں کہنا شروع کر دی تھیں، پھر آپ نے افسانہ نگاری چھوڑ کر شاعری کی دنیا میں پورے انہماک کے ساتھ قدم رکھا، اپنے منفرد انداز و لہجے اور ذاتی تجربات و مشاہدات کو شاعری کا پیراہن عطا کر کے نئی

پہچان بنائی جو آپ کی آواز بھیڑ میں گم ہونے نہیں دیتی ہے، اور کلام میں شاد عارفی کا اثر صاف نظر آتا ہے، مظفر حنفی نے 1962 میں شاد عارفی کی باقاعدہ شاگردی اختیار کی جس کا ذکر آپ نے ایک انٹرویو کے دوران یوں کیا ہے:

''شاد عارفی کی طنزیہ نظمیں اور غزلیں مجھے بہت پہلے سے بھاتی تھیں، ان سے خط و کتابت کا سلسلہ 'نئے چراغ' کی ادارت کے زمانے میں ہی شروع ہوا، وہ ہمارے پرچہ کے مستقل لکھنے والوں میں سے تھے جب میں نے آگے چل کر شاد عارفی کی باقاعدہ شاگردی اختیار کی اور نومبر 1962 سے فروری 1964 تک تقریباً چودہ مہینے ان سے اپنی تقریباً ڈیڑھ سو غزلوں پر اصلاح لی، یہ سب ڈاک کے وسیلے سے ہو رہا تھا، فروری 1964 میں وہ وفات پا گئے لیکن ان کی تحریروں سے آج تک سیکھتا رہتا ہوں۔
(ص 78-77)

درج بالا اقتباسات کو جوں کا توں درج کرنے کی غرض و غایت مظفر حنفی کی تخلیقی فعالیت کا عین جوانی کا دور اور افسانہ نگاری سے ہٹ کر شاعری کی طرف رجعت اور شاد عارفی کے طنزیہ طرز کی اثر انگیزی قبول کرنے کے زمانی عرصے اور اس کی مدت کو سامنے لانا ہے۔ ایک مسئلہ سنہ اشاعت اور تخلیقی سنہ کے فرق کا بھی ہے۔ اس فرق کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ کئی لکھنے والے سنہ اشاعت کو ہی تخلیقی سنہ سمجھ کر خامہ فرسائی کر لیتے ہیں. اس فرق کی سمجھنے کا اشارہ بھی کتاب میں دیا گیا ہے۔

مظفر حنفی کی ادبی زندگی کا آغاز بچوں کے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے ہوا (ڈاکٹر خوشحال زیدی ص 41)۔ ادبِ اطفال، افسانہ نگاری و ناول نگاری اور شاعری سے ہٹ کر خاکہ نگاری، ترجمہ نگاری، تنقید و تحقیق، اردو شاعری کا پچاس سالہ انتخاب، منتخب اشعار کا تدوین و انتخاب خاص طور پر شاد عارفی کی کلیات کی تحقیق و تدوین و انتخاب، کتابیاتی تدوین، سفر نامہ، مونو لاگ یہ وہ اہم ادبی کام ہیں جو ستر سالہ ادبی کارناموں کے آخری پچاس سالوں پر محیط ہیں اور سخن گوئی کے شانہ بہ شانہ چلتے رہے ہیں۔

مظفر حنفی بیسویں صدی کی واحد ایسی ادبی شخصیت ہیں جو اردو شعر و ادب کی دنیا میں نہ صرف زود گو شاعر ہی تھے بلکہ ویسے ہی نثار بھی تھے۔ شاعری کی ہر صنف پر طبع آزمائی کا نقش چھوڑنا کوئی معمولی بات نہیں۔ شاعری میں طنز کو اس درجہ انتہا پر پہنچایا کہ امامِ طنزیات ہو گئے. نئے اور جدید شاعر ایسے بنے کہ شمس الرحمٰن فاروقی اور ان کے رسالے 'شب خون' کے سر میں سما گئے۔ انسان دوستی اور طبقاتی کشمکش کو یوں اجاگر کیا کہ اشتراکی اور ترقی پسندوں کے بیچ میں شمار کیے گئے، جس نے جس عینک سے دیکھا مظفر حنفی ویسے ہی لگے، یہی کیفیت اس کتاب کے مضامین پڑھ کر محسوس ہوتی ہے۔ تمام مضمون نگار معروف نام ہیں۔ تمام مضامین مجموعی طور پر مظفر حنفی فہمی میں اہم کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ زیادہ تر مضمون نگاروں نے اپنے اپنے وقتوں میں یہ مضمون عرق ریزی اور ایمانداری سے لکھے ہیں۔

معیار و میزان

مرتب: ابراہیم افسر
صفحات: 496، قیمت: 650 روپے، سنہ اشاعت: 2024
ناشر: اصیلا آفسیٹ پرنٹرس، 1307/1308
کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی -110002
مبصر: ڈاکٹر مدنی اشرف، سرودیہ بال ودیالیہ، بلند مسجد، شاستری پارک، نارتھ ایسٹ، دہلی 53

ابراہیم افسر کی تازہ کتاب 'معیار و میزان [رشید حسن خاں کی کتابوں پر تبصرے و تجزیے]' شائع ہوئی ہے۔ انھوں نے زیرِ نظر کتاب میں مشہور و معروف محقق رشید حسن خاں کی زیادہ تر کتابوں پر اہلِ قلم کے تبصروں اور تجزیوں کو شامل کیا ہے۔ رشید حسن خاں نے اپنی کتابی زندگی کا سفر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی کے زیرِ سایہ شروع کیا تھا۔ دراصل 1965 میں حکومت جموں کشمیر کے مالی اشتراک سے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی نے معیاری کتابی سیریز کی ابتدا کی تھی۔ اس کا مقصد طلبہ کے لیے اعلا معیاری متن تیار کرنا تھا۔ اس سلسلے میں رشید حسن خاں نے باغ و بہار، گلزارِ نسیم، مثنوی سحر البیان، انتخابِ ناسخ، انتخابِ کلامِ سودا، گذشتہ لکھنؤ، حیاتِ سعدی، موازنہ انیس و دبیر، دیوانِ درد وغیرہ کتابوں کو معیاری متن کے ساتھ مرتب کیا تھا۔ بعد میں رشید حسن خاں نے مذکورہ کتابوں میں سے بعض کتابوں کے تنقیدی ایڈیشن بھی تیار کیے جو مدونین و محققین کے لیے مثالی متن کا نمونہ ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب 'معیار و میزان' میں ابراہیم افسر نے رشید حسن خاں کی جن کتابوں پر تبصرے و تجزیے شامل کیے ان میں حیاتِ سعدی، مقدمہ شعر و شاعری، موازنہ انیس و دبیر، دیوانِ درد، گذشتہ لکھنؤ، انتخابِ مضامینِ شبلی، اُردو املا، اُردو کیسے لکھیں، زبان اور قواعد، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، دیوانِ حالی، تلاش و تعبیر، فسانۂ عجائب، باغ و بہار، نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، انشائے غالب، انشا اور تلفظ، عبارت کیسے لکھیں، گلزارِ نسیم، مثنویاتِ شوق، تدوین تحقیق روایت، سحر البیان، املائے غالب، مصطلحاتِ ٹھگی، زٹل نامہ (کلیاتِ جعفر زٹلی) کلاسکی ادب کی فرہنگ [جلد اوّل] گنجینۂ معنی کا طلسم کے علاوہ رشید حسن خاں کی دو ہندی کتابیں [انتخابِ نظیر اکبر آبادی، قطعے اور رباعیاں] شامل ہیں۔

ابراہیم افسر نے کتاب کی ابتدا میں رشید حسن خاں کے کارہائے نمایاں پر پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر سید مجاور حسین، پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ اور نامی انصاری کی آرا کو درج کیا ہے۔ ان چاروں ادبی بزرگوں نے یک زبان لکھا کہ رشید حسن خاں نے اُردو تحقیق و تدوین کے جو مثالی نمونے قارئین کے لیے چھوڑے ہیں ان کی ورق گردانی کرنا کسی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ رشید حسن خاں جہاں ایک طرف تحقیقی معاملات میں خاص درک رکھتے تھے وہیں ان کا تنقیدی شعور بھی دوٹوک اور شفاف تھا۔ متنی تدوین میں تو ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔

حافظ صفوان احمد چوہان نے اپنے حرفے چند 'بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں...' میں ابراہیم افسر کی محنت شاقہ اور ادبی مساعی کی خوب تعریف کی ہے۔ وہیں انھوں نے رشید حسن خاں کی کتابوں پر لکھے گئے تبصروں اور تجزیوں کے بارے میں لکھا کہ ابراہیم افسر کی مرتبہ کتاب ایک حوالہ جاتی کتاب کے مماثل ہے۔

رشید حسن خاں کی مشہور کتاب 'اُردو املا' جب 1974 میں منظرِ عام پر آئی تو قارئین اور ناقدین نے اس کی خوب پذیرائی کی۔ دراصل یہ کتاب اُردو املا کمیٹی 1973 کی سفارشات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شائع کی گئی تھی۔ اس کتاب پر بعض ناقدین نے خوب اعتراض بھی کیے۔ زیرِ نظر کتاب میں اس کتاب پر تبصرہ لکھنے والوں میں ڈاکٹر عنوان چشتی، علی جواد زیدی، ڈاکٹر عبدالحق، عبداللہ ولی بخش قادری، سید شہاب الدین دسنوی، ڈاکٹر شریف الدین، حافظ صفوان محمد چوہان، مخمور سعیدی اور رشید نعمانی شامل ہیں۔ علی جواد زیدی اور سید شہاب الدین دسنوی نے رشید حسن خاں کی املائی سفارشات سے اختلاف کیا ہے۔

رشید حسن خاں کی ایک اور مشہور کتاب 'زبان اور قواعد' پر مخمور سعیدی، خلیق انجم، ماہر القادری، نور الحسن انصاری، ڈاکٹر محمد حسن اور امتیاز علیمی نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا

ہے۔اس کتاب میں اُردو لغات پر کئی ضخیم مضامین خاں صاحب نے شامل کیے ہیں۔ 'ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ' میں رشید حسن خاں نے اپنے اُن تبصروں کو شامل کیا جن کی وجہ سے انھیں شہرت دوام حاصل ہوئی۔ ظ انصاری نے اپنے تبصرے میں رشید حسن خاں کی تحقیقی کاوشوں کا احاطہ پیش کرتے ہوئے لکھا کہ یہ اُن نو مضامین کا مجموعہ ہے جو بیش تر رسالوں میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ تحقیقی صلاحیت کے لحاظ سے وہ اُردو کے کسی سینئر اُستاد سے کم نہیں لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے درس گاہیں انھیں ان کا مناسب مقام نہیں دے سکیں (ص 210)''

رشید حسن خاں کی آخری کتاب 'گنجینۂ معنی کا طلسم' ہے جو ان کی زندگی میں شائع نہ ہوسکی۔اس کتاب کی پہلی جلد انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی اور غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے باہمی اشتراک سے 2017 میں، دوسری جلد 2018، تیسری جلد 2019 میں شائع ہوئی۔ 'گنجینہ معنی کا طلسم' کی تینوں جلدوں کو ایک ضخیم جلد میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے لاہور سے 2019 میں شائع کیا۔خاں صاحب نے اس کتاب میں مرزا غالب کے کلام میں درآئے مرکبات و مفردات الفاظ پر تحقیق کی ہے۔اس کتاب کا مقدمہ غالب شناسی میں اپنی مثال آپ ہے۔

رشید حسن خاں اپنے آخری ایام میں کلاسیکی ادب کی فرہنگ پر کام کر رہے تھے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے ایما پر 'کلاسکی ادب کی فرہنگ' (پہلی جلد) 2003 میں منظرِ عام پر آئی۔ موصوف اس کتاب کو تین جلدوں میں شائع کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی عمر نے وفا نہیں کی اور وہ اس خواہش کو لیے ہوئے فروری 2006 میں رخصت ہو گئے۔

المختصر، ابراہیم افسر کی مرتب شدہ کتاب کے مطالعے سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ رشید حسن خاں کے علمی و ادبی کارناموں کو ان کے معاصرین و ناقدین کس نگاہ سے دیکھتے تھے۔ان تبصروں کے مطالعے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ تبصرہ لکھتے وقت کن امور کو ملحوظ رکھا جائے۔ ریسرچ اسکالر، محققین و نئے مبصرین کے لیے یہ کتاب بہت ہی کارآمد و سود مند ہے۔ فاضل مرتب نے اپنے تحقیقی و تنقیدی ابتدائیے اور مقدمے میں رشید حسن خاں کی کتابوں کا جہاں ایک جانب تفصیلی تعارف پیش کیا وہیں دوسری جانب رشید حسن خاں کی کتابوں سے متعلق علمی و ادبی مباحث قارئین کے سامنے پیش کیے۔انھوں نے ص 24 اور 25 پر رشید حسن خاں کی کتابوں کی مکمل فہرست مع سنہ اشاعت بھی شامل کتاب کی ہے۔ یہ کتاب علمی و ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی حاصل کرے گی۔

■

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/ چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر .... بتاریخ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

دستخط

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ 'اردو دنیا' علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس و ٹکنالوجی، طب و فلسفہ، فنونِ لطیفہ، نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کر لیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطورِ خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہو چکے ہوں۔ ایسے موضوعات/شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق، حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/ مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔ اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبرنامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔

یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

بچوں اور نوجوان قاری کے ارتقائی شعور کے لیے ادب تخلیق کرنے کی ضرورت: ڈاکٹر شمس اقبال

قومی اردو کونسل میں ادب اطفال کی تشکیل کے ممکنہ عصری زاویوں اور جہات پر تخلیق کاروں کی اہم میٹنگ

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے صدر دفتر میں بچوں کے ادب کی تشکیل کے ممکنہ عصری زاویوں اور جہات پر تخلیق کاروں کی میٹنگ منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ میں ملک کے مختلف گوشوں سے نمائندہ تخلیق کاروں کو مدعو کیا گیا۔ تعارفی

کلمات پیش کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ قومی اردو کونسل جہاں ادب، تاریخ، تہذیب وثقافت وغیرہ پر کتابیں شائع کرتی ہے وہیں بچوں اور نوجوانوں کے لیے بھی تخلیقات کی اشاعت اپنا فرض سمجھتی ہے۔ قومی اردو کونسل اردو کا واحد ادارہ ہے جو تمام عمر کے لوگوں کا خیال رکھتے ہوئے کتابیں شائع کرتی ہے۔ قومی اردو کونسل نے درسی اور غیر درسی ہر طرح کی کتابیں شائع کی ہیں۔ میٹنگ کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ آپ کے مشورے سے ہمیں روڈ میپ تیار کرنے میں مدد ملے گی۔ آج ہم اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ اسے مزید کیسے بہتر بنایا جائے اور آپ ایسے مشورے دیں جن کو سامنے رکھ کر کونسل ایک روڈ میپ تیار کرسکے۔ آج انٹرنیٹ، سیفٹی یا حفاظتی تدابیر، مالیاتی خواندگی، صنفی مساوات، جسمانی اثباتیت، باہمی مسائل، تنوع، ہجرت، سائنس فکشن، خاندانی نامیات وغیرہ موضوعات پر بچوں کے مزاج اور نفسیات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے کتاب تخلیق کرنے کی ضرورت ہے۔

اس موقعے پر معروف ناول نگار پروفیسر خالد جاوید نے بچوں کے لیے ایسے ادب کی تخلیق پر زور دیا جس سے بچوں میں سائنسی مزاج پیدا ہوا اور وہ منطقی طور پر چیزوں کو دیکھ سکیں اور غور وفکر کرسکیں۔ 'اللہ میاں کا کارخانہ' کے مصنف محسن خان نے کہا کہ بچوں کی تربیت کے لیے ایسی چیزیں تخلیق کرنی چاہئیں جو بچوں کو راغب کرسکیں اور کتاب پڑھنے کی طرف ان کے ذوق وشوق کو بڑھا سکیں۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ جس طریقے سے انگریزی میں تین کیٹگری میں بچوں کا ادب تخلیق کیا جاتا ہے اسی طریقے سے اردو میں بھی ہونا چاہیے۔ بچوں کی تخلیق میں مافوق الفطرت عناصر کی جگہ زندگی سے جڑی چیزوں کو شامل کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے آدیواسی بچوں پر بھی توجہ دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ ماہر تعلیم اور فکشن نگار پروفیسر غضنفر نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل کی طرف سے اس پہل کا خیر مقدم

کیا جانا چاہیے۔ کونسل نے ایسے تخلیق کاروں کو مدعو کیا جن کا تعلق درس وتدریس سے بھی ہے۔ یہ بچوں کی ضروریات کو زیادہ سمجھتے ہیں، بچوں کا ادب تخلیق کرتے وقت بچوں کی ذہنی سطح کا خیال رکھا جانا بے حد ضروری ہے ورنہ بچوں کی دلچسپی ختم ہوجاتی۔ انھوں نے بچوں کے لیے بنیادی لغت برائے ادب اطفال (Basic-Vocabulary)، مشترکہ تہذیب، محاورے، ضرب المثل اور گرامر وغیرہ کی کتابیں تیار کرنے پر بھی زور دیا، نیز انھوں نے کہا کہ بچوں کے لیے ایسی دلچسپ کتابیں ہونی چاہئیں جو اخلاقیات بھی سنوارے اور مشترکہ تہذیب وثقافت سے بھی بچوں کو آگاہ کرے۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد (سابق وائس چانسلر، مولانا مظہرالحق، عربی و فارسی یونیورسٹی، پٹنہ) نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ کتابوں کی طرف بچے اور نوجوان نسل کو راغب کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے لیے اسکولوں میں مقابلہ جاتی پروگرام وغیرہ کرائے جاسکتے ہیں۔ قومی اردو کونسل کو اسکولوں میں سروے کرانا چاہیے اور اس کے مطابق بچوں کا ادب تخلیق کیا جانا چاہیے کہ بچوں کو کہاں کس طرح کے ادب کی ضرورت ہے۔ سینئر افسانہ نگار ڈاکٹر نگار عظیم نے اپنی تقریر میں کہا کہ بچوں کے ساتھ ساتھ والدین اور سرپرستوں کے لیے بھی کتابیں تحریر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ بچوں کے مسائل اور ضرورتوں سے آگاہ ہوسکیں۔ مشہور داستان گو اور ڈراما نگار جاوید دانش نے اِن کلاس ڈراما ریڈنگ اور اسٹوری ٹیلنگ کمپٹیشن وغیرہ پر زور دیا۔ آجکل کے سابق مدیر خورشید اکرم نے کہا بچوں کے لیے ایسا ادب تخلیق کیا جانا چاہیے جو بچوں میں انسانی اور سائنسی فکر پیدا کرے اور وہ منطقی طور پر چیزوں کے اندرون میں داخل ہوکر غور وفکر کرسکیں۔ ڈاکٹر قاسم خورشید نے کہا کہ آج ہمیں فیلڈ میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ گلوبل ورلڈ نے گاؤں اور شہروں کی دوری کو ختم کردیا ہے، جو بھی ادب ہم تخلیق کریں اس میں بچوں کی شمولیت کا خیال رکھیں۔ ڈاکٹر محمد علیم نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دیہی علاقوں کے بچوں کے مسائل کو پیش نظر رکھ کر بھی ادب تخلیق کیا جانا چاہیے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر سید ظفر اسلم، ڈاکٹر پرویز شہریار، ڈاکٹر رخشندہ روحی، ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا اور ڈاکٹر حبیب سیفی اور ڈاکٹر ثروت خان نے بھی اظہارِ خیال کیا اور بچوں کے ادب کے متعلق اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی کے شکریے پر میٹنگ کا اختتام ہوا۔

میٹنگ میں قومی اردو کونسل سے ڈاکٹر مسرت (ریسرچ آفیسر)، محمد بہلول وغیرہ موجود رہے۔ تکنیکی تعاون محمد افروز نے پیش کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 9 مئی 2023

سری نگر میں قومی اردو کونسل کے 27 ویں کتاب میلے کا انعقاد کیا جائے گا

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر فروغ اردو بھون میں آج 'اردو کتاب میلے/ بک فیسٹیول' کے سلسلے میں ایک اہم میٹنگ کا انعقاد کیا گیا۔ قومی اردو کونسل حکومت ہند کے وزارت تعلیم کے تحت چلنے والا اردو کا ایک خودمختار ادارہ ہے۔ اس لیے اردو زبان وادب کو درپیش عصری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کونسل کے فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے اس بات پر زور دیا کہ کتاب کلچر کو فروغ دینے کے لیے ہندوستان

کے ہر ایک شہر، ہر ایک کونے میں بڑے پیمانے پر کتابوں کی نمائش اور خرید وفروخت کے لیے ہر ایک ممکن اقدام کیے جائیں گے۔ آج کی اس میٹنگ میں اردو کے مشہور و معروف بک پبلشرز کو نہ صرف مدعو کیا گیا بلکہ ایک ایسا لائحہ عمل بھی طے کیا گیا جس میں اردو زبان وادب کے قاری تک ان کے ہی شہر میں رسائی آسان کردی جائے۔ یہ بات سبھی کے علم میں ہے کہ قومی اردو کونسل کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ کتابوں کی اشاعت، اداروں میں اردو ذریعۂ تعلیم، ملک کے سبھی حصوں میں کمپیوٹر سینٹر کا قیام، سمینار/سمپوزیم کے لیے مالی اعانت اور ایک بڑے پیمانے پر خوشگوار ماحول میں عوام کی سہولت کے پیش نظر کتابی میلوں کا انعقاد کیا جاتا رہا ہے۔

آج قومی اردو کونسل میں 29 اردو کے پبلشرز کے ساتھ میٹنگ میں متفقہ طور پر یہ طے کیا گیا کہ سال 2024 میں ہونے والا اردو کا سب سے بڑا کتابی میلہ سری نگر میں، اگست کے آخری ہفتے میں کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ سری نگر کی زمین اردو کی آبیاری کرتی آئی ہے۔ اس لیے کتابوں کی فروخت اور کتاب تہذیب میں اضافہ کے امکانات کی قوی امیدیں ہیں۔ خطۂ جموں وکشمیر میں اردو کا ماحول بہت سازگار ہے۔ بیشتر اسکولوں میں اردو بحیثیت نصاب شامل ہے۔ اس لیے قومی اردو کونسل کے 27 ویں اردو کتاب میلے کے لیے بطور خاص سری نگر کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس میلے میں ملک کے طول وعرض سے ناشرین شامل ہوں گے۔ سری نگر کے اس سازگار ماحول میں اردو شائقین کے لیے مختلف نوع کے ثقافتی پروگراموں کا بھی اہتمام کیا جائے گا۔

میٹنگ میں قومی اردو کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، ریسرچ آفیسر انتخاب احمد، ریسرچ آفیسر شاہنواز محمد خرم اور ریسرچ اسسٹنٹ تپیندر کمار کے علاوہ دہلی کے اہم ناشرین نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 مئی 2023

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

توسیعی خطبہ

نئی دھلی: جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے سینٹر فار انڈین لینگویج میں پروفیسر طارق چھتاری کے توسیعی خطبے کی تقریب منعقد کی گئی۔ انھوں نے اپنے خطبے کا آغاز فکشن

میں مختلف ادبی نظریات سے کیا۔ ترقی پسند تحریک کے موضوع پر زور دیتے ہوئے طارق چھتاری نے کہا کہ جب 1960 کے بعد باقاعدہ طور پر جدیدیت کے رجحان میں فرد کی شخصیت پر زور دیا گیا تو جدیدیت میں بہت سے تجربات کیے گئے جن میں علامت، پلاٹ کا نہ ہونا، کہانی کا نہ ہونا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح جدیدیت میں فلیش بیک کی تکنیک میں تجریدی افسانے کا تجربہ ہوا ہے، اس کا تعلق اسلوب سے ہے۔ اسی وجہ سے جدیدیت میں تجریدیت مصوری کی تقلید سے آئی۔ نفسیاتی مسائل پر بات کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ ہم عصمت کے افسانے 'چوتھی کا جوڑا' میں بھی علامتی انداز دیکھ سکتے ہیں جب حمیدا اپنے ماضی کو دیکھتی ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ ترقی پسند تحریک میں بھی جدید عناصر موجود تھے۔ جیسے یہ جملہ 'دوسروں کی خوشی میں خود شریک ہوکر ہی اپنے غم کو بھلایا جاسکتا ہے' اسی طرح پریم چند کی کہانیوں میں بھی جدیدیت کے عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن ہم نے پریم چند کی کہانیوں سے انصاف نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ سریندر پرکاش کے تجریدیت زدہ افسانے 'تلقارمس' میں سیکڑوں مسائل ہیں۔ اس افسانے میں کوئی فل اسٹاپ نہیں ہے۔ اسی لیے اس افسانے کو ایک مکمل جملہ بھی کہا جاتا ہے۔ مابعد جدیدیت کو انھوں نے تیسری آواز کا نام دیا۔ قرۃ العین حیدر کی کہانی 'پت جھڑ کی آواز' کا تجزیہ بھی انھوں نے پیش کیا۔ مابعد جدیدیت میں آرکیٹکچر کی تقلید کی گئی ہے جس میں فنون لطیفہ کا انداز ملتا ہے۔ پروگرام کی صدارت کر رہے پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے سینٹر میں پروفیسر طارق چھتاری کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے طلبہ کے لیے کارآمد اور مفید باتیں کیں نیز پرفیسر موصوف کی ادبی خدمات کا ذکر کیا جب کہ ڈاکٹر نصیب علی نے پروفیسر طارق چھتاری کی خدمت میں تعریفی کلمات پیش کیے اور ڈاکٹر رشی کمار شرما نے شکریہ کی رسم ادا کی۔ اس موقعے پر سینٹر کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالر کے علاوہ طلبہ کی کثیر تعداد موجود تھی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 اپریل 2024

کتابوں کی اہمیت پر سمپوزیم

نئی دھلی: عالمی یوم کتاب کے موقعے پر ساہتیہ اکادمی کی جانب سے کتابوں کی اہمیت پر ایک سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت نوتیج سرنا نے کی۔ سمپوزیم میں

ادیتی مہیشوری، دھننجے سنگھ، ایرا ٹاک، میترئی پشپا، میجر اکھل پرتاپ، مولیشری، سنجے شروتریہ، شالینا چترویدی، سمیتا سہگل، سجاتا شیون، سمترا گوہا اور سورپنا دیو نے اپنی تقاریر پیش کیں۔ پروگرام کے آغاز میں ساہتیہ اکیڈمی کے سکریٹری کے سری نواس راؤ نے مہمانان کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے کہا کہ کتابیں ہماری زندگی کا حصہ ہیں اور یہ ہمارے لیے ایک نئی دنیا کا متبادل پیش کرتی ہیں۔ پبلشر ادیتی مہیشوری نے کہا کہ ہمارے ملک میں آزادئ اظہار کی وجہ سے تحریر کا تنوع سب سے زیادہ ہے۔ دھننجے سنگھ نے کہا کہ کتابیں ہماری شخصیت کو بدل دیتی ہیں اور وقت کی حدود سے بھی تجاوز کر جاتی ہیں۔ میترئی پشپا نے کہا کہ کتابیں سماج کے نام لکھے گئے خطوط ہیں جن میں حقیقی سچائی ہوتی ہے۔ میجر اکھل پرتاپ نے کہا کہ کوئی اور ٹیکنالوجی ہمیں کتابوں کو چھونے کا لطف نہیں دے سکتی، اس لیے ان کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوگی۔ کتھک ڈانسر شالینا چترویدی نے کہا کہ ہمارے لیے کتھک کا مطلب کہانی سنانا ہے۔ شاعرہ سمیتا سہگل نے کہا کہ کتابیں ہمارے ماضی کو محفوظ رکھتی ہیں۔ مترجم سجاتا شیون نے کہا کہ کتابیں ہماری زبان کو نکھارتی ہیں اور ہمارے خیالات کو بدلتی ہیں۔ کلاسیکل گلوکارہ سمترا گوہا نے کہا کہ موسیقی ادب کی توسیع ہے۔ انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کے افسر سورپنا دیو نے کہا کہ کتابیں ہمیں زندگی گزارنے کا فن سکھاتی ہیں اور ان کی مدد سے ہم بہت سی برائیوں پر قابو پاسکتے ہیں۔ آخر میں سمپوزیم کے چیئرمین، سابق سفارت کار اور مصنف نوتیج سرنا نے کہا کہ تہذیب اور اقدار لائبریری میں ہی تخلیق ہوتی ہیں، اس لیے ہمیں کتابوں کو بچانے کے لیے منظّم طریقے سے کام کرنا ہوگا۔ اکیلے ساہتیہ اکادمی یہ ذمے داری نہیں اٹھا سکتی۔ کتابوں کو محفوظ کرنے کے لیے مختلف تجاویز دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہمیں اپنے گھروں میں کتابیں لانے کو تہوار کے طور پر منانا ہوگا، لائبریریوں کی ابتر حالت کا خیال رکھنا ہوگا اور پورے ملک کے لیے لائبریری کا قانون مرتب کرنا ہوگا تا کہ لائبریریوں کو بچایا جاسکے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 اپریل 2024

خطاطی اور عربی نظم

نئی دہلی: ذاکر حسین دہلی کالج (صبح) شعبۂ عربی کے زیر اہتمام خطاطی اور عربی نظم کے مقابلہ جاتی پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر صدر شعبہ ڈاکٹر سید محمد طارق نے طلبہ سے کہا کہ خالق کائنات خود بھی خوبصورت ہے اور حسن و زیبائش کو پسند بھی کرتا ہے۔ اسی خاصے کی وجہ سے خالق کائنات نے اپنے بنائے ہوئے انسان کی فطرت میں حسن و زیبائش کی خو اور سلیقہ و شعور کا عنصر بھی ودیعت کیا ہے۔ واضح رہے کہ شعبہ عربی میں قائم طلبہ کی مشتقی انجمن 'النادی العربی' ماضی سے ہی اپنے سے منسلک و مربوط طلبہ کے مابین عربی خطاطی، عربی نظم اور عربی تقریر و تحریر کے مقابلہ جاتی پروگرام منعقد کرتا رہتا ہے۔ شعبۂ کے استاذ ڈاکٹر محمد قمرالدین کے زیر گرانی اس سلسلے کے دو پروگرام منعقد کیے گئے۔ پہلا پروگرام عربی خطاطی کے نام سے معنون تھا، جس میں عربی آنرز، عربی پروگرام اور جنرل الیکٹو میں عربی زبان کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے منتخب کرنے والے دیگر شعبوں کے 30 سے زائد طلبہ نے شرکت کی۔ دوسرا پروگرام عربی نظم کے عنوان سے منعقد کیا گیا جس میں طلبہ نے عربی قصائد اور نظموں کو یاد کر کے عربی طرز و اسلوب میں حاضرین کے سامنے پیش کیا۔ مسابقے میں شعبہ کے استاذ ڈاکٹر نسیم احمد اور ڈاکٹر عبدالملک رول پوری نے حفظ و یادداشت، لفظوں کا صحیح تلفظ، آواز کا اتار چڑھاؤ اور ذاتی خود اعتمادی جیسی صفات پر توجہات کو مرکوز کرتے ہوئے بطور حکم اپنے فرائض انجام دیے۔ سال دوم کے طالب علم حافظ محمد شارق نے پہلی جب کہ سال اول کے طالب علم محمد طالب نے دوسری پوزیشن حاصل کی۔ شعبہ کے سینئر استاذ ڈاکٹر محمد قاسم عادل اور ڈاکٹر محمد عبیداللہ نے از اول تا آخر پروگرام میں موجود رہ کر نہ صرف طلبہ کی حوصلہ افزائی کی بلکہ پروگرام کے سپروائزر اساتذہ کے حوصلوں کو بھی جلا بخشی۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 19 اپریل 2024

محفل ظرافت

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام 18 اپریل کو شام چار بجے 'محفل ظرافت' کا انعقاد ہوا۔ اس محفل کو نظم اور نثر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلے حصے کی صدارت معروف ادیب جناب نارنگ ساقی نے کی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ غالب کے فنی محاسن کو ہر زاویے

سے نمایاں کرنے کی کوشش کرتا ہے، آج کی یہ 'محفل ظرافت' اس کی ایک مثال ہے۔ ایم آر قاسمی نے اس پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ غالب کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے جس پیرایۂ اظہار کو اختیار کیا اس میں ندرت پیدا کر دی۔ ان کے مزاج کو ظرافت سے خاص نسبت تھی جو ان کی شاعری میں عام طور سے محسوس ہوتا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا بنیادی مقصد غالبیات کی ہر زاویے سے تفہیم و تعبیر ہے لہٰذا ہم نے محسوس کیا کہ ظرافت بھی ان کی شخصیت کا اہم عنصر رہا ہے اور اس زاویے سے بھی ان پر گفتگو ہونی چاہیے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس دور کے اہم مزاح نگار آج یہاں جمع ہیں۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر عبدالباری قاسمی نے 'خطوط غالب میں طنز و مزاح کے عناصر'، محترمہ خوشبو پروین نے 'غالب: شاعری میں معیاری طنز و مزاح کے بنیاد گزار' اور محمد جاوید احمد نے 'طنز و مزاح کی تخلیق میں صنائع و بدائع کا استعمال' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ دوسرے حصے میں ظریفانہ مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت جناب احمد علوی نے کی اور اسد رضا نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ نظامت کے فرائض انس فیضی نے انجام دیے۔ مشاعرے میں اسد رضا، رحمٰن مصور، احمد علوی، اقبال فردوسی، شاہد گڑ بڑ، چاند پٹنا پھٹ، ضمیر ہاشمی اور انس فیضی وغیرہ نے کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 19 اپریل 2024

امیر خسرو: یادگاری خطبہ

نئی دہلی: نیشنل امیر خسرو سوسائٹی اور غالب انسٹی ٹیوٹ

کے زیر اہتمام امیر خسرو یادگاری خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ خطبے کی صدارت معروف فارسی ادیب و دانشور پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ امیر خسرو ایک جامع کمالات شخصیت کا نام ہے۔ وہ شاعری موسیقی اور دیگر علوم میں غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے۔ ایرانی شعرا نے جس شاعر کے فنی امتیاز کو تسلیم کیا ہے وہ امیر خسرو ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ امیر خسرو نے سات بادشاہوں کا دور دیکھا اور درباری لحاظ سے بھی فعال رہے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ انھیں پانچ دیوان، دس مثنویاں اور نثر میں بھی تین کتابیں لکھنے کی مہلت کیوں کر میسر آئی جو کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے غیر معمولی ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ امیر خسرو سوسائٹی اردو کی ایک سرگرم تنظیم ہے جو ہر سال امیر خسرو یادگاری خطبے کا اہتمام کرتی ہے۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اس خطبے کے لیے کسی علمی شخصیت کی خدمات حاصل کی جائیں۔ پروفیسر احمد محفوظ کو دعوت دینے کا ایک مقصد یہ ہے کہ امیر خسرو پر گفتگو کے لیے اردو کی کلاسیکی روایت کے ساتھ فارسی سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ پروفیسر احمد محفوظ اردو فارسی شعریات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں لہٰذا ان کی گفتگو اس تعلق سے بہت بامعنی ثابت ہوگی۔ پروفیسر احمد محفوظ نے خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ جب میں خسرو کی ادبی میراث پر نظر کرتا ہوں تو میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کے کس کام کو فوقیت دوں۔ انھوں نے ایک طرف نثر میں 'اعجاز خسروی'، 'خزائن الفتوح' اور 'افضل الفوائد' جیسی بے مثال تصنیف چھوڑیں اور دوسری طرف 'نہ سپہر' جیسی لازوال مثنوی سے یہاں کی شعری روایت کو عروج بخشا۔ ہمیں آئندہ نسل کی تربیت اس انداز سے کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ عصری تقاضوں کے ساتھ اپنی علمی روایت سے بھی واقف ہو۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 24 اپریل 2024

اردو-ازبکی کہاوتوں کا تقابلی مطالعہ

نئی دہلی: ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی میں 'اردو-ازبکی کہاوتوں کا تقابلی مطالعہ' پر توسیعی لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ مہمان مقرر کی حیثیت سے محرم میرزاوا، شعبۂ اردو تاشقند اسٹیٹ یونیورسٹی، ازبکستان نے شرکت کی۔ آن لائن لیکچر میں استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر نصیب علی، استاذ ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جے این یو نے مہمان مقرر اور دیگر اساتذہ کا استقبال کیا۔

ڈاکٹر نصیب علی نے استقبالیہ کلمات میں کہا کہ اردو اور ازبکی زبان کا گہرا رشتہ ہے۔ ان دونوں زبانوں میں مشترک الفاظ اور کہاوتیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں زبانیں لسانی سطح پر بہت مماثل ہیں، یہی وجہ ہے کہ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے شعبہ کی طرف سے آن لائن لیکچر کا اہتمام کیا۔ مہمان مقرر کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر محیا عبدالرحمانوا، شعبۂ اردو تاشقند اسٹیٹ یونیورسٹی، تاشقند نے کہا کہ استانی محترمہ محرم زاؤا، ہمارے شعبے میں ایک طویل عرصے سے اردو زبان کی تعلیم و تدریس انجام دے رہی ہیں۔ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہم اس اہم خطاب میں شریک ہیں۔

مہمان مقرر محرم میرزاؤا نے اپنے خصوصی خطاب میں اردو اور ازبکی زبان کے باہمی اشتراک اور تعاون پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کی فصاحت و بلاغت، اردو کی ہمہ گیریت، اردو اور ازبک میں مماثلت، منطقی استدلال، مشترکہ کلچر، تہذیبی، ثقافتی اور سماجی سروکار قدر مشترک ہیں۔ موصوفہ نے متعدد کہاوتوں اور محاوروں کا ذکر کیا، مثلاً ''انسان اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے، سچ کڑوا ہوتا ہے، سچا دوست وہی ہے جو بھیڑ میں کام آوے، گھر کی مرغی دال برابر، ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، نیکی کر دریا میں ڈال، آج کا کام کل پر نہ چھوڑو'' وغیرہ، ان مثالوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو اور ازبکی میں کس قدر مشترک کہاوتیں اور محاورے موجود ہیں۔ نئی نسل کو اس جانب کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ دونوں ممالک کی زبانیں اور تہذیبی قدریں دنیا کے سامنے آسکیں۔ خصوصی خطاب کے بعد ڈاکٹر نصیب علی اور ڈاکٹر مخلصہ شاہ رحیم وا، صدر شعبۂ اردو، تاشقند اسٹیٹ یونیورسٹی، ازبکستان نے تاثرات کے ساتھ شعبوں کی طرف سے اساتذہ، ریسرچ اسکالرس، طلبہ اور طالبات کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر محمد رکن الدین، شعبۂ اردو، ستیہ وتی کالج دہلی یونیورسٹی نے پروگرام کی نظامت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 مئی 2024

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام آن لائن اردو، فارسی کلاسز

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کی جانب سے آن لائن اردو، فارسی کلاسز کا آغاز ہوگیا ہے۔ ان کلاسز کا مقصد اردو، فارسی کے مبادیات سے لوگوں کو واقف کرانا ہے۔ کلاسز کا افتتاح شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے

سابق صدر پروفیسر خالد محمود نے ایوان غالب میں منعقدہ تقریب میں کیا۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ زبان ہماری بنیادی ضرورت ہے، مثلاً میں پیشے سے ایک استاد رہا ہوں اگر مجھے اس زبان پر قابو نہیں ہوگا جس میں مجھے اپنی بات کہنی ہے یا دوسرے کو سمجھانی ہے تو میں اپنے پیشے کا بھی حق ادا نہیں کرسکتا۔ انسان جتنی زیادہ زبانوں کو جانتا ہے اس کی شخصیت میں اتنا ہی نکھار پیدا ہوتا ہے۔ میں غالب انسٹی ٹیوٹ کو مبارکباد پیش کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے بیسک تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے آن لائن کورسز کا انتظام کیا۔ اس اجلاس کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیاں صرف علمی مذاکروں اور سمیناروں تک محدود نہیں، بلکہ اردو، فارسی کی بنیادی تعلیم کا بھی یہاں انتظام کیا جاتا ہے۔ گزشتہ کلاسز کا تجربہ بہت اچھا رہا اور طلبہ کی طرف سے ہی یہ مطالبہ ہوا کہ اس طرح کے کورسز کو جاری رہنا چاہیے، لہٰذا ایک بار پھر کلاسز کا آغاز ہو رہا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ پچھلی بار کی طرح یہ کورس بھی کامیابی کے ساتھ مکمل ہوگا۔ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی صدر پروفیسر نجمہ رحمانی نے اس اجلاس میں بطور مہمان خصوصی شرکت کرتے ہوئے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ اردو کا ایک فعال ادارہ ہے اور یہاں کی سرگرمیوں سے ہم سب واقف ہیں، لیکن آج جس کورس کا آغاز ہو رہا ہے مجھے بے انتہا خوشی ہے کہ یہاں کے منتظمین نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ بنیادی تعلیم کے بغیر اعلیٰ تعلیم کا خواب مکمل نہیں ہوسکتا۔ اردو کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو سننے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گنگا جمنی تہذیب کو سمجھنے کے لیے اور اس کو باقی رکھنے کے لیے اردو سے واقفیت بہت ضروری ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ میں اردو، فارسی کی کلاسز کا سلسلہ نیا نہیں ہے، آخری مرتبہ جن لوگوں نے اس کورس میں حصہ لیا ان کی پیش رفت کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور حوصلہ بھی ملا۔ اردو، فارسی کے استاد طاہر الحسن نے بڑی محنت سے طلبہ کو تعلیم دی اور مشق کرائی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس بار کا سیشن بھی پہلے کی طرح کامیاب رہے گا۔ اردو فارسی کے استاد طاہر الحسن نے کہا کہ اردو ایک شیریں زبان ہے اس کے سیکھنے سے شخصیت میں کشش پیدا ہوتی ہے اور فارسی کے ساتھ سیکھنا زبان کی کئی باریکیوں کو آسان بنا دیتی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 مئی 2024

شعبۂ عربی ذاکر حسین دہلی کالج میں توسیعی خطبہ

نئی دھلی: نوع انسانی کو کرۂ ارضی میں موجود دیگر تمام مخلوقات سے ممتاز کرکے اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کرنے والی قیمتی شے اس کے اندر پائی جانے والی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور اچھے برے میں تمیز کرنے والا عقلی مادہ ہے اور یہی شے لاثانی اس کی احسن تقویم والی خلقت کا مظہر ہے۔ ان خیالات کا اظہار ذاکر حسین دہلی کالج میں شعبۂ فلسفہ کے استاذ ڈاکٹر محمد احسان نے شعبۂ عربی کے ذریعے منعقد کیے جانے والے توسیعی خطبے میں کیا۔ واضح رہے کہ شعبہ عربی اپنے طلبہ کے تعلیمی افق کو مزید وسعت دینے کے لیے سال کے دونوں تعلیمی دورانیوں میں غیر نصابی سرگرمیوں کے طور پر مختلف طرح کے علمی سمینار اور توسیعی خطبوں کا انعقاد کرتا ہے۔ پروفیسر نریندر سنگھ پرنسپل کالج کی صدارت میں منعقدہ اس پروگرام کی نظامت شعبہ کے استاذ ڈاکٹر محمد قمر الدین نے کی۔ شعبے کے استاذ ڈاکٹر محمد عبید اللہ نے مہمان محاضر کا تعارف کرایا اور مہمان محاضر نے 'عالم عرب میں غور وفکر کا رجحان اور چند مشہور مفکرین' کے عنوان سے قیمتی محاضرہ پیش کیا۔ صدر جلسہ پروفیسر نریندر سنگھ نے کہا کہ گریجویشن آئندہ تعلیمی مراحل کے لیے ایک سیڑھی ہوتی ہے، اس کے بعد اوپر کی منزلوں پر چڑھنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے، اب آپ اپنی پسندیدہ منزل پر آسانی سے ترقی کرسکتے ہیں۔ موصوف نے ساتھ ہی شعبے کے دیگر تعلیمی مسابقوں میں پوزیشن لانے والے طلبہ کو ترغیبی وتشجیعی انعامات، ٹرافیز اور سرٹیفکیٹ سے بھی نوازا۔ بعد ازاں طلبہ نے الوداعی تقریبات کا انعقاد کیا، جس کی نظامت سال دوم کی طالبہ عافیہ فرحا اور طالب علم حافظ محمد شارق نے کی، جس میں سال اول کی طالبہ زینت نے بہترین تقریر کی اور سال اول کی ہی طالبہ تسبیحہ نور نے ایک عمدہ غزل سنائی۔ اس کے بعد کالج سے رخصت ہونے والے سال سوم کے طلبہ نے باری باری اپنے تجربات اور خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کے اخیر میں شعبے کے اساتذہ نے طلبہ کو قیمتی مشوروں اور نصائح سے نوازا۔ پروگرام میں شعبے

کے استاذ ڈاکٹر نسیم احمد، ڈاکٹر عبدالملک، شعبہ اردو کے استاذ ڈاکٹر مستمر کے علاوہ شعبہ فلسفہ کے چند اور شعبہ عربی کے تمام طلبہ وطالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 مئی 2024

غالب توسیعی خطبہ

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے زیر اہتمام ایوان غالب میں غالب توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ خطبہ

پیش کرتے ہوئے معروف مورخ پروفیسر سید علی ندیم رضاوی نے کہا کہ عہد وسطیٰ نے ہمیں اتنا کچھ دیا ہے کہ اگر ہم پیچھے کی طرف دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ ہم جو کچھ ہیں وہ اسی دور کی تربیت کا فیضان ہے۔ ہماری فکر کو وسعت اصل میں اسی دور نے دی۔ مجھے افسوس ہے کہ اس عہد کی زریں روایات شاید اگلی نسل تک نہ پہنچ سکیں کیونکہ تاریخ کو بہت تیزی سے تبدیل کیا جا رہا ہے۔ توسیعی خطبے کی صدارت شعبۂ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدر پروفیسر فرحت نسرین نے کی۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ میں غالب کی بہت بڑی مداح ہوں اور آج آپ سے روبرو ہونے کا موقع غالب کی وجہ سے ہی ہاتھ آیا ہے۔ یہ سمجھنا کہ عرب سے آنے والا ہر شخص حملہ آور تھا، تاریخ کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ ہم تجارت کے ساتھ الفاظ کی بھی لین دین کر رہے تھے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ ہر سال غالب توسیعی خطبے کا انعقاد کرتا ہے، یہاں ہونے والے لکچرس میں ہماری کوشش ہوتی ہے کہ موضوعات میں کچھ نیاپن ہو اور تکرار کا احساس پیدا نہ ہو۔ آج کا موضوع اور مقرر دونوں بہت اہم ہیں اس میں غور وفکر کے بہت سے گوشے موجود ہیں۔ خطبے کی مہمان خصوصی پروفیسر اینا پالیوال نے کہا کہ عہد وسطیٰ پر اتنی بات ہوگئی تو ہمیں یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اس عہد میں خواتین کا کیا کردار تھا۔ یوروپین اسکالر نے ایک غلط فہمی کو عام کیا کہ عورتیں صرف بناؤ سنگار میں مصروف رہتی تھیں، انھیں سیاست اور سماجیات میں کوئی دخل نہیں تھا۔ لیکن تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ عورتوں کا ایک فعال کردار تھا وہ عمارات تعمیر کرانے سے لے کر شکار تک کرتی تھیں اور وہ منصب دار بھی ہوتی تھیں۔ اس خطبے میں علم وادب سے دلچسپی رکھنے والے کثیر تعداد میں موجود تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 5 مئی 2024

غالب اکیڈمی کی نثری نشست

نئی دھلی: غالب اکیڈمی نئی دہلی میں ایک نثری نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت مشہور افسانہ نگار خورشید حیات نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ماں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ بچے کی پرورش ماں کرتی ہے لیکن اس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ بڑے شاعر اور ادیبوں کی ماؤں کا نام بھی نہیں لیا جاتا۔ ہر نظم میں بھی ایک کہانی ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنا افسانہ 'خبر ہونے تک' پیش کیا اور ایک مختصر نظم سنائی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عقیل احمد نے امیر خسرو پر ایک پرچہ پڑھتے ہوئے کہا کہ امیر خسرو کی ماں ہندنژاد راوت کی بیٹی تھیں اور ان کے والد ترک تھے۔ زمانے کی روایت کے مطابق ان کو فارسی کی بہترین تعلیم دی گئی وہ فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ انھوں نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔ ہندوستان کی بارہ زبانیں انھیں آتی تھیں۔ انھوں نے دیسی زبان میں بھی شاعری کی جسے وہ ہندوی کہتے تھے۔ وہ اردو اور ہندی زبان کے جنک تھے۔ وہ گنگا جمنی تہذیب کی شناخت تھے۔ اس موقعے پر انجنا مجمدار نے 'دہلیز' امنگ سرین نے 'دل جلتا'، انجو کواترا نے 'آشا کا سنچار'، سنیتا چوہان نے 'سماج' کہانی سنائی جسے بہت پسند کیا گیا۔ پروین ویاس نے پڑھی گئی کہانیوں پر تبصرہ کیا۔ غفران اشرفی، گولڈی گیت کار، سرفراز احمد فراز، حشمت بھاردواج اور نیلم باورا نے اشعار پیش کر کے سامعین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 30 اپریل 2024

ایک شام حیرت داؤدنگری کے نام

نئی دھلی: داؤدنگر میں ایک شام حیرت داؤدنگری کے نام زیر اہتمام مولانا حالی اردو لائبریری الحاج حافظ خورشید عالم کے دولت کدے پر منائی گئی جس کی صدارت الحاج خورشید عالم نے فرمائی۔ نظامت کا فریضہ پروفیسر عرفان آصف نے انجام دیا۔ مہمان خصوصی حیرت داؤدنگری کے پوتے ماسٹر سہیل عالم ومحمد شمیم عالم اور صفدر حیات رہے۔ جناب ساحر داؤدنگری نے حیرت داؤدنگری کی شخصیت اور فن پر ایک کتاب بھی مرتب کی ہے جس کے بارے میں بطور خاص شرکا کو روشناس کرایا۔ مقالہ پیش کرنے والوں میں ماسٹر آفتاب عالم نے ان کی ادبی کارگزاریوں کا جامع تذکرہ کیا، پروفیسر عرفان آصف نے حیرت داؤدنگری کی حیات اور ادبی خدمات پیش کیں۔ جب کہ ساحر داؤدنگری نے تفصیلی معلومات اور ان سے قلبی لگاؤ کی وجوہات سے حاضرین کو واقف کرایا۔ حیرت داؤدنگری شعروادب میں کسی کے شاگرد نہیں ہوئے، بغیر استاد کے وہ موزوں شعر کہتے تھے، لوگوں کو اس بات پر حیرت بھی ہوتی تھی، غالباً یہیں سے ان کا تخلص حیرت پڑ گیا اور حیرت داؤدنگری کے نام سے اپنے علاقے و دور دراز میں پہچانے گئے۔ انھوں نے کبھی اپنی شاعری کو اپنی شہرت کا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ تمام عمر نہایت خاموشی سے اردو زبان وادب کی خدمت میں مشغول رہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 16 اپریل 2024

اتر پردیش

خورشید الاسلام یادگاری جلسہ

علی گڑھ: پروفیسر خورشید الاسلام ایک ذہین نقاد تھے۔ وہ کبھی پرانی باتیں نہیں کہتے تھے۔ ان کے یہاں ہمیشہ

نیاپن ہوتا تھا۔ اپنی تنقیدی تحریروں میں انھوں نے جو اقوال زریں قسم کے جملے لکھے ہیں، اس کے لیے بہت زیادہ علم اور ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے، یہ معمولی ذہن کا کام نہیں ہے۔'' ان خیالات کا اظہار معروف فکشن رائٹر اور سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر طارق چھتاری نے ممتاز نقاد، شاعر، دانشور اور سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر خورشید الاسلام یادگاری جلسہ میں کیا۔ بزم شہریار کے زیر اہتمام منعقدہ پروگرام میں انھوں نے کہا کہ خورشید الاسلام کی شاعری بالخصوص نظمیں بہت مختلف ہیں، ان کے یہاں تکرار نہیں ہے، آسان زبان میں جو تخلیقیت ہے، اسی میں ان کی انفرادیت مضمر ہے۔ پروفیسر چھتاری نے کہا کہ بڑے بڑے سمیناروں کے مقابلہ میں ان جلسوں کی زیادہ اہمیت ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 20 اپریل 2024

معاشرے کی تعمیر میں خاتون قلمکاروں کا حصہ

علی گڑھ: عورتوں کے یکساں حقوق، ان کے ساتھ انصاف، خلوص و ہم آہنگی جیسے اہم نکات پر بھرپور گفتگو

ہونی چاہیے۔ سچائی تو یہ ہے کہ خواتین کو آگے بڑھانے اور انھیں کامیابی و کامرانی تک پہنچانے میں مردوں کا ساتھ ہوتا ہے۔ خواتین کے حقوق، ان کے مسائل کو کبھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، انھوں نے ہر میدان میں اپنا لوہا منوایا ہے اور بطور خاص اردو ادب کے فروغ اور اس کی بقا میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) میں اردو اساتذہ کی ماہرانہ صلاحیت کے فروغ کے مرکز اردو اکادمی میں یک روزہ سمینار بعنوان 'معاشرے کی تعمیر میں خاتون قلمکاروں کا حصہ' میں مہمان خصوصی پروفیسر وبھا شرما، شعبۂ انگریزی، اے ایم یو نے کیا۔ پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی، ڈائرکٹر، اردو اکیڈمی و صدر شعبۂ ادو نے پروگرام کی صدارت کی۔ انھوں نے شرکا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ قدرت نے کسی کو کم تر اور بدتر نہیں بنایا ہے۔ چاند و سورج کی ضیاپاشی سب کے لیے یکساں ہے، اس لیے مرد و عورت سب برابر ہیں، عورت میں برداشت کا مادہ مردوں کے بالمقابل زیادہ ہوتا ہے، عورتوں کو اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانی چاہیے اور یہ ان کا بنیادی حق ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 25 اپریل 2024

دورِ حاضر میں سرسید کی معنویت

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے زیر اہتمام 'دورحاضر میں سرسید کی معنویت' کے عنوان سے

ایک خصوصی خطبہ کا انعقاد کیا گیا۔ شعبہ ترسیل عامہ کے سینئر استاد پروفیسر شافع قدوائی، ڈائرکٹر، سرسید اکیڈمی نے خطبہ پیش کرتے ہوئے دورحاضر میں سرسید کی معنویت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ سرسید کی تعلیمات و افکار آج کے دور میں بھی اتنی ہی اہمیت کے حامل ہیں جتنے سرسید کے دور میں تھے۔ انھوں نے کہا کہ سرسید کی فکر یہ تھی کہ کسی بھی بات کا جواب صرف احتجاج سے ہی نہیں دیا جانا چاہیے بلکہ دلیل وشواہد سے دیا جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ولیم میور نے جب اپنی کتاب میں پیغمبر اسلام کی توہین کی تو سرسید نے اس کا جواب دلیلوں کے ساتھ خطبات احمدیہ لکھ کر دیا۔ پروفیسر قدوائی نے کہا کہ سرسید کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ خواتین کی تعلیم کے خلاف تھے جب کہ ایسا بالکل نہیں ہے۔ اس کے پیچھے جو وجہ نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت ہندوستانی معاشرہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ انھوں نے کہا کہ جب سرسید دوسرے ممالک جاتے اور وہاں کی خواتین کو تعلیم یافتہ دیکھتے تو خوشی کا اظہار کرتے۔ انھوں نے کہا کہ آج کے دور میں سرسید کے نظریات کو اگر ہم اپنالیں تو کافی حد تک کامیاب ہوجائیں گے، اور یہ وقت کی ضرورت بھی ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 2 مئی 2024

اردو ادب میں خواتین کے مسائل

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تعلیمی میقات کے آخری دنوں میں دو روزہ علمی و ادبی تقریبات کا انعقاد عمل میں آیا۔ 29 اپریل کو خواتین کے تفویض اختیارات کے حوالے سے 'اردو ادب میں خواتین کے مسائل' کے عنوان سے ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا اور 30 اپریل کو بیت بازی کا پروگرام ہوا جس کے فاتحین میں بطور انعام کتابیں تقسیم کی گئیں۔ پروگرام کی صدارت شعبہ کے چیئرمین پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر سراج الدین اجملی نے شرکت کی۔ مذاکرے میں اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر فریدی نے اردو ادب میں پیش کیے گئے خواتین کے مسائل کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ہمارے ادیبوں نے ہمیشہ خواتین کے حقوق اور مسائل کو موضوع فکر بنایا ہے۔ اس کا آغاز اردو کے پہلے باقاعدہ ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد سے ہوتا ہے جنھوں نے اپنے ناولوں میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت اور حقوق و فرائض کی بات کی۔ پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی نے مزید کہا کہ اردو میں مردوں کے علاوہ خاتون قلم کاروں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے جنھوں نے خواتین کے تفویض اختیارات کے حوالے سے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ سمپوزیم میں طلبا و طالبات نے جوش و خروش سے حصہ لیا اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 3 مئی 2024

پنجاب

اردو- فارسی کیمپ

چنڈی گڑھ: اردو اور فارسی زبان کے درست استعمال سے نہ صرف ہماری شخصیت میں نکھار پیدا ہوتا ہے بلکہ ان زبانوں کے تلفظ سے دوسری زبانیں بھی نکھر جاتی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر علی عباس نے کہا کہ دنیا کی تقریباً سبھی زبانوں کی آوازیں اردو میں مل جائیں گی اور ان کی ادائیگی جس خوبصورتی سے اس زبان کا جاننے والا کرسکتا ہے، شاید کوئی دوسرا شخص نہ کرسکے جو اس زبان سے ناواقف ہے۔ ہندی، انگریزی، روسی، عربی، فارسی، جرمن، فرنچ اور ترکی جیسی دنیا کی بہت سی زبانوں کے الفاظ اردو بولنے والا آسانی بول سکتا ہے۔ موجودہ دور میں اردو اور فارسی کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے صدر شعبہ نے کہا کہ ان زبانوں میں روزگار کے بہت سے مواقع پائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر ترجمہ نگاری آج کل ایک اہم اور بڑھتا ہوا روزگار بنتا جارہا ہے۔ انھوں نے این ای پی کی سفارشات میں ہندوستانی زبانوں کی ترقی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ درس وتدریس کے کورس میں مختلف موضوعات کی کتابوں کے ترجمے ماڈرن ہندوستانی زبانوں میں کیے جارہے ہیں جن میں سے ایک اردو بھی ہے۔ واضح ہو کہ یہ کیمپ اردو اور فارسی زبان کی ترویج وترقی کی غرض سے لگایا گیا تھا جس کا بنیادی مقصد یونیورسٹی کے دیگر شعبوں کے طلبہ کو ان زبانوں کی اہمیت و افادیت سے روشناس کرانا تھا۔ شعبہ اردو سے ڈاکٹر زرین فاطمہ نے اردو شعروادب کی روشن تاریخ اور ہندوستان کی آزادی میں اردو زبان کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے اسٹوڈنٹ سینٹر پر موجود طلبا کو اردو فارسی زبان سیکھنے کی طرف خصوصی توجہ دلائی۔ شعبہ فارسی کے استاد ڈاکٹر ذوالفقار علی نے فارسی زبان اور پنجاب کے رشتے پر گفتگو کرتے ہوئے طلبا کو تشویق دلائی کہ اردو اور فارسی زبان کسی زمانے میں پنجاب کی سرزمین پر عام بول چال کی زبان تھی اور آج بھی فارسی کے سیکڑوں الفاظ پنجابی زبان کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ شعبے کے سینئر طالب علم سدیپ سنگھ نے اردو اور فارسی زبان سے اپنی والہانہ محبت

کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو اور فارسی نے ہمیں پنجاب اور پنجابیت سے مزید قریب کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے فارسی اور اردو اشعار سنا کر یہ بھی بتایا کہ اچھی شاعری کس طرح زندگی کے بہت سے مسائل کا حل تلاش کرنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔ 'ہم اردو فارسی کیوں سیکھیں' کے عنوان سے لگائے گئے ہیں اس کیمپ میں شعبہ اردو کے ریسرچ اسکالر خلیق اعوان اور رضوانہ کوثر کے علاوہ گلفام، خادم حسین، پروین کمار، پردیپ کمار متل اور طاہر نے اردو اور فارسی غزلیں سنا کر سامعین کی بھرپور توجہ حاصل کی۔ اس کیمپ میں شعبے کے سبھی طلبا و طالبات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 2 مئی 2024

اعزاز و اکرام

ارشد ندیم

نگینہ: اقبال میموریل ایجوکیشن سوسائٹی نگینہ کی جانب سے معروف شاعر، ادیب، صحافی، اور کئی کتابوں کے

مصنف و مولف ارشد ندیم کو ان کی ادبی وصحافتی خدمات کے لیے ایوارڈ پیش کیا گیا۔ موصولہ خبر کے مطابق ماہر تعلیم، ادیب اور سماجی کارکن مرحوم پرنسپل عشرت جاوید کے نام سے منسوب 'عشرت جاوید قومی اعزاز' اس سال صحافی ارشد ندیم کو دیا گیا۔ سوسائٹی کے صدر حسن جاوید نے اخبار کو جاری اپنے بیان میں کہا کہ اقبال میموریل سوسائٹی ہر سال ضلع بجنور کے ایسے لوگوں کو عشرت جاوید قومی اعزاز سے سرفراز کرتی ہے جنھوں نے ملکی یا بین الاقوامی سطح پر ضلع بجنور کا نام روشن کیا ہو۔ انھوں نے کہا کہ ارشد ندیم نے اردو زبان وادب، صحافت، جدید شاعری، کو دنیا بھر میں فروغ دیا ہے۔ سوسائٹی کے سکریٹری ایڈوکیٹ طفیل احمد علیگ نے کہا کہ ارشد ندیم پچاس برس سے بڑی خاموشی کے ساتھ اردو کی خدمات میں منہمک ہیں اور ان کا اعزاز کرنا ہمارا اہم فریضہ ہے۔ واضح رہے کہ ایوارڈ میں توصیفی سند، مومنٹو اور شال کے علاوہ نقد رقم بھی شامل ہوتی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 اپریل 2024

اجرا

'نئی نظم نیا سفر'

نئی دھلی: پروفیسر کوثر مظہری کا انتخاب 'نئی نظم نیا سفر' ایک وژنری نقاد کی تحقیقی و تنقیدی دستاویز ہے۔ نظم کے حوالے سے یہ اب تک کی سب سے اہم کتاب ہے۔ نظمیہ شاعری پر ہمارے زمانے میں کوثر مظہری کی نظر سب سے گہری اور بسیط ہے۔ ان خیالات کا اظہار عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی سے شائع شدہ پروفیسر کوثر مظہری کی کتاب 'نئی نظم نیا سفر' کی تقریبِ اجرا میں صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر عتیق اللہ نے غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی میں کیا۔ یہ کتاب دراصل 1960 سے لے کر اب تک کی نظموں کا ایک انتخاب ہے جس میں 155 شعرا کی 1182 نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ اس کتاب کے مولف کوثر مظہری نے نظمیہ شاعری پر ایک مبسوط مقدمہ بھی رقم کیا ہے۔ پروفیسر شہپر رسول نے بحیثیت مہمان خصوصی اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ سنجیدگی، یکسوئی، جنون اور عرق ریزی کوثر مظہری کے نمایاں اوصاف ہیں۔ ان کا یہ کارنامہ بلا مبالغہ دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ نظم پر آئندہ کوئی بھی تحقیقی وتنقیدی کام اس کتاب کے حوالے کے بغیر ناقص ہوگا۔ مہمان اعزازی پروفیسر انور پاشا نے کہا کہ کوثر مظہری نے اس کتاب میں نظمیہ شاعری کی آدھی صدی کے سفر کو محفوظ کر دیا ہے۔ ان نظموں کا انتخاب محض ایک انتخاب نہیں بلکہ دراصل تاریخ، تہذیب، جمالیات اور عصری آشوب کی ایک ارتقائی داستان بھی ہے۔ مہمان ذی وقار پروفیسر نجمہ رحمانی نے اس تالیف کو بامعنی تنقیدی وتحقیقی دقت رسی کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ انتخاب اپنی تمام تر ترجیحات اور تعصّبات کے باوصف اردو نظم کے گزشتہ ساٹھ سالہ سفر کے تدریجی مراحل کو سمجھنے میں نہایت معاون ہے۔ پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ میں ذاتی طور پر اس کتاب کی ترتیب وتالیف میں کوثر مظہری صاحب کی دس سال کی تگ ودو، محنت ومشقت اور ان کی شدید جنوں پروری کا گواہ ہوں۔ وہ جب کسی کام میں لگتے ہیں تو کس درجہ انہماک، استغراق اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو مجتمع کر کے جھونک دینے کی کیفیت ہوتی ہے میں نے کوثر مظہری کی اس دیوانگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ممتاز فکشن نگار پروفیسر خالد جاوید نے ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے کہا کہ کوثر مظہری کی یہ کتاب ترتیب وتدوین، انتخاب اور تحقیق کے اعلیٰ اور جدید مغربی معیارات کی کسوٹی پر کھری

اترتی ہے۔ انھوں نے نظم نگاروں کے مختصر سوانحی خاکے میں بطور خاص والد کے نام پر جس شدت کے ساتھ زور دیا ہے وہ ان کی تحقیقی اخلاقیات اور تخلیقی شخصیت کی تشکیل میں سوانحی عوامل کے عمل دخل کا اعلامیہ ہے۔ صاحب کتاب پروفیسر کوثر مظہری نے بتایا کہ اس کتاب کا خاکہ تقریباً گزشتہ پندرہ برسوں سے میرے ذہن میں پنپ رہا تھا۔ جدید نظم سے میری فطری دلچسپی رہی ہے۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ مواد کے حصول اور بالخصوص شعرا کے اصل نام اور والد کے نام کی تحقیق میں مجھے حد درجہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اس کے لیے میں نے پانچ سو سے زائد مجموعوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ بزرگ فکشن نگار عشرت ظہیر نے کہا کہ انتخاب اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ اس کا مقدمہ اور شعرا کی فہرست اہل علم میں بحث ونظر کے کئی دریچے وا کرتی ہے اور یقیناً اس پر مثبت اور منفی دونوں پہلو سے گفتگو ہوگی جو کہ اس کتاب کی اہمیت کی بھی دلیل ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر معید الرحمٰن نے نظمیہ شاعری کے انتخابات کی روایت کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ مرتب نے اس کتاب میں گزشتہ خامیوں کے ازالے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے کے انتخابات علاقہ، دور اور تحریکات ورجحانات کے اسیر ہو کر رہ گئے۔ اس موقع پر ڈاکٹر خان محمد رضوان نے بھی صاحبِ کتاب کو مبارکباد دیتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تقریب کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر خالد مبشر نے انجام دیے۔ جلسے کا اختتام عرشیہ پبلی کیشنز کی جانب سے ڈاکٹر جاوید حسن کے اظہار تشکر پر ہوا۔

بحوالہ، ادبی میراث ڈاٹ کام، 29 اپریل 2024

اردو ادب

نئی دھلی: انجمن ترقی اردو (ہند) کے مرکزی دفترِ اردو گھر میں اردو ادب کی اہم ترین شخصیات کے ہاتھوں انجمن کے سہ ماہی مجلّے 'اردو ادب' کے اردو املا پر خصوصی شمارے کا اجرا کیا گیا۔ رسم اجرا تقریب میں سبھی نے مشترک طور پر کہا کہ اردو املا کی معیار بندی کا مطلب یہ ہے کہ اردو کے علما الفاظ کی جن شکلوں پر بھی زبان وقواعد نیز دیگر زبانوں کے اردو زبان پر اثرات کو نظر میں رکھتے ہوئے متفق ہوں، ان الفاظ کی ایک فہرست مرتب کر لی جائے تاکہ سب لوگ اردو الفاظ کو اسی یعنی ایک ہی طریقے سے لکھیں۔ ایک لفظ کی دو شکلیں نہیں ہونی چاہئیں جو اردو املا میں عام بات ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں بھی ایک لفظ کو بغیر کسی وجہ کے دو طرح سے نہیں لکھا جاتا۔ یہ 'اردو ادب کی پابندی سے اشاعت کا 103 واں سال ہے اور یہ غالباً اردو کا واحد پرچہ ہے جو اتنے عرصے بعد بھی پابندی سے نکل رہا ہے۔ تقریب کی صدارت انجمن کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ ان کے علاوہ پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر شمس بدایونی اور پروفیسر سراج اجملی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کہا کہ اردو املا کا مسئلہ شروع ہی سے افراط وتفریط کا شکار رہا ہے۔ اس کی اپنی وجہیں ہیں۔ ادارے کے طور پر اردو املا کی معیار بندی کی پہلی کوشش انجمن ترقی اردو (ہند) نے پروفیسر عبدالستار صدیقی صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی کی قیادت میں ایک مشاورتی کمیٹی بنا کر کی تھی جس کی رپورٹ 1944 میں 'اردو ادب' میں ہی شائع ہوئی تھی۔ اسے دوبارہ املا نمبر میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کام کو رشید حسن خاں نے آگے بڑھایا اور اس موضوع پر پہلی اور نہایت مبسوط کتاب 'اردو املا' کے عنوان سے لکھی جو ترقی اردو بورڈ سے مئی 1974 میں شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو رسم خط کی تبدیلی کے لیے خصوصاً ناگری لپی کی طرف سے اس دلیل کے ساتھ بہت دباؤ ہے کہ اردو رسم خط غیر سائنٹفک ہے۔ اس لیے اردو والوں کو اردو املا کی معیار بندی کی کوششیں ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ کرنی ہوں گی۔ پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ماہرین زبان رشید حسن خاں، عبدالستار صدیقی اور مولوی عبدالحق صاحبان نے املا کے ضمن میں جو کوششیں ماضی میں کی ہیں، انجمن ترقی اردو (ہند) ان میں سے اکثر پر کاربند ہے اور اصلاحِ املا کے ضمن میں اہل علم سے درخواست ہے کہ کچھ معاملوں میں ان بزرگوں کے تتبع املا کے بعد بقیہ مسائل پر غور وخوض کا مسئلہ شروع کریں۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ انجمن اردو املا میں کسی بے بنیاد انقلابی تبدیلی کی خواہاں نہیں ہے اور بنیادی طور پر ان ہی سفارشات کی حمایت بھی کرتی ہے جو 1944 میں انجمن کی اردو املا کمیٹی نے کی تھیں۔ انجمن نے اس شمارے میں جو سفارشات پیش کی ہیں وہ بنیادی طور پر 1944 ہی کی سفارشات ہیں جنھیں از سرِ نو ترتیب دیا گیا ہے۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر صدف فاطمہ نے کی۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں ادب سے تعلق رکھنے والی شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 اپریل 2024

زندان

نئی دھلی: شعری مجموعہ 'زندان' شعری ادب کے فروغ کے لیے ایک اچھی کوشش ہے۔ گوکہ پروین شغف کا یہ پہلا شعری مجموعہ ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ مستقبل قریب میں ان کی شاعری نئے اسلوب اور نئے مضامین کے ساتھ

سامنے آئے گی۔ ان خیالات کا اظہار سالیٹائر لٹریچر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام تسمیہ آڈیٹوریم جامعہ نگر میں منعقدہ معروف شاعرہ پروین شغف کے پہلے شعری مجموعہ 'زندان' کی تقریب رونمائی میں مقررین نے کیا۔ تقریب کے مہمان خصوصی پروفیسر شہپر رسول نے شعری مجموعہ پر گراں قدر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پروین شغف کی یہ اچھی کوشش ہے اور جو خامیاں رہ گئی ہیں انھیں دور کرلیا جائے گا۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے مہمان ذی وقار پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ پروین شغف کی کوشش کو سراہا جانا چاہیے۔ مجموعے میں شامل ان کے کئی اشعار ہمیں چونکاتے ہیں۔ مستقبل قریب میں ہمیں اور اچھے اشعار پڑھنے اور سننے کو ملیں گے۔ اس موقعے پر حقانی القاسمی اور ڈاکٹر خالد مبشر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ رسم اجرا تقریب کے صدر ڈاکٹر سید فاروق نے پروین شغف کو ان کے پہلے شعری مجموعے کی رونمائی پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ امید کی جانی چاہیے کہ ان کی شاعری میں مزید نکھار آئے گا۔ آخر میں پروین شغف نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 اپریل 2024

شاہکار غزل

لکھنؤ: دبستان اہل قلم لکھنؤ کے تحت محشر گونڈوی کی 611 اشعار پر مشتمل شاہکار غزل کی رسم رونمائی ومشاعرہ کا انعقاد یوپی پریس کلب حضرت گنج لکھنؤ میں ہوا۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی کی صدارت میں ہونے والے اس پروگرام کی نظامت کے فرائض عاصم کاکوروی نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر اسرارالحق قریشی و ڈاکٹر ثروت تقی نے شرکت کی۔ صدر تقریب ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ محشر کی شاعری میں حق گوئی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ایسا بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے کہ کسی شاعر کا ظاہر و باطن ایک ہو۔ ڈاکٹر ہارون رشید نے 'محشر گونڈوی کی شاہکار غزل کا اجمالی جائزہ' عنوان سے اپنا شاندار مقالہ پیش کیا جس کو شعرا و سامعین نے خوب سراہا۔ ہرشت مشرا نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ محشر گونڈوی نے 611 اشعار کی غزل میں زبان و بیان کا خاص خیال رکھا ہے۔ یہ بڑی بات ہے۔ ڈاکٹر اسرارالحق قریشی نے اس پروقار ادبی تقریب کے لیے محشر گونڈوی اور معید رہبر لکھنوی کو مبارکباد دی اور دبستانِ اہل قلم لکھنؤ کی خدمات کو سراہا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 19 اپریل 2024

صوفی بستوی

لکھنؤ: بزم لاریب کے زیر اہتمام مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن ہال میں صوفی بستوی نمبر کی رسم رونمائی وشعری نشست کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت معروف افسانہ نگار و سائنٹسٹ ڈاکٹر مرزا عمیر بیگ (دبئی) نے کی جب کہ نظامت کے فرائض کہنہ مشق شاعر وادیب شکیل گیاوی نے کیا۔ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے ملک زادہ جاوید، منظور پروانہ اور سید احمد فیصل رومی نے شرکت کی۔ صوفی بستوی پر مقالہ رحمت لکھنوی اور ڈاکٹر ہارون رشید نے پیش کیا۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے صدر محفل ڈاکٹر مرزا عمیر بیگ مقیم حال دبئی نے کہا کہ اردو کا رسالہ نکالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ مجھے اس بات کی نہایت خوشی ہے کہ اردو کے محسن رشید قریشی نے اس رسالے کو جس بلندی پر پہنچایا تھا اسے برقرار رکھنے میں ان کے ہونہار بیٹے واصف رشید جی جان سے لگے ہوئے ہیں۔ عصر حاضر میں اردو رسالوں کے ساتھ قارئین کی ستم ظریفی سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ شہر نگاراں لکھنؤ سے

شائع ہونے والا یہ ادبی رسالہ ہر چند کہ اب اردو والوں کے لیے محتاج تعارف نہیں ہے مگر اسے ابھی ان کی خصوصی توجہ کی بہت ضرورت ہے۔ مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین کامل ہے کہ آنے والے وقتوں میں یہ رسالہ اپنا دائرہ کار اور بھی وسیع کرے گا اور اہل علم و ادب اس سے مزید مستفید ہوں گے۔ معروف شاعر و ادیب ملک زادہ جاوید نے کہا میں ماہنامہ لاریب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ یہ گزشتہ 36 برسوں سے مسلسل شائع ہوکر ادبی خدمات انجام دے رہا ہے۔ انھوں نے لاریب کے صوفی بستوی نمبر کو سراہتے ہوئے کہا کہ میرے دوست رشید ریشی نے جس خوش اسلوبی کے ساتھ اس رسالے کو علمی و ادبی افراد تک پہنچا کر وقار بخشا ہے اسے واصف رشید پوری طرح محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ منظور پروانہ نے کہا کہ صوفی بستوی ایک اچھے شاعر و افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ ان کے افسانے وقتاً فوقتاً ماہنامہ لاریب میں شائع ہوتے تھے۔ رحمت لکھنوی نے کہا کہ صوفی بستوی کا شمار اردو کے روشن خیال قلمکاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی بحیثیت افسانہ نگار اردو ادب میں تعمیری افکار و نظریات کے حوالے سے خاص پہچان تھی۔ صوفی بستوی کی اعلیٰ ظرفی منکسر المزاجی اور شرافت نفسی ہر کسی کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی۔ آج ہمارا معاشرہ ان خوبیوں اور کمالات سے کوسوں دور ہوتا جا رہا ہے جس کی بنا پر ہمیں طرح طرح کے مسائل اور دشواریوں کا سامنا ہے۔ ڈاکٹر ہارون رشید نے کہا کہ صوفی بستوی ایک اچھے افسانہ نگار بھی تھے اور ایک خوش فکر شاعر بھی۔ میری ان سے ملاقات بحیثیت افسانہ نگار رہوئی تھی جب ان کا افسانوی مجموعہ 'خوابوں کے دریچے' منظر عام پر آیا تھا۔ انھوں نے خاص شمارے کے لیے واصف رشید کو مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'صحافت' 16 اپریل 2024

گولڈن انگلش

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سی آئی ٹی ہال میں شعبہ عربی کے زیر اہتمام حبیب ریاض سنابلی کی کتاب 'گولڈن انگلش' (انٹرمیڈیٹ لیول) کی تقریب اجرا منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ عربی کے اساتذہ اور پروفیسران نیز مختلف شعبے کے طلبا و طالبات اور دیگر اہم شخصیات نے شرکت کی۔ تقریب کی کوآرڈی نیٹر صائمہ نذیر نے صدر مجلس، مہمان خصوصی اور دیگر مہمانان کا پرتپاک استقبال کیا۔ محمود عالم، عربی گریجویشن، سال آخر نے کتاب 'گولڈن انگلش' کا جامع تعارف پیش کیا نیز اس کتاب کو مرتب کرنے کے مقاصد، ضرورت اور اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ موصوف نے کتاب کے اہم فوائد اور خصوصیات کی جانب بھی اشارہ کیا، جن میں جامع سبق، سادہ اور آسان زبان، انتہائی موثر انداز اور تربیتی تکنیک شامل ہیں۔ مجلس میں موجود مہمان اور شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ کے ہاتھوں کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔ پروفیسر ایوب احمد ندوی نے کہا کہ سچ میں یہ کتاب بالکل ویسی ہی ہے جیسا میں نے اس کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے۔ شیخ محمد رحمانی سنابلی نے حبیب ریاض سنابلی کو اس اہم اور مفید کاوش پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ والد محترم علامہ عبدالحمید رحمانی نے جو درخت برسوں پہلے لگایا تھا اس کے ثمرات آج بھی مسلسل دیکھنے کو مل رہے ہیں اور ان شاء اللہ ہمیشہ ملتے رہیں گے۔ اپنے خطاب میں ماسٹر محمد ثروت نے حبیب ریاض کی کاوشوں کو خوب سراہا اور اس بات کی جانب اشارہ کیا کہ ہمیں کتابوں کو محض کمپیوٹر میں رکھنے کے بجائے ہارڈ کاپی (اوراق) میں محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ جامعہ اسلامیہ سنابل کے عمید شیخ ارقم رئیس سنابلی مدنی نے اپنے خطاب کے دوران اس امید کا اظہار کیا کہ یہ کتاب انگریزی زبان کی تعلیم میں معاون ثابت ہوگی۔ اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر نسیم اختر نے کتاب کے مصنف حبیب ریاض سنابلی کو مبارکباد پیش کی نیز جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ عربی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی اس کامیاب تقریب پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ طلبہ کو اپنے کورس کی کتابوں کو پوری دلجمعی کے ساتھ پڑھنا چاہیے اور ان کو جو کچھ بھی کام دیا جائے اس کو وقت پر کرنا چاہیے۔ اخیر میں نادی الطلبہ، شعبہ عربی کے نائب صدر ناصر انور نے مہمانان گرامی اور دیگر حاضرین کی خدمت میں کلمہ تشکر پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت کا فریضہ محترمہ صائمہ نذیر نے بحسن وخوبی انجام کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 اپریل 2024

میری کاوشیں

نئی دھلی: معروف شاعر اور نثر نگار ڈاکٹر ماجد دیوبندی کی نثر کی تیسری کتاب 'میری کاوشیں' کی رسم اجرا کی تقریب میں سابق مرکزی وزیر خارجہ اور معروف وکیل سلمان خورشید نے کہا کہ اپنے خودداری اور حوصلوں کی تحریروں سے ماجد دیوبندی نے عوام کو چونکایا ہے اور آج وہ نہ صرف شاعری بلکہ اپنی صحافت، کالم نگاری اور نثر لکھنے میں ماہر نظر آتے ہیں جس کی مثال ان کی تازہ تصنیف ہے 'میری کاوشیں'۔ م افضل نے ماجد دیوبندی کی شاعری، صحافت اور نثر پر گفتگو کی اور انھیں خراج تحسین پیش کیا کہ ان کی یہ دسویں اور نثر کی تیسری کتاب شائع ہوکر منظر عام پر آئی ہے۔ ماجد جہاں بھی رہے اپنی خودداری اور ایمانداری کی پہچان کے ساتھ اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہوئے۔ سابق صدر جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام کے پریس سکریٹری ایس ایم خان نے کہا کہ نئی نسل کے لیے ماجد دیوبندی ایک باوقار شخصیت کا نام ہے۔ ڈاکٹر سید فاروق نے ڈاکٹر ماجد دیوبندی کو ان کی نئی کتاب پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کا اور ماجد صاحب کا تعلق پچھلے 30 سالوں سے ہے اور وہ انھیں اپنا عزیز ترین سمجھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میزان کے لیے پہلے دن سے وہ ان کے شانہ بشانہ رہے ہیں۔ ماجد دیوبندی کا ایک شعر پڑھ کر انھوں نے کہا کہ حوصلوں سے انسان بڑا بنتا ہے اور ماجد صاحب نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور آج وہ ملک کے اہم ترین چند ایک شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اطہر فاروقی نے نہایت شائستہ اردو میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اپنے بے پناہ جدوجہد اور محنت سے ماجد صاحب نے اپنا اہم ترین مقام بنایا ہے جو معمولی بات نہیں ہے۔ کتاب کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ نہایت اہم شخصیات پر مضامین اس میں موجود ہیں جو نئی نسل اور اردو داں طبقے کے لیے یقیناً مفید ثابت ہوں گے۔ ڈاکٹر سید احمد خان نے مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھیں یہ فخر حاصل کہ وہ ماجد صاحب کو 'حفیظ میرٹھی' ایوارڈ سے نواز چکے ہیں۔ بعد ازاں ایک مشاعرہ بھی

منعقد کیا گیا جس کی صدارت طالب رامپوری نے کیا کہ جب کہ نظامت کے فرائض معروف ناظم معین شاداب نے انجام دیے۔

روز نامہ 'صحافت' دہلی، 4 مئی 2024

پیامِ حاضر

ارریہ: مدرسہ اسلامیہ یتیم خانہ کے کانفرنس ہال میں

منعقد رسم اجرا تقریب میں مولانا شاہد عادل القاسمی پرنسپل مدرسہ اسلامیہ یتیم خانہ نے کہا کہ میں شعری مجموعہ پیام حاضر کے نوجوان اور متعلم شاعر ابوامامہ شاہی سے کہنا چاہوں گا کہ آپ خوش فہمی کا شکار نہ ہوں بلکہ مزید محنتیں کریں اور نثر پر بھی اپنا قلم اٹھائیں۔ مفتی مدثر قاسمی نے کہا کہ عزیز آپ کو تعریف سے پھولے نہیں سمانا ہے اور تنقید سے گھبرانا نہیں ہے جب کہ مولانا منصور ندوی نے صاحب پیام حاضر کو ترغیب دیتے ہوئے کہا کہ۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اس موقعے پر الحاج ماسٹر دین رضا اختر نے کہا آپ الگ الگ ڈگر کے ساتھ آگے بڑھیں، انشاء اللہ کامیابیاں ملتی رہیں گی جب کہ رہبان علی راکیش نے کہا شعروادب تو شاعر کے خمیر میں شامل ہے، اقبال کی زمین ہوسکتی ہے اقبال کا موضوع ہوسکتا ہے مگر طرز بیاں الگ ہونا چاہیے اس لیے منفرد اسلوب سے امتیازی حیثیت قائم کریں۔ اپنے کلیدی خطاب میں ارشد ہمراز نے کہا کہ میں نے ابوامامہ کی شاعری کو جستہ جستہ پڑھا ہے اور مجھے بھی تعجب ہوتا ہے اور رشک کا آتا ہے۔ میں شکریہ ادا کرتا ہوں سوسیولٹریری کے تمام اراکین کا کہ انھوں نے ایک ابھرتے ہوئے نوجوان کی حوصلہ افزائی کا موقع عنایت فرمایا۔ صدارتی کلمات کے تحت ارریہ کے اور سہ ماہی رسالہ ابجد کے چیف ایڈیٹر رضی احمد تنہا نے کہا کہ مولانا شاہد عادل قاسمی پرنسپل مدرسہ اسلامیہ یتیم خانہ کی رفاقت سے یہ مدرسہ ہم یتیمان ادب کی پناہ گاہ ہوگئی ہے، جہاں ادب پروان چڑھ رہا ہے اور یہ تمام امور مولانا شاہد عادل قاسمی کی ہمت کے سبب انجام پذیر ہورہے ہیں۔ اس رسم اجرا تقریب کی حسن نظامت کی ذمے داری کو ادب نواز اور سخن فہم عبدالغنی لبیب نے انجام دیا اور اپنی حسن نظامت سے خوب خوب داد تحسین حاصل کیں۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' ارریہ

وفیات

پروفیسر محمد علی اثر

حیدرآباد: شہر حیدرآباد کی ممتاز ومعروف قومی علمی شخصیت اور اردو کے نامور محقق وشاعر 50 سے زائد کتابوں کے مصنف ماہر دکنیات ڈاکٹر الحاج محمد علی اثر سابق پروفیسر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ ولد حکیم شیخ محبوب صاحب مرحوم کا 24 اپریل 2024 کی شب دیر گئے 74 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔

نماز جنازہ جمعرات 25 اپریل کو بعد نمازِ ظہر جامع مسجد چوک میں ادا کی گئی۔ تدفین قبرستان مسجد الماس چادر گھاٹ میں عمل میں آئی، پسماندگان میں اہلیہ ڈاکٹر راحت سلطانہ ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ بورڈ آف ٹکنیکل ایجوکیشن کے علاوہ 2 فرزندان محمد عادل فراز انجینئر، محمد سہیل افروز انجینئر جیلیل (سعودی عرب) اور 3 دختران بشمول محترمہ کہکشاں ناز معلّمہ گورنمنٹ گرلز سٹی پرائمری اسکول چھتہ بازار واقع نورخاں بازار (چار مینار منڈل)، شامل ہیں۔ پروفیسر محمد علی اثر 22 دسمبر 1949 میں پیدا ہوئے، 1974 میں جامعہ عثمانیہ سے ایم اے کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا اور 1980 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1987 تا 1988 شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی میں ریڈر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، بعد ازاں یونیورسٹی میں ہی ایسوسی ایٹ پروفیسر اور مہمان پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ دکنیات میں انھیں ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم بانی ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کا جانشین کہا جاتا تھا، خلیق اور ملنسار شخصیت کے حامل پروفیسر اثر مرحوم اساتذہ اور طلبا برادری میں کافی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، وہ بیک وقت تنقید نگار اور تحقیق کار تھے، مخطوطات پڑھنے میں انھیں کافی مہارت تھی، غیر ملکی ریسرچ اسکالرز کی ایک بڑی تعداد نے بھی ان کی علمی معلومات اور تحقیق سے کافی فائدہ اٹھایا ہے، وہ خوش کلام شاعر بھی تھے، کلاسیکی انداز کے علاوہ جدید لب ولہجہ میں کہی گئی ان کی غزلیں کافی مقبول ہوئیں، انھوں نے ایک طویل نعت شریف بھی لکھی اور نعتیہ مجموعہ بھی ترتیب دیا۔ ان کی تحریریں سادہ وسلیس اور معنی آفریں ہیں۔ دکنی ادب پر عمیق تحقیق کے باعث ڈاکٹر محمد علی اثر نے اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں بلکہ عصر حاضر میں دکنی ادب پر ان کی حیثیت اتھاریٹی سی رہی ہے۔

روز نامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 26 اپریل 2024

سلام بن رزاق

ممبئی: معروف افسانہ نگار اور استاذ سلام بن رزاق کا نوی ممبئی میں 7 مئی کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 83 برس تھی۔ مرحوم کافی عرصے سے بیمار تھے۔ پسماندگان میں بیوہ، ایک بیٹی، ایک بیٹا، پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں شامل ہیں۔ ان کی تدفین بعد نماز مغرب بڑے قبرستان

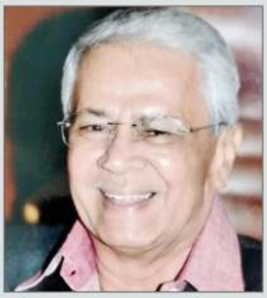

مرین لائنز میں عمل میں آئی۔ اردو کے نابغہ روزگار قلم کار سلام بن رزاق کا تعلق شہر ممبئی سے تھا حالانکہ ان کا آبائی وطن خطہ کوکن تھا۔ ایک عرصے تک ممبئی میونسپل کارپوریشن کے اسکولوں میں بطور استاذ فرائض انجام دیتے رہے۔ کرلا قریش نگر میں زندگی گزاری اور پھر میرا روڈ منتقل ہوگئے۔ سلام بن رزاق افسانہ نگاری میں ہندوستان بھر میں مشہور ومقبول ہوئے۔ اسی طرح ہندی کے ادبی حلقے میں بھی ان کی قدر ومنزلت رہی۔

سلام بن رزاق شاعری کے ذریعے ادب میں

داخل ہوئے تھے تاہم ان کی شہرت ان کے افسانوی موضوعات، ان کی فکر، فنی شعور، منفرد اسلوب و انداز، تخلیقی ہنرمندی، زبان و بیان کی ندرت اور افسانوں کی بے مثال بنت و بیانیے کے سبب ہے۔ انھوں نے اپنے اطراف کی دنیا کو جیسا پایا، ویسا ہی اسے اپنے افسانوی فریم میں سجا دیا اور اسے احتجاجی اور اصلاحی فکروں کے لیے متحرک کردیا۔ ان کے افسانوں کے عام کردارو ں نے انھیں عام آدمی کا خاص کہانی کار بنا دیا ہے۔ افسانے کے علاوہ موصوف نے ڈرامے، تنقیدی مضامین، بچوں کا ادب اور ترجمہ نگاری پر بھی خاص توجہ کی ہے۔ ان کی تخلیقات و تحریروں کو برصغیر کے تمام موقر رسالوں نے اہتمام سے شائع کیا۔ پچاس سے زائد افسانے ریڈیو آکاشوانی سے نشر ہوئے، ایک درجن سے زائد افسانوں کو ڈراموں کی شکل میں پیش کیا گیا۔ انھوں نے کئی فلموں اور ٹی وی سیریلوں میں رائٹر اور اسسٹنٹ رائٹر کے طور پر کام کیا۔ آدھا درجن کے قریب رسائل نے آپ کے فن پر نمبر اور گوشے نکالے نیز معروف ناقدین ادب نے ان کی فنی ہنرمندیوں کا اعتراف کیا، اس کے ساتھ ہی ان کی فکر و فن پر چند پی ایچ ڈی اور درجن بھر کے قریب ایم فل کے مقالے لکھے گئے۔ کئی ادبی جلسے ان کے اعزاز میں منعقد ہوئے اور 15 سے زائد کہانیاں مختلف سطح کی درسیات میں بطور نصاب شامل ہیں۔

سلام بن رزاق نے ہندی مراٹھی اور اردو سے معکوس ترجمہ نگاری کی۔ بال بھارتی کی لسانی و نصابی کمیٹی کے اہم رکن رہے۔ ان کی کل 22 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں چار افسانوی مجموعے ننگی دوپہر کا سپاہی، معبر، شکستہ بتوں کے درمیاں اور 'زندگی افسانہ نہیں' قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح 'ننھے کھلاڑی' (بچوں کا ناول)، 'ماہم کی کھاڑی' (مراٹھی ناول کا ترجمہ)، 'جی اے کلکرنی کی کہانیاں' (مراٹھی سے ترجمہ شدہ کہانیاں) اور 'عصری ہندی کہانیاں' (ہندی سے ترجمہ شدہ کہانیاں) جیسی کتابیں خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ منصب درس و تدریس سے وابستہ تھے اور سبکدوش ہوکر پہلے میرا روڈ، تھانے اور پھر نوی ممبئی میں منتقل ہوگئے اور آج وہیں اپنی بیٹی کے گھر خالق حقیقی سے جاملے۔ سلام بن رزاق کو ادبی خدمات کے لیے ملک کے سرکاری و غیرسرکاری اداروں نے کم و بیش 40 سے زائد انعامات و اعزازات سے نوازا۔ ان کی تقریباً سبھی کتابوں پر ملک کی مختلف ریاستی اردو اکادمیوں نے خصوصی انعام تفویض کیے۔ مجموعی ادبی خدمات پر 'غالب ایوارڈ' (غالب انسٹی ٹیوٹ)، مجموعی ادبی خدمات پر 'گیانیشوری ایوارڈ' (مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی)، ہندی سے ترجمہ شدہ کہانیوں کے مجموعہ 'عصری ہندی کہانیاں' پر (ساہتیہ اکادمی ایوارڈ) مرکزی ساہتیہ اکادمی، دہلی)، افسانوی مجموعہ 'شکستہ بتوں کے درمیاں' پر (ساہتیہ اکادمی ایوارڈ)، مرکزی ساہتیہ اکادمی، دہلی)، مجموعی ادبی خدمات پر 'ولی دکنی ایوارڈ' (مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی) اور مجموعی ہندی خدمات پر 'رمنیکا ایوارڈ' (رمنیکا فاؤنڈیشن، دہلی) شامل ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 8 مئی 2024

محمد طارق غازی

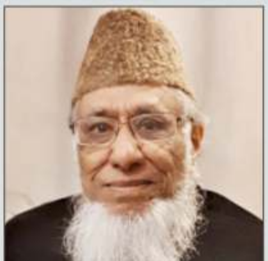

دیوبند: دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب کے نواسے معروف صحافی مولانا حامد الانصاری غازی کے فرزند دبستان علی گڑھ کے خوشہ چیں انگریزی زبان کے قدآور صحافی محمد طارق غازی 13 اپریل کو کنیڈی کے مقام اٹوا میں مختصر سی علالت کے بعد 82 برس کی عمر میں انتقال کرگئے۔ مرحوم کی ولادت 2 مارچ 1941 کو دیوبند کے اس علمی گھرانے میں ہوئی تھی جو خانوادہ قاسمی کے نام سے متعارف ہے۔ ابتدائی تعلیم دیوبند بجنور اور ممبئی میں ہوئی جہاں ان کے والد مولانا حامد الانصاری غازی 'مدینہ' (اخبار بجنور) اور جمہوریت (ممبئی) کی ادارت کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ جب وہ شعوری طور پر بالغ ہوئے تو مزید تعلیم کی خواہش انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لے گئی جہاں انھوں نے وراثت میں ملنے والے صحافت کے فطری ذوق کو پروان چڑھایا۔ 1963 میں ممبئی میں عملی زندگی کا آغاز کیا جس کے لیے انھوں نے صحافت کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔ ہفتہ وار ابوالکلام (ممبئی)، ماہنامہ سائنس (ممبئی) کی ادارت کا فریضہ انجام دیا۔ محمد طارق غازی کی صحافتی صلاحیتوں سے متاثر ہوکر سعودی عرب کے کثیر الاشاعت اخبار سعودی گزٹ نے ان کی خدمات مستعار لے لیں اور انھیں اس اخبار کے ادارتی عملے میں شامل کرلیا جہاں انھوں نے کم و بیش تین دہائیوں کا سفر مکمل کیا۔ وہ ترقی کرتے کرتے مینیجنگ ایڈیٹر کے عہدے پر فائز ہوگئے جو بڑے اعزاز کی بات ہے۔ 2003 میں انھوں نے صحافت سے سبک دوشی اختیار کرکے کینیڈا کے شہر اٹوا کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ اپنے قدیم مذہبی ورثے کی طرف مراجعت کی اور ماشاء اللہ تاریخی تہذیبی تمدنی عمرانی و مذہبی تحریروں کی طرف توجہ دی۔ ان کی مطبوعہ کتابوں میں نظری تہذیب اور تذکار الانصار نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی۔ محمد طارق اعلیٰ کردار اور بلند اخلاق کے حامل عظیم مفکر دانشور، بلند نظر صحافی ادیب نقاد اور اردو شعر و ادب کے دلدادہ تھے، انگریزی زبان و ادب کے ساتھ اردو نثر و نظم پر عبور رکھتے تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 15 اپریل 2024

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دکنی ہندو اور اردو

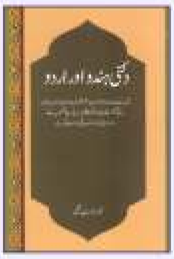

مصنف: نصیر الدین ہاشمی

تیسری اشاعت: 2023

صفحات: 266

قیمت: 170 روپے

کلیاتِ فراق (جلد سوم)

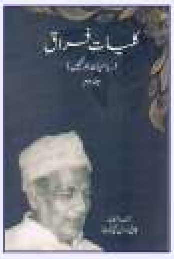

ترتیب وتدوین: کالی داس گپتا رضا

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 399

قیمت: 235 روپے

املا نامہ

مرتب: گوپی چند نارنگ

چوتھی اشاعت: 2023

صفحات: 97

قیمت: 80 روپے

جدید ہندوستان میں ذات پات اور دوسرے مضامین

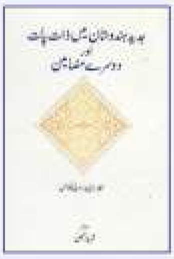

مصنف: ایم این سری نواس

مترجم: شہباز حسین

دوسری اشاعت: 2023

صفحات: 180، قیمت: 125 روپے

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

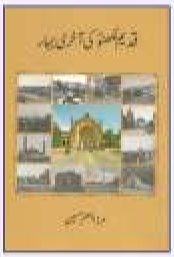

مصنف: مرزا جعفر حسین

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 671

قیمت: 355 روپے

حالی کا سیاسی شعور

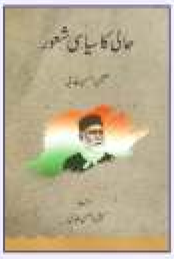

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

حالی کی غزلیں اور قطعات

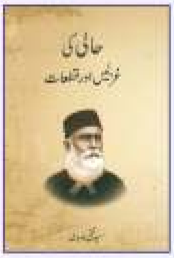

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 185+66

قیمت: 150 روپے

نوم چامسکی

مصنف: علی رفاد فتیحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, जून-२०२४,वर्ष:२६, अंक:६
URDU DUNIYA Monthly, June-2024, Vol.26, Issue:06
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/05/2024
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6